عرفان
حصّہ اوّل
حضرت قبلہ فقیر نور محمد سروری قادری کلاچوی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے خدا نورِ محمد ﷺ کو درخشاں کر دے　　نورِ عرفان سے دنیا میں چراغاں کر دے

سینہ سینا ہو ہر اک آنکھ ہو بینا جس سے　　خامہ مثلِ یدِ بیضا مرا تاباں کر دے

# عرفان

حصہ اوّل

مصنف

حضرت قبلہ فقیر نور محمد سروری قادری کلاچوی رحمتہ اللہ علیہ

# فہرست مضامین

حضرت قبلہ فقیر نور محمد سروری قادری کلاچوی رحمۃ اللہ علیہ

نوری دربار، کلاچی شریف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میری انتہائے نگارش یہی ہے
ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

# تعارف

عرفان کے تعارف کے بارے میں آج سے بیس سال پیشتر میرے جو جذبات تھے آج بھی وہی ہیں۔ آج بھی جبکہ میرے تجربات، مشاہدات اور معلومات میں گونا گوں اضافہ ہوا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں عرفان کے شایانِ شان تعارف قلم بند کرنے کے فرض سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہوسکوں گا۔ تاہم چونکہ ناظرین پر اس کتاب کی اہمیت اور حقیقت واضح کرنا ضروری ہے اور یہ ایک ادبی روایت بھی ہے اس لیے میں اپنی کم مائیگی کے احساس کے باوجود اپنے خیالات اور جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی حتی المقدور کوشش کروں گا اور فقط اس شرف ہی کو اپنی کامیابی اور خوش نصیبی کے لیے کافی تصور کروں گا جو مجھے اس نادرِ روزگار کتاب کو ناظرین سے متعارف کرانے کے سلسلے میں حاصل ہوگا۔

کتاب عرفان جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مذہب وروحانیت اور فقر وتصوف کے اسرار و معارف اور حقائق کا ایک بیش بہا مجموعہ اور نایاب مرقع ہے۔ اس کی تدوین اور ترتیب میں ان تمام امور کو مدِّ نظر اور ملحوظ رکھا گیا ہے جو وقت کے ہمہ گیر تقاضوں سے مطابقت اور جدید اذہان کی تشفی اور تسلی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے مطالعے سے مذہب اور روحانیت کا حقیقی مقصد اور مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

موجودہ خلائی اور جوہری (ایٹمی) عہد میں مادیت کو جو عروج اور فروغ حاصل ہوا ہے اس نے لوگوں کے ذہنوں کو یکسر بدل دیا ہے۔ آج اکثر لوگ مذہبی کتابوں اور روحانی موضوعات کو طویل، خشک اور پیچیدہ مسائل کا مجموعہ سمجھ کر ان کے مطالعے سے گریز اور پہلو تہی کرتے ہیں اور وہ اپنے اس خیال میں کسی حد تک حق بجانب بھی ہوتے ہیں کیونکہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ آج دنیا اس مقام پر نہیں جہاں صدیوں پیشتر تھی۔ انسانی علم اور تجربے نے آفاق کی وسعتوں کو چھان مارا ہے۔ اب اس خاکی نژاد انسان کے قدم چاند اور ستاروں کی

سرزمینوں کو چھونے لگے ہیں اور وہ خلاء اور کائنات کی تسخیر کے خواب دیکھ رہا ہے۔ انسانی علم نے خوردبینی ذرّات کے بطون میں داخل ہو کر ان کی اندرونی دنیا کے ناقابلِ درک اسرار اور مخفی راز آشکارا کر دیئے ہیں۔ لہٰذا موجودہ دنیا مکمل عقلی تشریح اور پوری علمی توضیح کے بغیر کسی چیز کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہونے کو تیار نہیں۔ لیکن عرفان میں اس موضوع کو حیرت انگیز اور محیرالعقول مشاہدات، انوکھے و نرالے تجربات اور عجیب و غریب و جدید معلومات کے ذریعے اس قدر دلچسپ اور پر لطف بنایا گیا ہے کہ طبیعت بالکل کوفت اور گرانی محسوس نہیں کرتی۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اس کے دماغ سے ظلمت کے پردے ہٹا رہا ہے اور وہ عالمِ روحانیت کا بہت نزدیک اور قریب سے مشاہدہ کر رہا ہے۔

اس مختصر سے دیباچے میں تفصیلاً یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ عرفان میں کیا کچھ ہے۔ یہ بات کتاب کا مطالعہ کرنے سے ہی تعلق رکھتی ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فقر و تصوف اور روحانیت کے موضوع پر اتنی دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ یہ شرف برصغیر پاک و ہند میں صرف عرفان کے مصنفؒ ہی کو حاصل ہو سکا ہے جس کے لیے آپ پوری اسلامی دنیا کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آپ نے اردو زبان میں پہلی بار اتنی عجیب و غریب اور معیاری کتاب لکھ کر نہ صرف اردو دان اصحاب ہی پر احسانِ عظیم کیا ہے بلکہ اردو لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ کر کے اردو ادب پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس کے لیے آپ کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

موجودہ دور میں جہاں ایک طرف سائنسی ترقی کی بدولت وقت اور فاصلے پر قابو پایا جا رہا ہے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی نوبت آ گئی ہے، آرام و آسائش اور عیش و عشرت کے سامانوں کی ہر طرف بہتات اور کثرت ہے وہاں دوسری طرف پوری انسانیت انتہائی روحانی کرب، ذہنی انتشار، نفسیاتی پیچیدگی، گہری قلبی بے اطمینانی اور ہمہ گیر بے یقینی کے مصائب میں گرفتار ہو کر درد و الم، رنج و غم اور تکلیف سے بے طرح کراہ رہی ہے، مسلسل سسکیاں لے رہی ہے اور دم توڑ رہی ہے۔ مادی اور سائنسی ترقی انکے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکی بلکہ سائنس نے سیاسی طالع آزماؤں اور ذاتی مصلحت اندیشوں کے تابع ہو کر

انسان کے آلام میں بے انتہا اضافہ کر دیا ہے۔ پورا کرۂ ارض جہنم بنا ہوا ہے، ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے، ہر طرف موت کا بازار گرم ہے۔ آج سماجی تضادات، امارت و غربت کا فرق، عالمگیر ایٹمی اور خلائی جنگ کے خطرات، غذائی قحط، کمزور قوموں پر طاقتور قوموں کی یلغار، امراض، احتیاج، افلاس، زندگی سے مایوسی اور خودکشی کے اقدامات وغیرہ اپنے عروج پر ہیں۔ اس قدر عظیم عذاب اور عالمگیر ابتلا اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اقتصادیات، نفسیات، عمرانیات اور جدید فلسفے کے ماہرین چاہے اس کی توجیہہ کچھ بھی کریں اور اس کے ظاہری اور فوری اسباب چاہے کچھ ہی بتائیں مگر اس کی اصلی وجہ مذہب و روحانیت، فقر و تصوف اور خود اپنے نفس کے عرفان سے انسانیت کی روگردانی اور غفلت ہے۔ آج کے دور میں مذہب اور روحانیت کی جس قدر شدید ضرورت ہے اس سے پہلے شاید ہی کبھی پڑی ہو۔ مذہب ہی ان عالمگیر دکھوں کا علاج ہے اور روحانیت ہی اس ابتلائے عظیم کا واحد مداوا ہے ورنہ وہ دن دور نہیں جب انسانیت انفرادی خودکشیوں کی بجائے اجتماعی خودکشی کی مرتکب ہو کر صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے گی۔

عرفان کا موضوع خالصتاً فقر و تصوف اور روحانیت ہے اور یہ اسلام کا ایک انتہائی ضروری پہلو ہے جس کو مسلمانوں نے تقریباً فراموش کر دیا ہے۔ دین کے اس روحانی پہلو سے جس کو تصوف اور روحانیت کہا جاتا ہے مسلمانوں کی بے خبری اور غفلت کا یہ عالم ہے کہ آج اللہ تعالیٰ کے ذکر فکر، عبادت، تزکیۂ نفس اور صفائے قلب کے لیے مجاہدے اور ریاضت کے ایک ضابطے کے لیے بھی جو تصوف کے نام سے موسوم ہے ہمیں شرعی جواز اور سند پیش کرنے کی ضرورت پڑ رہی ہے اور فقر، طریقت اور معرفت جیسے مقدس علوم کو بھی خود مسلمانوں اور خصوصاً مسلمان علما کی دست بُرد سے تحفظ کی حاجت پیش آ گئی ہے۔ بلکہ اب تو خود اسلام، قرآن اور سنت کو بھی عامۃ المسلمین سے نہیں بلکہ بزعمِ خود اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار تصور کرنے والے ایسے علما کی زبان اور قلم سے خطرہ لاحق ہے جو مغربی مستشرقین اور عیسائی مبلغین کے پیش کردہ نظریات سے متاثر ہیں اور اسلامی عقائد اور روحانی اقدار کو مسخ کرنے کے درپے ہیں۔ انہوں نے فروعات کے علاوہ اصولی مسائل تک کو مشکوک کر کے رکھ دیا ہے۔ کتاب اور سنت کی نئی حیثیت متعین کرنے کی جسارت کی ہے۔ سنت کا سرے

سے ہی انکار کر دیا ہے اور معجزات کی مادی تاویلیں شروع کر دی ہیں۔

دینِ اسلام کے دو رُخ اور دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور دوسرا باطنی و روحانی۔ ظاہری رُخ اور پہلو شریعتِ ظاہرہ کے نام سے موسوم ہے جسے علماء اور فقہاء نے اپنایا ہے اور باطنی و روحانی رخ کو فقر و تصوف اور طریقت کا نام دیا گیا ہے جسے فقراء، صوفیا اور اولیا نے اختیار کیا ہے۔ علمِ تصوف اور فقر کا مقصد اسلام کے اسی دوسرے روحانی رُخ کو ثابت کرنا اور اس کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ کائنات کی ہر شے ظاہری اور باطنی پہلوؤں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ خود ہمارا وجود روح اور جسم میں منقسم ہے۔ جسم ظاہر ہے اور روح باطن ہے۔ اصل شئے روح ہے اسی پر جسم کی زندگی کا دارومدار ہے۔ تمام حقائق باطن میں مخفی اور پوشیدہ ہیں۔ اسی طرح اسلام میں شریعت گویا جسم ہے اور تصوف اور فقر اس کی روح ہے اور یہی اصلیت، حقیقت اور صداقت کا سرچشمہ ہے۔

رسولِ مقبول ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے یہی دونوں رُخ قرآن اور احادیث سے ثابت ہیں اور کوئی باشعور ذی عقل اور صحیح العقیدہ مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ظاہر و باطن کی جامع تھی اور آپ ﷺ ہی سے یہ دونوں طریقے دُنیا میں رائج ہوئے اور پھیلے ہیں۔ ظاہری بصارت کے ساتھ باطنی بصیرت بھی ضروری ہے اور شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کو اپنانا بھی لازمی ہے۔ آفاق کے ساتھ انفس بھی ہے اور عالمِ شہادت کے پہلو بہ پہلو عالمِ غیب بھی موجود ہے اور اس کے لیے دل کی بینائی درکار ہے۔

آنکھ کا نور دِل کا نور نہیں
دلِ بینا بھی کر خُدا سے طلب

فقر و تصوف درحقیقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اور باطنی زندگی کی پیروی اور آپ ﷺ کے طفیل حسبِ استعداد باطنی کمالات تک رسائی حاصل کرنے کا نام ہے اور یہ وہ لائحہ عمل ہے جس کے ذریعے اسلام کے مذکورہ باطنی پہلو کو عملی طور پر ثابت کیا جاتا ہے۔ جب تک اسلام کا باطنی اور روحانی پہلو ثابت نہ ہو جائے اسلام مکمل طور پر سامنے نہیں آتا اور اس کی حقیقت پورے طور پر منکشف نہیں ہوتی اور جب تک رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی اور روحانی زندگی کو نہ اپنایا جائے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان اور حقیقی معنوں میں مومن نہیں بن سکتا۔

ہم جو کچھ ظاہری مادی حواس کے ذریعے محسوس اور مشاہدہ کرتے ہیں کائنات کا ماحصل یہی کچھ نہیں بلکہ کائنات اسکے علاوہ اور بہت سی نادیدہ اشیاء اور غیر مرئی مخلوقات اور غیر محسوس دنیاؤں سے بھری پڑی ہے۔ ان کا مشاہدہ کرنے کے لیے باطنی حواس اور روحانی ادراک کی ضرورت ہے۔ ہر ظاہر کا ایک باطن ضرور ہے اور ہر وجود کے اندر ایک روح موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہر ذرہ باطنی جوہری توانائی کا حامل ہے۔ اسی توانائی پر اس کے وجود و عدم، زندگی و موت اور نیستی و ہستی کا انحصار ہے۔ تصوف اور فقر کائنات کی ان نادیدہ اشیاء، غیر مرئی مخلوقات اور غیر محسوس دنیاؤں سے ہمیں روشناس کراتا ہے اور عالمِ غیب اور عالمِ روحانیت سے ہمارا رشتہ استوار کرتا ہے۔ مادی حواس اور عقل کی حدود جہاں ختم ہو جاتی ہیں وہیں سے راہنمائی کا فرض تصوف ادا کرتا ہے اور جہاں ظاہری شرعی علوم کے حاملین کی عقل دینی مسائل حل کرنے سے عاجز آتی ہے وہیں علمِ فقر و تصوف کے حاملین قیادت اور پیشوائی کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔

ائمۂ تصوف نے شرعی نصوص ہی سے تصوف کے مسائل اور اصول کا استنباط اور استخراج بالکل اسی طرح کیا ہے جس طرح ائمہ مجتہدین اور فقہاء نے شرعی مسائل کا قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں استنباط اور استخراج کیا ہے۔ تصوف کا ماخذ معلوم کرنے کے لیے ہمیں قرآن و حدیث، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور صحابہ کرام کی زندگی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات میں اب ذرا بھی اشتباہ نہیں رہا کہ تصوف کا حقیقی ماخذ قرآن اور سنت ہیں اور فقر و تصوف باہم مترادف ہیں اور اسی کو شارع اسلام نے اپنے لیے باعثِ فخر قرار دیا تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ جس وقت علومِ شریعت تالیف و تصنیف کا جامہ پہن کر کتابی شکل میں آنے لگے اور فقہاء نے فقہ و اصولِ فقہ اور کلام و تفسیر میں کتابوں کے ذخیرے مرتب کرنے شروع کیے تو صوفیاء نے بھی علمِ تصوف پر قلم اٹھایا۔ بعض نے ورع اور محاسبے کے مضمون کو اپنایا اور اس میں کتاب ترتیب دی مثلاً قشیریؒ نے کتاب الرسالت لکھی اور سہروردیؒ نے عوارف المعارف تحریر کی۔ پھر امام غزالیؒ نے احیاء العلوم لکھ کر ہر دو امور کو جمع کیا یعنی وَرع و محاسبہ پر تفصیلی بحث کی اور تصوف کے آداب و اصطلاحات پر بھی کافی شافی گفتگو کی۔ اسی طرح علمِ

تصوف جو صرف اس طریق عبادت یا ان احکام سے عبارت تھا جو سینہ بسینہ بزرگوں سے چلے آرہے تھے اب کتابی شکل میں آ گیا اور آنے لگا اور اب تک آرہا ہے اور یہ عمل صرف اسی علم تصوف کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ ابتدا میں علومِ تفسیر، حدیث وفقہ بھی سینہ بسینہ منتقل ہوتے تھے۔ بعد میں ان میں تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر صوفیائے کرام اور فقرائے عظام کا مجاہدہ، مراقبہ، ذکر فکر اور عزلت نشینی نے ان کو فقہاء پر فضیلت اور فوقیت بخشتی ہے کیونکہ مراقبہ اور مجاہدہ وغیرہ کی برکت سے ان کے لیے حواس سے پردے اُٹھ جاتے ہیں اور وہ غیر مرئی عالم ان پر روشن ہو جاتے ہیں جن کی صاحبِ علمِ ظاہر ہوا بھی نہیں پا سکتا۔ صوفیا کو اپنے اعمال، عبادات اور مجاہدہ کے نتائج اور اثرات ہر لحہ محسوس اور معلوم ہوتے رہتے ہیں اور ان کے اجر وثواب کا اندازہ ان کو صحیح طور پر ہوتا رہتا ہے۔

لفظ تصوف چاہے عجمی ہو یا عربی اور اس کے لغوی معنی چاہے اصحابِ صفہ کے تاریخی پس منظر میں نظر آئیں یا صفائے قلب اور جامہ ہائے صوف سے متعین ہوتے ہوں مگر صدیوں سے اس کے اصطلاحی معنی صرف یہی متعین ہو کر رہ گئے ہیں کہ قرآن وسنت کی روشنی میں ایسی زندگی بسر کرنا، ایسے مشاغل اختیار کرنا اور تصورات، تفکرات، ذکر فکر، مجاہدات اور عبادات کا ایک ایسا متوازن لائحہ عمل اپنانا جس کے ذریعے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح حاصل ہو۔ یاد رہے کہ نفس کے تزکیے اور تصفیے کے صرف مبہم اشارات ہی نہیں بلکہ واضح احکام سے قرآنِ مجید بھرا پڑا ہے۔

عرفان فقر و تصوف اور روحانیت کے موضوع پر اپنی نوعیت کی اولین اور بے مثل و بے بدل کتاب ہے۔ اس میں دین کے اس اہم پہلو کو علومِ جدید اور سائنسی معلومات کی روشنی میں جس خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

عرفان میں ملحدوں، نیچریوں، دہریوں اور مادہ پرستوں کے تمام بے بنیاد اعتراضات، لغو خیالات اور باطل نظریات کے مدلل اور مسکت جوابات دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود ساختہ فریب کار پیروں، نام نہاد مکار صوفیوں، جنت فروش جھوٹے مشائخ اور خدا کے نام کی تجارت کرنے والے نقلی درویشوں کی چالبازیوں اور تخریب کاریوں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے جو تصوف کی ابجد تک سے بھی واقف نہیں۔ جو نفس، قلب، روح،

لطائف اور الہام والقا کے نام تک سے نا آشنا ہیں اور جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ شریعت، طریقت، معرفت، روشن ضمیری اور باطنی زندگی کس بلا کا نام ہے مگر اس کے باوجود وہ ہزاروں بندگانِ خدا کی بخشش اور نجات کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اور جو محض اپنے ذاتی توہمات، باطل خیالات اور بے بنیاد تصورات کو روحانیت اور فقر و تصوف کا معیار سمجھے بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے فقراء اور صوفیا کو بدنام کر رکھا ہے۔ حضرت فقیر صاحبؒ نے ان لوگوں کے اعمال اور کردار پر ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ آپؒ نے ان ظاہر بین اور روحانیت سے نا آشنا نام نہاد مسلمان علما کے غلط اور یک طرفہ نظریات پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے، جو اسلام کو محض سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے باطنی اور روحانی حقائق کا انکار کرتے ہیں اور تصوف کو عجمی تصورات اور عجمی عقائد و نظریات کا مجموعہ قرار دے کر اسے بدعت کہنے اور خارج از اسلام ثابت کرنے کی بے سود سعی کر رہے ہیں۔ یہ لوگ حدیث رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَ صْغَرِ اِلٰی جِهَادِ الْاَ كْبَر (ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف رجوع کرتے ہیں) کے مقصد اور مفہوم کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اس حدیث میں جہادِ اکبر سے مراد جہاد بالنفس ہے جو ظاہری جہاد سے افضل ہے۔ حضرت قبلہ فقیر صاحبؒ نے افضل جہاد یعنی جہاد بالنفس کی اہمیت پر زور دیا ہے جو اسلام کا ایک ضروری پہلو ہے لہٰذا عرفان کو اگر اس حدیث کی تفسیر کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

لیکن عرفان کو جس خصوصیت نے نادرِ روزگار روحانی شاہکار کی حیثیت اور امتیاز بخشا ہے وہ اس میں مندرج دو نایاب، مخفی اور سربستہ علوم کی تشریح اور ان کے عمل کی مکمل وضاحت اور ان کے فلسفے کا اوّلین انکشاف ہے۔ ان میں سے ایک علم تصورِ اسمِ ذات ہے اور دوم علمِ دعوت القبور رہے۔ عرفان میں انہی دو علوم کو خصوصیت کے ساتھ اور نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہی دو علوم اس کتاب کا اصل موضوع ہیں۔ ان میں اوّل الذکر یعنی ''تصور'' انسانی خیالات اور پوشیدہ روحانی قوتوں کو ایک نقطے (اسم اللہ) پر مرکوز اور مجتمع کر کے اِرادی قوت اور روحانی طاقت حاصل کرنے کا نام ہے اور موخر الذکر یعنی ''دعوت'' ارواح کی حاضرات کا عجیب و غریب اور حیرت انگیز علم ہے۔ آج ایک دُنیا ایسے علوم کے پیچھے سرگرداں اور پریشاں ہے جن کے ذریعے ارواح کی حاضرات ممکن ہو اور انسان ٹھوس

روحانی قوتوں کا مالک بن سکے۔ ہزاروں اشخاص نے ایسے علوم کے پیچھے اپنی عمریں گنوا دیں ہیں لیکن وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے۔ عرفان کے مصنفؒ نے ان محیر العقول علوم اور اس قیمتی اور سربستہ راز کو تفصیل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر کے کمال فیاضی اور بڑی دریا دلی سے کام لیا ہے۔ علمِ تصور شاید بعض اصحاب کے لیے نئی اور غیر معروف شئے ہو اور یہ اصطلاح اس سے قبل ان کی نظروں سے نہ گزری ہو لیکن جہاں تک اس علم کی تاریخی حیثیت کا تعلق ہے یہ زمانۂ قدیم سے مختلف صورتوں اور شکلوں میں رائج رہا ہے اور مختلف ناموں اور اصطلاحات سے یاد کیا گیا ہے۔ کسی چمکدار چیز کو سامنے رکھ کر اور اس پر نظر جما کر اور توجہ مرکوز کر کے روحانی قوت حاصل کرنے کا طریقہ بہت پرانا ہے۔ چنانچہ زمانۂ قدیم سے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے بعض لوگ بلور کی شفاف اور چمکدار قلم سامنے رکھ کر اس پر توجہ مرکوز کرتے تھے۔ بعض چراغ کی لَو پر نظر جماتے تھے اور بعض آئینوں اور شیشے کے گولوں سے یہ کام لیتے تھے۔ بعض چاند اور سورج کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی مشق کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے نفس اور روح میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ اس کو بلور بینی، شمع بینی اور آئینہ بینی وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس کی آخری اور ترقی یافتہ صورت مسمریزم اور ہپناٹزم کی شکل میں آج بھی دنیا میں اور خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہے۔ ڈاکٹر مسمر اور مسٹر کیرو وغیرہ نے اس قسم کی کچھ مشقیں کر کے اور چند مادی اور سفلی کمالات دکھا کر عالمگیر شہرت پائی ہے۔ مسمریزم اور ہپناٹزم وغیرہ میں صرف فرضی نقاط پر نظر جمانے کی مشق کر کے یہ مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔ عرفان میں مذکور تصور اگرچہ بادی النظر میں اصولی طور پر مسمریزم اور نظر کے ارتکاز کے دوسرے طریقہ ہائے تصور سے کچھ مماثلت رکھتا ہے مگر دراصل وہ اصولی طور پر بھی اور مقصدیت اور افادیت کے لحاظ سے بھی ان سب سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اس میں نہ فرضی نقاط پر مشق کی جاتی ہے اور نہ شفاف اجسام پر بلکہ صرف اسم اللہ ذات کا تصور کیا جاتا ہے۔ اس طریقے میں ابتداً کبھی اسم اللہ لکھا ہوا سامنے رکھ کر اور کبھی اس کے بغیر صرف تصور اور خیال میں اسے تحریر، مرقوم اور قائم کیا جاتا ہے اور پھر اُسے دل و دماغ اور دیگر مطلوبہ اعضا میں تصور کے ذریعے تحریر اور منتقل کیا جاتا ہے اور چونکہ اسم کا مسمّٰے کے ساتھ گہرا تعلق اور رابطہ ہوتا ہے اس لیے اسم کے انتقال کے ساتھ ساتھ مسمّٰے کی

ذاتی اور صفاتی تجلیات اور انوار بھی منتقل ہوتے رہتے ہیں جس سے اعضا مذکور میں روحانی زندگی، روشنی اور احساس وقوت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح گو حضرت فقیر صاحبؒ نے سلطان العارفین سلطان باھوؒ کی کتابوں سے اخذ کی ہے اور انہی کے فیض اور مہربانی اور باطنی توجہ سے آپ کو اس میں کمال حاصل ہوا ہے مگر اس کو پہلی بار شرح وبسط کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ تصور اسم اللہ ذات دراصل ذکر اللہ کا ایک افضل ترین، مکمل ترین اور بہتر طریقہ ہے۔

علم دعوت جیسا کہ مذکور ہوا ارواح کی حاضرات اور ان سے ہم کلام اور ملاقی ہونے کا علم ہے۔ یہ اصطلاح بھی حضرت سلطان باھوؒ کی وضع کردہ ہے اور اُنہی کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ حضرت سلطان العارفینؒ کے تمام فقر کا دارومدار انہی دو علوم پر ہے۔ یہی دو علوم فقر کی انتہائی بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچنے اور اعلیٰ ترین روحانی مراتب و درجات کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ مصنفؒ نے ان ہر دو علوم کا انکشاف اور وضاحت کر کے اور ان کی فلاسفی کھول کر دنیا کے سامنے پیش کر کے تصوف اور روحانیت کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

یاد رہے کہ ابتدا میں علومِ فقہ اور علومِ تصوف ہر دو سینہ بسینہ منتقل ہوتے تھے۔ اہلِ سلف ان کی ترتیب اور تدوین سے بے نیاز تھے۔ جب سلف کا زمانہ گزر گیا اور صدرِ اول ختم ہوا اور تمام علوم صناعت کے درجے میں آئے تو فقہاء مجتہدین نے فقہ میں، صوفیا نے تصوف میں ضروری ضروری قواعد اور قوانین ضبط کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ صوفیاء کرام نے کچھ خاص آداب واصطلاحات وضع کیں جو انہیں میں رائج اور مشہور ہوئیں۔ مروّجہ اصناع لغویہ چونکہ ان کے معانی ومطالب کی تعبیر سے عاجز اور قاصر تھیں اس لیے صوفیاء نے چند اور الفاظ وضع کر لیے جو اُن کے مطالب کو سہل طریقہ سے ادا کر سکتے ہیں اور یوں ان اصطلاحات نے ایک علیحدہ مستقل علم کی حیثیت اختیار کر لی۔ حضرت سلطان العارفینؒ اکابر صوفیا میں سے ہیں۔ علمِ تصور اسم اللہ ذات اور علمِ دعوت القبور مذکور سینہ بسینہ منتقل ہونے والے روحانی علوم میں سے ہیں۔ حضرت سلطان العارفینؒ نے ان کی تدوین وترتیب کی ضرورت محسوس کی اور ان کو الفاظ واصطلاحات کا جامہ پہنا کر کتابی شکل دی مگر آپ کی تمام کتابیں چونکہ فارسی زبان میں تھیں اور نایاب تھیں اس لیے یہ ہر دو علوم صدیوں تک پس منظر میں رہے اور

ایک خزانے کی طرح پہلوی زبان کی کتابوں کے ویرانوں میں مدفون رہے اور اگر کسی نے ان کی کوئی ایک آدھ کتاب مطالعہ بھی کی تو وہ ان علوم کو سمجھ نہیں سکا اور نہ ہی ان سے استفادہ کر سکا کیونکہ اول تو حضرت سلطان العارفینؒ نے کسی ایک کتاب تک ان علوم کو محدود نہیں رکھا تھا بلکہ اپنی تقریباً سو سے زائد فارسی تصانیف میں ان کو پھیلا دیا تھا۔ دوم آپؒ نے ان علوم کا صرف اجمالی تذکرہ کیا تھا ان کی مکمل تفصیل اور پوری تشریح کی حاجت تھی۔ آپؒ کی تمام کتابوں کے نہایت عمیق مطالعے، بڑی چھان بین، انتہائی کھوج اور وسیع وطویل ریسرچ و تحقیق کی ضرورت تھی۔ اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا کسی فردِ واحد کے بس کی بات نہ تھی۔ بلکہ یہ علما اور صوفیا کے ایک بہت بڑے ادارے اور اکیڈمی کا کام تھا اور اس کے لیے وسیع تجربات اور روحانی بصیرت اور عمل درکار تھا۔ لیکن بایں ہمہ اتنا مشکل اور عظیم کام حضرت فقیر صاحبؒ نے اپنی پوری عمر صرف کر کے تن تنہا باحسن وجوہ تکمیل تک پہنچا کر کمال کر دیا۔ حضرت فقیر صاحبؒ سب سے پہلے صاحب بصیرت بزرگ تھے جنھوں نے پہلے خود ان علوم کو سمجھا، ان پر انتہا تک عمل کیا اور ان کو مکمل طور پر حاصل کیا اور پھر پہلی بار عرفان کی صورت میں اردو زبان کے ذریعے اسے دنیا کے سامنے پوری طرح کھول کر پیش کر کے یارانِ نکتہ دان کو صلائے عام دے دی۔

اس کے علاوہ یورپ کے علم الارواح (سپر چولزم) پر بھی پہلی بار آپؒ نے قلم اٹھا کر اس کی حقیقت واضح کی ہے اور اس پر نہایت مدلل اور بصیرت افروز بحث کر کے اس کی پوری تاریخ قلم بند کی ہے۔ اس سے قبل کسی نے اردو زبان میں اس دلچسپ موضوع کو نہیں چھیڑا اور نہ ارواح اور علمِ روحانیت کے متعلق صحیح معلومات کسی نے اس طرح یکجا کی ہیں۔

عرفان کے متعلق بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نثر میں فقر و تصوف اور روحانیت کے موضوع پر یہ پہلی طبع زاد، منفرد اور عجیب وغریب کتاب ہے۔ فقر و تصوف اور روحانیت کے موضوع کو جس انوکھے، مؤثر اور دلکش انداز میں عرفان کے اندر پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر دنیا کی کسی زبان کی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ عرفان اس موضوع پر مکمل اور جامع کتاب ہے۔ جس کے بعد کسی اور کتاب کے مطالعے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ عرفان معرفت کی کائنات، فقر کا خزینہ، تصوف کا بحرِ بیکراں، روحانیت کا جامع العلوم (انسائیکلوپیڈیا) اور

طریقت کا گوہرِ نایاب ہے۔ جس نے بھی اس کو خلوص اور توجہ کے ساتھ پڑھا ہے اس نے اپنا دامن گوہرِ مقصود سے بھر لیا ہے۔ عرفان کے ہر لفظ میں مصنف کی روح کار فرما اور جلوہ گر ہے اور اس کا ہر حرف فی نفسہٖ کرامتوں کا حامل ہے۔ اس کے مندرجات میں بلا کی کشش، اس کی عبارتوں میں غضب کی جاذبیت اور اس کے مضامین اور موضوعات میں بے انتہا تاثر اور ندرت موجود ہے۔

عرفان پہلی مرتبہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ نشر و اشاعت اور تشہیر و پراپیگنڈے کے فقدان کے باوجود درجنوں بار اس کی اشاعت ہو رہی ہے جو شخص اسے صرف ایک مرتبہ پڑھتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ عرفان حضرت فقیر صاحبؒ کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ اور وقت کا بے مثل شاہکار ہے۔ عرفان دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تصور اسم اللہ ذات کی افادیت، تشریح اور اس کی پوری فلاسفی اور مکمل عمل اور پورا طریقہ درج ہے۔ دوسرے حصے میں دعوات، موکلات، جنات اور ارواح کی حاضرات کا مفصل بیان ہے۔

عرفان کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ مصنفؒ نے جس قدر باتیں لکھی ہیں وہ صرف زبانی قیل وقال تک محدود نہیں بلکہ مصنفؒ نے اپنے عملی تجربات اور عینی مشاہدات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ مصنفؒ نے جو کچھ دیکھا ہے وہی کچھ لکھا ہے اور جو کچھ آپکے ذاتی تجربات میں آیا ہے وہی کچھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

..................O..................

# سوانحی خاکہ

حضرت قبلہ کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی فقیر نور محمد صاحب سروری قادری تھا۔ آپ کی ولادت با سعادت صوبہ سرحد کے ایک غیر معروف اور دور افتادہ مقام کلاچی، ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں میں ۱۸۸۳ء میں ہوئی۔ آج سے چھ سو سال قبل کے تاریخی پس منظر میں ہمیں آپ کا سلسلۂ نسب ایک نجیب الطرفین سیّد حضرت میر سیّد محمد گیسو دراز رحمتہ اللہ علیہ سے ملتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب حضرت گیسو دراز رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے عنفوانِ شباب میں کوہِ سلیمان کی پُرکشش وادیوں کو اپنا عارضی مسکن بنالیا۔ یہاں رہ کر آپ عقد و مناکحت کے رشتوں میں منسلک ہوئے اور پھر جب یہاں سے روحانی مصلحتوں کے پیشِ نظر عازمِ ہندوستان ہوئے تو ہندوستان کے مرکز دہلی سے ہو کر حیدر آباد دکن میں گلبرگہ کے مقام پر اپنی مستقل اور ابدی آرام گاہ بنائی۔ مگر کوہِ سلیمان کی گُل پوش اور حسین و جمیل وادیوں میں اپنے خون، نسل اور نسب کا ایک وسیع سلسلہ چھوڑ گئے۔ اسی شریف خون، نجیب نسل اور پاکیزہ نسب سے حضرت قبلہ فقیر صاحب کا تعلق ہے۔ باطنی اور روحانی طور پر اس سلسلۂ طریقت کے لحاظ سے آپ سلطان العارفین حضرت سلطان باہو قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ساتھ لازوال اور ابدی نسبت رکھتے ہیں اور ان دونوں نسبی اور روحانی مقدس رشتوں نے آپ کو فقر کا وہ ارفع اور اعلیٰ روحانی مقام بخشا ہے جس کی صدیوں سے کوئی نظیر نہیں ملتی۔

آپ حضرت سلطان العارفین کے بے مثل، بے بدل اور لازوال فقر کے کامل مظہر، مکمل نمونہ اور کماحقہٗ آئینہ دار تھے۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کمال اور عظیم کارنامہ یہ ہے کہ حضرت سلطان العارفین کا جو فقر کتابوں کی اوٹ میں جا کر ایک اجنبی زبان (فارسی) کے پردوں میں دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور جو تصوف کی مشکل اصطلاحات کے پس منظر میں چھپ کر قصۂ پارینہ اور داستانِ ماضی کی صورت اختیار کر گیا تھا اُسے آپ نے مذکورہ دبیز پردوں اور حجابات سے نکالا اور آسان، سہل اور عام فہم بنا کر از سرِ نو دنیا کے سامنے پوری آب و تاب کے ساتھ پیش کر دیا اور اس کی ایسی پُرکشش تشریح اور دلکش توضیح

کی کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ آپؒ نے حضرت سلطان العارفینؒ کی تصانیف کے قلزمِ بیکراں میں مسلسل تیس سال تک شناوری اور غواصی کرنے کے بعد دو ایسے نایاب اور منور گوہر ڈھونڈ نکالے جن کی چمک دمک اور ضیا پاشیوں سے پوری روحانی کائنات روشن ہے۔ ان دو نایاب گوہروں میں سے ایک گوہر تصور اسم اللہ ذات کا پاک شغل ہے اور دوسرا دعوت القبور کا بیش بہاء طریق کار ہے۔ حضرت سلطان العارفینؒ کے لازوال فقر کا مقدس قصر انہی دو بنیادوں پر ایستادہ اور استوار ہے۔ دنیا گواہ ہے کہ اس بات کی نشاندہی سب سے پہلے حضرت فقیر صاحبؒ نے کی۔ آپؒ ہی اس فقر کے نشاۃِ ثانیہ کرنے والے تھے اور آپؒ ہی اس فقر کے احیا اور اجرا کنندہ تھے۔

یہ ایک عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ حضرت گیسو درازؒ کے نسبی سلسلے میں تقریباً چھ سو سال تک کوئی ایسی ہستی ظہور پذیر نہ ہو سکی جو فقر و تصوف کی ان بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچ سکتی جن تک حضرت فقیر صاحبؒ پہنچے تھے اور حضرت سلطان العارفینؒ کے روحانی طریقت کے سلسلے میں تقریباً چار سو سال کے عرصہ میں کوئی ایسی شخصیت منصۂ شہود پر نہ آسکی جو ان کے فقر کا مکمل آئینہ دار ہوتی۔ حضرت فقیر صاحبؒ پر ایک طرف سے نسبی شرافتیں آکر مرکوز ہو گئیں اور دوسری طرف سے سلسلۂ طریقت کی روحانی سعادتیں آپ کی ذاتِ ستودہ صفات میں مجتمع ہو گئیں اور ان دو طرفہ نسبی شرافتوں اور روحانی سعادتوں کے مبارک اجتماع نے آپؒ کے اندر وہ روحانی کمال پیدا کر دیا جو اس نسبی اور روحانی سلسلے کے کسی فرد میں آج تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ گویا نسبی سلسلے کی شرافتیں اور روحانی سلسلے کی سعادتیں ایک مقدس امانت کے طور پر آپؒ کے وجودِ مسعود کا انتظار کر رہی تھیں اور جب آپؒ کا ظہور ہوا تو ان شرافتوں اور سعادتوں نے آپؒ کی ذاتِ والا صفات میں مل کر قران السعدین کی صورت میں جلوہ گر ہو کر آپؒ کو اپنے وقت کی عظیم ترین روحانی شخصیت بنا دیا۔

آپؒ کے والد بزرگوار کا اسمِ گرامی حضرت حاجی گل محمد صاحبؒ تھا جو نہایت متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ حضرت فقیر صاحبؒ کے متعلق انہیں ابتدا ہی سے یقین تھا کہ یہ صاحب کمال نکلیں گے چنانچہ انہیں اس سلسلے میں پہلے سے بشارت اور آگاہی بھی ہو چکی تھی۔

حضرت فقیر صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم کلاچی میں پائی۔ عربی فارسی گھر پر پڑھتے رہے۔ میٹرک کے بعد آپؒ نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا لیکن وہاں آپؒ پر کچھ ایسی شدید روحانی کیفیات اور واردات طاری ہوگئیں کہ سب کچھ چھوٹ کر رہ گیا۔ سکول سے کالج تک پہنچنے اور پھر کالج چھوڑ کر تارک الدنیا ہونے اور درویشی اختیار کرنے تک آپ کو جن ذہنی اور داخلی کیفیات اور خارجی مساعد اور نامساعد حالات اور کش مکش سے گزرنا پڑا وہ انتہائی دلچسپ، روح پرور اور ہدایت آموز ہیں۔ ان کی تفصیل بہت طویل ہے اور ''حیاتِ سروری'' میں درج ہے۔ مختصراً یہ کہ آپؒ نے روحانی جذب وشوق کے تحت دنیاوی ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیا و مافیہا تک کو ترک کر دیا اور فقط اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو کر رہ گئے۔ آپؒ کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا اور آپؒ نے مکمل درویشانہ زندگی اختیار کر لی۔ ذکرِ الٰہی آپؒ کا دن رات کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ آپؒ نے آستانِ یار پر جا کر دم لیا۔ حضرت سلطان العارفینؒ کے مزارِ مقدس پر ایک کچے حجرے کو آپؒ نے اپنی کائنات بنا لیا۔ وہاں پہلے پہل آپ کی طبیعت کسی سے نہیں لگتی تھی۔ دل میں ایک عجیب اجنبیت سمائی ہوئی تھی۔ درویشوں کے ہمراہ صرف آدھے پیٹ رُوکھی سُوکھی کھانے، فرشِ خاک پر سونے، ایک گودڑی اوڑھنے اور تہبند باندھنے کے سوا اور کچھ میسر نہ تھا اور اسی میں دل مطمئن اور روح مسرور تھی۔ انہی ایام میں سلطان العارفینؒ کی ایک قلمی کتاب آپؒ کی نظروں سے گزری۔ اس کا آپؒ نے بہت غور سے مطالعہ کیا۔ آپؒ نے یوں محسوس کیا گویا معرفت اور فقر کا ایک بیش بہا خزانہ ہاتھ آگیا ہے اس کے مطالعے میں اس قدر لطف آیا کہ برسوں حضرت سلطان باہوؒ کی کتابوں کے مطالعے میں گزار دیئے۔ ان کتابوں کو آپؒ نے پیرِ صحبت بنایا اور انہی سے سب کچھ حاصل کیا۔ ان کتابوں کی کتابت اور مطالعے کے دوران بعد میں یہ حالت ہوگئی کہ دن کے وقت آپؒ کو سلوک کے جس مقام، حال، منزل اور جس باطنی و روحانی معاملے اور واقعے کو لکھنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوتا رات کو حضرت سلطان العارفینؒ کی باطنی توجہ اور نوری نگاہ سے وہ منزل اور مقام طے ہو جاتا اور ہر تحریر شدہ معاملہ اور واقعہ مکمل طور پر آپ پر وارد اور منکشف ہو جاتا۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حضرت سلطان العارفینؒ نے یہ سب کتابیں صرف میری ہی خاطر قلم

بند فرما کر چھوڑی تھیں۔ کیونکہ آج تک ان کتابوں کو میری طرح نہ کوئی سمجھ سکا ہے اور نہ سمجھا سکا ہے اور نہ ہی ان سے کوئی اس قدر استفادہ کر سکا ہے، جس قدر میں نے کیا ہے۔

..................O..................

# سفرِ آخرت

آپؒ نے عمر کے آخری پانچ سال پنجاب میں گزارے۔ اگست ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے دوسرے حصوں کی طرح آپؒ کے آبائی شہر کلاچی میں بھی سیلاب آیا اور آپؒ کے مکان کو مع مال واسباب بہا کر آپ کو درویشِ بے مایہ اور فقیرِ بے سروسامان بنا گیا۔ آپؒ نے اپنے نقصان پر بجائے اظہارِ رنج وغم کے خوشی کا مظاہرہ کر کے فرمایا کہ ہم فقیر لوگ ہمیشہ خانہ ویران اور باطن معمور رہتے ہیں اور یہی ہمارا اصلی شیوہ اور مقام ہے۔ اس کے بعد آپؒ فیصل آباد چلے گئے اور آخر وقت تک وہیں قیام پذیر رہے۔ فیصل آباد میں اگرچہ آپؒ کو کافی آرام میسر تھا لیکن یہاں کی آب وہوا آپؒ کو راس نہ آئی اور آپؒ کو مختلف جسمانی عوارض لاحق ہو گئے۔ عمر بھی کافی ہو چکی تھی، قویٰ مضمحل ہو گئے تھے اور عناصر میں اعتدال والی بات بھی مفقود تھی۔ چنانچہ جو مرض جان لیوا ثابت ہوا وہ جگر کی رسولیاں اور ورم تھا۔

وفات سے تین دن پیشتر رات کے وقت آپؒ کافی دیر تک مجھ سے گفتگو کرتے رہے۔ اثنائے گفتگو مجھ سے فرمایا: ''عبدالحمید! بہت پہلے کی بات ہے تم ابھی کمسن ہی تھے۔ ہم دربار حضرت سلطان العارفینؒ پر مقیم تھے ایک رات میں نے واقعہ میں دیکھا کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہوں اور اپنا سارا نور تمہارے وجود کے اندر بھر دیتا ہوں۔'' پھر فرمایا: ''ایک اور واقعے میں مَیں نے دیکھا کہ میں تمہارا سر کاٹ کر اپنا سر تمہاری گردن پر جوڑ دیتا ہوں۔'' پھر فرمایا: ''تمہاری والدہ نے تمہاری ولادت سے چند دن پیشتر اپنی گود میں سنہری قرآن مجید دیکھا تھا مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔''

۱۶ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو جب کمزوری کافی بڑھ گئی تو فرمایا میں وصیت کرنا چاہتا ہوں اور میں تمہیں اپنا روحانی جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ عرائض نویس کو بلایا گیا۔ آپؒ نے اپنی وصیت اپنے سامنے لکھوائی، اس پر دستخط فرمائے جب وصیت نامہ مکمل ہو گیا تو میرے

حوالے کر دیا۔ وصیت نامے کی رُو سے آپؒ نے راقم الحروف کو اپنا روحانی جانشین اور اپنے سلسلے کا روحانی سربراہ مقرر فرمایا۔ بعد میں ارشاد فرمایا مجھے اب مزید زندہ رہنے کی کوئی خواہش نہیں رہی، میں نے جو کام کرنا تھا وہ میں نے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ اب میں بڑی بے صبری کے ساتھ موت کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

بہ مرگِ خویش ہماں طور آرزومندم      چنانکہ بود بہ آبِ حیات اسکندر

۱۶ اکتوبر کے بعد ۱۷ اکتوبر کا دن بھی حسبِ معمول گزر گیا۔ رات ہوئی کائنات اندھیرے میں ڈوب گئی اور اسی کے ساتھ ہمارے دلوں پر بھی مایوسیوں اور ناامیدی کے گھمبیر اندھیرے چھا گئے۔ اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی اور آپؒ کی زندگی کا کوئی امکان بھی روشن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ رات ہمارے لیے قیامت کی رات تھی۔ اسی رات وہ آفتابِ عرفان غروب ہونے والا تھا جس کی ضیاء پاشیوں نے ہزاروں تاریک دلوں کو منور کر دیا تھا۔ اسی رات وہ چراغِ ہدایت گُل ہونے والا تھا جس نے کفر و الحاد اور دہریت کی شبِ تار میں بھٹکی ہوئی انسانیت کے لیے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کی تھی۔ رات کے ایک بجے آپؒ نے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی اور داعی اجل کو لبیک کہا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ٥

عمرہا در کعبہ و بت خانہ مے نالد حیات      تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

احقر العباد

**فقیر عبد الحمید** سروری قادری ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ○

ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک خدائے تعالیٰ کی نسبت اقوامِ عالم کے ایک عام اور عالم گیر عقیدے کی طرف جب ہم خیال کرتے ہیں تو ہمیں خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان اپنے خالقِ حقیقی کی اس پوشیدہ اور مخفی ذات کے ساتھ ایک غیب الغیب باطنی رشتے کے ذریعے وابستہ اور مربوط ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ روشن خیال سائنسدان اور فلسفی سے لے کر ایک سادہ لوح بادیہ نشین وحشی تک تمام اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کے انسان اس ذاتِ مقدس کی ایک اعلیٰ اور برتر ہستی، کمال، جلال اور جمال والی ذات اور صاحبِ قدرت و حکمت پاک وجود کے متعلق متفق الرّائے ہیں۔ سب کے دل پر اس کے نام کا سکّہ بیٹھا ہوا ہے اور ہر دماغ میں اُس کی یاد طوعاً و کرہاً موجود ہے۔ گویا انسان کی مٹی اُس کی یاد اور ذکر کے آبِ حیات سے گوندھی گئی ہے اور اُس کی طینت اور جبلت اپنے خالق کے نام سے تخمر ہے۔ واقعی آدم علیہ السلام کی مٹی کو ازل کے روز اِسم اللہ ذات کی شرابِ ناب سے گوندھا گیا ہے جس کی مستی سے ہر دل مخمور ہے اور جس کے نشے سے ہر دماغ معمور ہے۔

۱۔ دوش[1] دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند گلِ آدم بسر شتند و بپیانہ زدند

۲۔ آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(حافظؔ)

---

[1] کل میں نے فرشتوں کو میخانہ کھولتے ہوئے دیکھا جنھوں نے آدم کی مٹی کو گوندھ کر اس سے پیانہ بنایا۔ امانت کے بوجھ کو آسمان بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا لیکن قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام ڈال دیا گیا۔

تشریح: کل یعنی ازل کے روز میں نے دیکھا فرشتوں نے میخانہ معرفت کا دروازہ کھولا اور آدمی کی مٹی کو شرابِ معرفت سے گوندھا اور پھر اسے پیانہ کی صورت دے دی اور معرفت کی شراب اس میں بطور امانت بھر دی۔ یہ وہ امانت تھی جس کے اٹھانے سے یہ لامحدود آسمان بھی عاجز آ گیا تھا۔ اس امانت کے سونپنے کا معاملہ گویا ایک قرعے اور فال کی حیثیت سے طے ہوا۔ اور قرعۂ فال مجھ نادان انسان کے نام پر ہی ڈالا گیا۔

ترجمہ۔ا۔ کل میں نے فرشتوں کو میخانہ کھولتے ہوئے دیکھا جنھوں نے آدم کی مٹی کو گوندھ کر اس سے پیمانہ بنایا۔

۲۔ امانت کے بوجھ کو آسمان بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لیکن قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام ڈال دیا گیا۔

جس فاضل فلسفی نے انسان کو "متلاشی حق" کا خطاب دیا ہے واقعی اُس کا مبلغ علم انسانی حقیقت کو پوری طرح پا چکا ہے۔ اور کسی شاعر[۱] کا یہ مقولہ "عدم سے جانب ہستی تلاشِ یار میں آئے" بالکل صحیح ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ واجب الوجود کی ہستی کا عقیدہ اس قدر عام، فطرتی اور عالمگیر ہے کہ اس عقیدے کے منکر کو اگر ایک قسم کا خبطی اور جنونی کہا جاوے تو بے جا نہ ہوگا۔ زمین و آسمان کی یہ لامحدود عجیب و غریب صنعت اپنے صانعِ حقیقی کا پورا پورا پتہ دے رہی ہے۔ کائناتِ عالم کا یہ منظم کارخانہ اپنے ازلی کاریگر کو پکار پکار کر بتا رہا ہے۔ جب ہم اس کارخانۂ کائنات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس کے تمام اصولوں کو کمال علم اور حکمت پر مبنی پاتے ہیں۔ دنیا کی اس عظیم الشان مشینری کا پرزہ پرزہ ایک غالب قوت اور ایک زبردست حکمت کے مطابق چل رہا ہے۔ یہاں تک کہ ٹھوس اور بے حس جامد احجار کا ہر ذرّہ قدرت کے ایک نہایت کارآمد اور منظم قانون کے موافق قائم ہے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ مل رہا ہے اور بے جان اشجار کا ہر پتہ فطرت کے ایک محکم امر کے مطابق ہل رہا ہے۔ قدرت کے اس بے قصور نظم و نسق اور فطرت کے اس بے فتور فیضان کو دیکھ کر ہر دانا دل اس حکیم اور علیم ذاتِ والا صفات کے ماننے پر مجبور ہے اور ہر بینا آنکھ اُس صانعِ حقیقی کے جمالِ لازوال سے مسحور ہے۔

برگِ درختانِ[۲] سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

(سعدیؔ)

اللہ تعالیٰ کی اس عجیب و غریب صنعت میں اس قدر حیرت انگیز نظم و نسق اور بے عیب تسلسل کو دیکھ کر انسانی عقل بکمال حیرت و استعجاب میں کھو جاتی ہے اور فہم و قیاس عاجز اور دنگ رہ جاتے ہیں۔ کہیں ذرّہ برابر غلطی معلوم نہیں ہوتی۔ کہیں بدنظمی کا شائبہ تک نظر نہیں

---

۱؎ امیر مینائی ۲؎ دانا آدمی کی نگاہ میں سبز درختوں کا ہر پتہ معرفتِ الٰہی کے دفتر کا ورق ہے۔

آتا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی تربیت اور نگہبانی سے غفلت اور تساہل واقع نہیں ہوتا۔ کس قدر مکمل اور محکم انتظام ہے، کتنا قوی اور زبردست اہتمام ہے۔ دیکھنے والی آنکھ نہیں ورنہ اس چلمن میں سے وہ صانعِ حقیقی جھانک رہا ہے۔ دانا اور شنوا دل نہیں ورنہ وہ ذات بے ہمتا نقابِ کثرت اُٹھا اُٹھا کر توحید کے نغمے سُنا رہا ہے۔

۱۔ یاریست[1] مرا ورائے پردہ　　　حُسنِ رُخِ او سزائے پردہ
۲۔ عالم ہمہ پردۂ مصور　　　اشیا ہمہ نقش ہائے پردہ
۳۔ ایں پردہ مرا زِ تو جُدا کرد　　　اینست خود اقتضائے پردہ
۴۔ گویم کہ میانِ ما جُدائی　　　ہرگز نکند غطائے پردہ

ایک دفعہ ایک اُونٹوں کے چرانے والے جنگل کے بادیہ نشین سے کسی شخص نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کی بابت سوال کیا کہ تو اللہ تعالیٰ کو کس طرح پہچانتا ہے تو اس نے کیا عُمدہ جواب دیا کہ اَلْبَعْرَۃُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ وَالْاَقْدَامُ عَلَى الْمَسِيْرِ فَالسَّمَآءُ ذَاتُ اَبْرَاجٍ وَّالْاَرْضُ ذَاتُ فِجَاجٍ كَيْفَ لَايَدُلَّانِ عَلَى الصَّانِعِ اللَّطِيْفِ الْخَبِيْرِ۔ یعنی جنگل میں اونٹ کا گوبر اُونٹ کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور زمین پر قدموں کے نشانات سے کسی چلنے والے کا پتہ لگتا ہے۔ تو کیا یہ زمین و آسمان اپنے خالق اور صانع حق سبحان کا پتہ نہیں دیتے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　　کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
(مومن)

اس سلسلۂ آب و گِل کا ذرّہ ذرّہ اس آفتابِ عالم تاب کے انوار سے زندہ اور تابندہ ہے اور اس کائنات کا آئینۂ حق نماء اُس کے عکسِ انوارِ جلال و جمال سے درخشندہ ہے۔ تمام اہلِ بصارت بینایانِ زمان اور جملہ اہلِ بصیرت و دانایانِ جہان اور کُل راست باز منصف

ترجمہ[1] ۱۔ پسِ پردہ میرا ایک محبوب ہے جس کے چہرے کا حُسن پردے ہی کا مُستحق ہے۔
۲۔ ساری کائنات ایک منقش پردہ ہے اور اس دنیا کی اشیاء اس پردے کے نقش و نگار ہیں۔
۳۔ اس پردے نے ہی مجھے تجھ سے جدا کر رکھا ہے اور پردے کا تقاضا بھی یہی ہے۔
۴۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے درمیان جدائی نہیں ہوسکتی اس پردے کے چھا جانے سے یعنی میں سمجھتا ہوں کہ اس پردے کا چھا جانا ہمارے درمیان جدائی کا موجب نہیں ہوسکتا۔

مزاج، سلیم العقل صادق انسان اُس ذاتِ مقدّس یعنی اُس قادرِ حق سبحان کے واحد پاک وجود کے ثنا خوان اور اس کی کمال حکمت اور قدرت کے مدّاح ہیں۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫ (اٰلِ عمرٰن ۳: ۱۸۔۱۹) ترجمہ: ''گواہی دیتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تحقیق اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور تمام فرشتے اور جملہ اہلِ علم اس شہادت کی صداقت پر قائم ہیں کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔ تحقیق سچا دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک دینِ اسلام ہے۔'' ایک کور چشم، تاریکی پسند، اُلّو منش مُلحِد کا انکار کس حساب میں ہے۔ اور ایک ظلمت گزین چمگادڑ مثال بے دین کی ہٹ دھرمی اور کفر کی کیا حقیقت ۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم  چشمۂ آفتاب راچہ گناہ
(سعدیؔ)

ترجمہ: اگر دن کے وقت چمگادڑ کچھ نہ دیکھ سکے تو اس میں چشمۂ آفتاب کا کیا قصور ہے۔

حالیؔ مرحوم نے کیا اچھا کہا ہے ۔

کانٹا ہے ہر اِک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اِک گوش میں اٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا
ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا
طوفاں میں ہے جبکہ جہاز چکّر کھاتا
یا قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا جب کہ ہے اُٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا
جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور
منکر بھی پکار اُٹھتے ہیں تجھ کو مجبور
خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ
خورشید کا کشش جہت میں پایا جب نور
جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے
دشمن سے بھی نام ترا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سُکھ میں بھول جائیں اطفال
لیکن اُنہیں دُکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

ملاحدۂ دہر یعنی نیچریوں کو کارخانۂ کائنات چلانے کے لیے ایک عِلت العلل اور فعالِ کُل طاقت کے ماننے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن یہ کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں کہ مکوّنِ کائنات اور خالقِ موجودات ایک بے جان مادہ، بے حِس نیچر اور بے ادراک و بے شعور ہیولیٰ ہو۔ ایسے منظم، باقاعدہ اور علم و حکمت پر مبنی کارخانۂ قدرت کو چلانے والی ذات کو حیات، قدرت، ارادہ، علم، سمع، بصر اور کلام وغیرہ صفاتِ ذاتی سے متصف ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ بے جان ہیولیٰ، بے حِس ایتھر اور بے شعور مادے کا یہ کام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نیچریوں اور دہریوں کو بے وقوفوں کی ایک الگ آبادی اور بستی بسانی چاہیے اور کسی بے حس، بے جاں، بیوقوف و بے شعور دہریہ آدمی کو اُس آبادی کا مختار، کارکن اور منتظم مقرر کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ وہ بستی تھوڑے دنوں میں کس طرح پھولتی پھلتی اور ترقی کرتی ہے۔ یا کسی پاگل خانے میں جا کر بے شعوری کا تھوڑا سا نظارہ کر لینا چاہیے کہ وہاں بے شعوری کیا گل کھلا رہی ہے۔ اگر ایک لحظہ کے لیے بھی اس پر سے ذی شعور اور صاحب عقل انسانوں کی نگرانی اور حفاظت اٹھا دی جائے تو دیکھیے کیا طوفانِ بدتمیزی برپا ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام کارخانوں، فرموں اور مشینوں کو دیکھو، اور حکومت اور سلطنت کے جملہ محکموں اور شعبوں پر غور کرو۔ غرض اس آباد دنیا کی کسی شے، کسی کام اور شعبے پر دھیان کرو۔ سب کے سب علم، شعور، قدرت اور حکمت وغیرہ صفات کے زیرِ اثر مرتب اور تیار ہوئے ہوں گے اور انہی صفات کی حفاظت اور نگرانی میں چل رہے ہوں گے۔ جُو سے کُل کا قیاس کیا جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کائناتِ عالم کا یہ عظیم الشان کارخانہ جس کے ایک گوشے میں آفتاب چراغ کی طرح جل رہا ہے اور جس کا ہر پرزہ علم اور حکمت سے چل رہا ہے اس کے ہر معمولی جز پر تو ذی عقل و ہوش اور صاحبِ علم و حکمت ملازم، مؤکل مسلط ہوں لیکن یہ کل کارخانۂ کائنات بدیں عظمت و وسعت بغیر کاریگر اور نگران کے خود بخود قائم اور چل رہا ہو۔

حضرت امام اعظمؒ نے ایک دہری کو دورانِ مناظرہ میں اس ایک ہی دلیل سے ساکت اور لاجواب کر دیا تھا۔ چنانچہ آپؒ نے فرمایا کہ ''اگر فرض کرو ایک بڑی جھیل ہو اور اس میں ایک کشتی چھوڑ دی جائے تو کیا وہ خود بخود بغیر کسی چلانے والے کے ایک مقررہ وقت پر ایک مخصوص مقام پر آیا کرے گی۔'' تو اُس دہری نے کہا کہ یہ ہرگز ممکن نہیں اس پر آپؒ نے

فرمایا کہ فضائے آسمانی کی اس بڑی وسیع نیلگوں جھیل میں سورج اور چاند کیوں کر بغیر چلانے والے کے ابتداء سے آج تک روزمرہ وقتِ مقررہ پر ایک متعین مقام سے نکل کر ایک خاص مُستقَر اور مخصوص مقام پر جا کر غروب ہوتے ہیں۔ کَمَا قَالَ عَزَّذِکْرُہٗ۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ (یٰسٓ ۳۶: ۳۸-۴۰)۔ ترجمہ: ''اور دیکھو کہ سورج ایک خاص مستقر اور معین راستے پر چل رہا ہے۔ یہ تو خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے اور اسی طرح چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج سے ہو سکتا ہے کہ اپنی دوڑ میں چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور سب مقررہ دائرے اور اندازے میں پھر رہے ہیں۔'' سو حضرت امام اعظم صاحبؒ کی اس مسکت دلیل سے دہری نادم اور تائب ہو گیا۔

دہریوں کا یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ مذہب نے خدا کو ایک ذاتِ واحد قرار دے کر اُس کی عظمت اور وسعت کو محدود کر دیا ہے۔ اس کے بجائے مادے اور نیچر کا مفہوم زیادہ وسیع معنی کا حامل ہے۔ ان نادانوں نے اللہ تعالیٰ کی بے مثل و بے مثال اور لم یزل ولایزال مقدس غیر مخلوق ذات کو اپنی ہیچ مداں اور ہیچ میرز ناتواں خاکی جان پر قیاس کر لیا ہے کہ جسے نہ اپنی جان کی سمجھ ہے اور نہ اپنے گھر اور مکان کی خبر ہے اور نہ اپنے کنبے اور خاندان کی آگاہی رہتی ہے۔ اسلامی خدا کی عظیم الشان ہستی تو ان کی کوتاہ مادی عقل اور فہم سے بہت بالاتر ایک ایسی لامحدود و محیطِ کل منزہ اور مقدس ہستی ہے کہ وہاں اسم اور رسم، وصف و لغت، ظہور و بطون، کلیت و جزئیت اور عمومیت و خصوصیت وغیرہ اعتبارات اور اشارات کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ جملہ اعتبارات و تعینات و اضافات سے بالکل پاک ہے بلکہ قید و اطلاق اور تعین سے بھی مبرّا اور منزّہ ہے۔ وہاں مردہ مادے اور ناچیز نیچر کی کیا حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک ہی صفتِ علم نے تمام مکان اور زمان کو احاطہ کیا ہوا ہے اور تمام عالمِ غیب والشہادت کو گھیرا ہوا ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ

عَلِیْم" ○ (الحدید ۵۷:۳)۔ قولہ تعالیٰ: وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ○ (الطلاق ۱۲:۶۵)۔ ترجمہ: "ایسا اوّل ہے کہ اس سے پہلے کوئی نہیں، اور وہ ایسا آخر ہے کہ اس کے بعد کوئی نہیں۔ وہ ظاہر ہے کہ اس کے اوپر کچھ نہیں، اور وہ باطن ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں اور ہر چیز پر وہ ازرُوئے علم محیط ہے۔" بلکہ ہم اپنے علم اور تجربے کی بنا پر یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقبول بندوں پر جب اللہ تعالیٰ کی اس صفتِ علم کی تجلی ہوتی ہے تو وہ کُل مادہ اور نیچر یعنی کُل مخلوقات اور ہژدہ ہزار عالم کا نظارہ ہاتھ کی ہتھیلی اور انگوٹھے کے ناخن پر کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی پاک منزہ اور مقدس ذات تو وراء الوراثم وراء الوراء ہے۔ مَالِلتُّرَابِ وَرَبِّ الْاَرْبَابِ (مقولہ)۔

| | |
|---|---|
| اے برتر از قیاس[1] و خیال و گمان و وہم | وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم |
| دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عُمر | ماہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم |

(سعدی)

سخت سے سخت مُلحِد، بے دین بھی اگر اپنی ہٹ دھرمی چھوڑ کر اور کسی وقت انصاف کی عینک چڑھا کر اپنے ضمیر کی طرف جھانکے اور غور و فکر کرے کہ جب میں ایک بولتا چالتا، دیکھتا بھالتا اور سوچتا سمجھتا مخلوق موجود ہوں تو ایک واجب الوجود خالقِ کُل ہستی کیوں موجود نہیں۔ تعجب ہے کہ ذرّہ بے مقدار کو اپنی ہستی کا تو اقرار ہے لیکن اُس آفتابِ عالمتاب کی نفی اور انکار ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ سیاست کے جنون، حرص اور طمع، دنیا کے مالیخولیا اور طلبِ عزّ و جاہ کے جوع البقر نے انسان کو اندھا حیوان بنا رکھا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر انسان کی اپنی ہستی سے بڑھ کر زبردست حجت اور قوی دلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

مری ہستی ہے خود شاہد وجودِ ذاتِ باری کی
دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی

چند روز بھی اگر کوئی سلیم العقل اور منصف مزاج شخص یکسو ہو کر اپنے وجود میں غور اور

---

[1] اے وہ ذات کہ جو قیاس، خیال، گمان، وہم اور جو کچھ ہم نے کہا، سنا اور پڑھا اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ تیری مدح ثنا میں دفتر تمام ہو گئے اور عمر ختم ہو گئی لیکن ہم تیری تعریف کی ابتداء ہی میں رہ گئے ہیں۔

تامل کرے گا تو وہ اپنے اندر اپنے خالق مالک کی معرفت کے آثار، اس کے قرب کے اسرار اور اس کے مشاہدے کے انوار صاف طور پر معلوم کرے گا۔ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿الذّٰرِیٰت ۵۱:۲۱﴾ ترجمہ: ”وہ تمہارے نفسوں کے اندر ہے لیکن تم اسے نہیں دیکھتے۔“ مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَهٗ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ ترجمہ: ”جس شخص نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔“ نیز مُلحد بے دین لوگ اپنے اِلحاد کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا نہ تو ہمیں کوئی وجود نظر آتا ہے، نہ اس کی ذات کی کنہ اور حقیقت سمجھ میں آتی ہے، اور نہ اس کی کوئی صریح صفت اور نہ علانیہ فعل اور نہ ٹھوس عمل دنیا میں نظر آتا ہے تو ہم کیونکر جانیں اور یقین کریں کہ وہ موجود ہے۔ سو یاد رہے کہ کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا یا معلوم اور محسوس نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ عقلِ سلیم نے موجودات کا سلسلہ محسوسات اور معلومات تک محدود نہیں رکھا بلکہ جو کچھ بنی نوع انسان کو اپنی عملی اور ذہنی کدوکاوش کی بدولت آج تک معلوم اور محسوس ہوا ہے وہ نامعلوم غیبی کائنات کے ایک ناچیز ذرے سے بھی کم ہے۔

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

لاکھوں قسم کے جراثیم، ہزاروں طرح کی گیسیں اور بے شمار برقی لہریں اسی فضا میں موجود ہیں۔ لیکن ظاہری حواس سے محسوس اور معلوم نہیں ہوتیں۔

یورپ میں ایک نیا مذہب سپر چولزم یعنی مذہب روحانی تقریباً ایک سو سال سے رائج ہے اور کروڑوں لوگ اس کے ماننے والے ہیں اور بے شمار لوگ ہر شہر کے اندر اس جدید علم کی سوسائٹیوں کے ممبر ہیں۔ یہ لوگ اپنے حلقوں اور نشستوں میں ارواح کو حاضر کرتے ہیں، اُن سے بات چیت کرتے ہیں اور ان کے علانیہ فوٹو لیتے ہیں۔ اِن ارواح کے براہِ راست کلام کے ریکارڈ بھرے جاتے ہیں، بے شمار رسالے اور اخبار اس علم کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں جو لوگوں کو اس علم کی صحیح خبریں پہنچاتے ہیں۔ دن بدن اس علم میں ترقی ہو رہی ہے۔ ملک کے بڑے بڑے سائنسدان اور روشن خیال فلسفی اور سر برآوردہ اشخاص حتیٰ کہ پارلیمنٹ کے ممبر تک اس علم کی سوسائٹیوں میں حصہ لینے والے ہیں۔ حالانکہ آج

سے سو سال پہلے تمام یورپ میں ایک شخص بھی موت کے بعد زیستِ ارواح اور ان کے وجود کا قائل نہ تھا لیکن آج وہاں ہر شخص عالمِ ارواح کے وجود اور ان کی حیات بعد ممات کا قائل اور ماننے والا ہے۔ کیونکہ وہ ہزاروں دفعہ اپنی آنکھوں سے ارواح کے مشاہدے اور تجربے کر چکے ہیں۔ یورپ کی مذکورہ بالا تحقیق اور تعلیم اُن ملحدوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے جو یہ رٹ لگایا کرتے ہیں کہ "وہ مرنے والے اب کہاں گئے جو بقائے ارواح کے قائل اور تخاطبِ ارواح کے حامی تھے۔ وہ ہم زندہ منکرین کو آ کر کیوں نہیں بتا دیتے کہ ہم زندہ ہیں اور اس حقیقت کو بے نقاب کیوں نہیں کر دیتے اور کیوں لا مذہبیت اور بے دینی کو جاری رہنے دیا ہے۔" سو مغرب میں تو مُردے جی کر اٹھ بیٹھے ہیں اور علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ ہم زندہ ہیں اور وہاں مردوں اور زندوں کے درمیان پردہ چاک ہو گیا ہے لیکن مشرق والے ابھی تک الحاد اور دہریت کی ظلمت اور اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہم آگے جا کر اس علم کی حقیقت اور اس کا مفصّل حال بیان کریں گے۔ غرض یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ چیز جو ہمیں حواسِ خمسہ کے ذریعے محسوس اور معلوم نہیں ہوتی وہ موجود بھی نہیں ہے۔ بیشمار جن، ملائکہ اور ارواح ہمارے اردگرد دن رات پھرتے ہیں اور لاتعداد لطیف چیزیں ہماری اس فضا میں موجود ہیں۔ ایسی باطنی چیزوں کا انکار خود منکرین اور ظاہر بین لوگوں کے باطنی حواس کے فقدان کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنی وسیع عظیم الشان منزہ ذات، جملہ پاک صفات، کل اسماء اور تمام افعال کے ساتھ کائنات کے ذرّے ذرّے میں جلوہ گر ہے اور انسان کی شاہ رگ بلکہ اس کی جان سے بھی نزدیک تر ہے لیکن غافل اندھے عوام کالانعام کیا دیکھیں۔ سورج تمام جہان کو روشن کر رہا ہوتا ہے اور اندھوں کے ماتھوں کو جلاتا ہے لیکن اندھے سورج کے وجود سے اندھیرے میں رہتے ہیں۔

آنکھ والا ترے جوبن کا تماشہ دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

(داغ دہلوی)

اب صرف یہ اعتراض باقی رہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بعض پر تو ظاہر کر دی ہیں اور بعض سے مخفی کیوں رکھی ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے اللہ تعالیٰ

نے انسان کو آزمائش اور امتحان کے لیے پیدا کیا ہے اور ازل کے دن ارواح کو اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؕ (الاعراف ۷: ۱۷۲) (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) کے مجمل سوال یعنی اپنے اظہارِ ربوبیت کے اورل (ORAL) زبانی امتحان میں آزمایا اور ان سے اقرارِ عبودیت لیا۔ چنانچہ ازل کے روز سب ارواح نے متفقہ طور پر ''بَلٰی'' (الاعراف ۷: ۱۷۲) یعنی اثبات میں جواب دیا کہ بے شک تو ہمارا رب ہے۔ بعدہٗ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے کمرۂ امتحان میں داخل کر کے ان سے اپنی ربوبیت اور توحید کے مشکل اور لاینحل تحریری جوابات مادے کے کثیف پرچوں پر طلب کیے۔ جنہیں کراماً کاتبین فرشتے روزانہ صبح اور شام لپیٹ لپیٹ کر اپنی فائل اور ریکارڈ میں شامل کرتے جاتے ہیں اور قیامت کے عظیم الشان روزِ امتحان میں ان کے نتائج ظاہر ہوں گے۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (الملک ۶۷: ۲) ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا اور ان ہر دو کی کشمکش میں انسان کو مبتلا کیا تاکہ ان کو آزما کر دیکھے کہ کون ان میں سے اچھے عمل کرتا ہے۔'' آپ خود اندازہ لگا لیں گے کہ سکولوں اور کالجوں کے دنیوی امتحانوں میں جوابات کے اخفا اور کتمان کا کس قدر زبردست اہتمام ہوا کرتا ہے۔ سوالات کے پرچے سامنے رکھ دیئے جاتے ہیں لیکن ان کے جوابات کے چھپانے میں کمال درجے کی احتیاط برتی جاتی ہے حالانکہ اس دنیوی امتحان کی کامیابی پر چند روزہ دنیوی عیش اور راحت موقوف اور منحصر ہے۔ پس جس امتحان پر ابدالآباد کی خوشی اور راحت یا ابدی حرمان اور ناکامی کا انحصار ہو اس کے جوابات کے اخفاء اور کتمان کا جس قدر بھی زبردست اہتمام ہو کم ہے۔ مُلحدوں اور دہریوں کا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے ملائکہ اور اس کی قدرت کے افعال اگر دنیا میں موجود ہیں تو انہیں ضرور کسی نہ کسی صورت میں ہمیں نظر آ جانا چاہیے، ایسا ہے جیسا کہ کمرۂ امتحان میں کوئی نہایت احمق اور پاگل طالب علم یہ سوال کر بیٹھے کہ ہمارے پاس ان امتحانات کے پرچوں پر تو سوالات ہی سوالات درج ہیں ان کے مقابلے میں جوابات کیوں نہیں دیئے گئے۔ اس بے وقوف نے کمرۂ امتحان کو خالہ جی کا گھر سمجھ رکھا ہے۔

بر سرِ طور ہوا طنبورِ شہوت می زنی
عشقِ مردِ لَـنْ تَـرَانِـیْ را بدیں خواری مجو

(حافظؔ)

ترجمہ: تو ہوا و ہوس کے طور پر خواہشات کا رباب بجا رہا ہے (اے نادان) اس مرد کا عشق جسے "لَنْ تَرَانِی" کہا گیا تھا اسے اپنی بیہودہ محنت سے مت مانگ۔

اللہ تعالیٰ کے انوارِ ذات و صفات اور اس کی قدرت کی آیاتِ بینات اور لطیف غیبی مخلوقات یعنی دجن، ملائکہ اور ارواح وغیرہ تمام لطیف دنیا کی غیبی لطیف چیزیں ہیں۔ انکا دیکھنا اور معلوم کرنا ظاہری حواس اور مادی عقل کا کام نہیں ہے۔ ان کے معلوم اور محسوس کرنے کے لیے باطنی حواس درکار ہیں۔ جس طرح ظاہری حواس ایک دوسرے کا کام نہیں کر سکتے یعنی آنکھیں کانوں کا کام اور کان آنکھوں کا کام نہیں کر سکتے، اسی طرح ظاہری حواس باطنی حواس کا کام انجام نہیں دے سکتے۔ باطنی حواس کے حصول کے لیے مجاہدہ اور ریاضت شرط ہے اور اس کے لیے استاد مُربّی کی ضرورت ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت ۶۹:۲۹)۔ یعنی جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش اور محنت کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں۔

در مکتبِ حقائق پیشِ ادیبِ عشق
ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(حافظؔ)

ترجمہ: حقائق کی درس گاہ میں عشق کے ادیب[۲] کے سامنے اور ہاں اے بیٹا محنت سے کام لے تا کہ کسی دن تو بھی باپ کہلائے۔

روحانی سکولوں اور کالجوں میں باطنی تعلیم کے لیے پیہم محنت اور کوشش کرتے کرتے

---

[۱] "مردِ لن ترانی" سے یہاں موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ لن ترانی کے معنے ہیں "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا" یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوہِ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا تھا۔

[۲] ادیبِ عشق سے مراد یہاں روحانی صاحبِ کمال لوگ ہیں۔ مطلب یہ ہے کسی صاحبِ کمال شخص سے عشقِ الٰہی کا سبق سیکھ۔ پھر تو اس قابل ہوگا کہ اپنے آپ کو مکمل آدمی کہہ سکے۔

سالک لوگ عقلِ کُل اور باطنی حواس پیدا کر لیتے ہیں اور درجہ عین الیقین کو پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی دنیا میں آخرت کے بھاری امتحان کے خوف اور فیل ہونے کے حُزن اور غم سے نجات پالیتے ہیں۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ٥ (یونس ۱۰: ۶۲) ۔غرض باطن میں نفوس کے مدرسے الگ ہیں، قلوب کے مکتب اور ہیں اور ارواح اور اسرار کے کالج علیحدہ ہیں۔ جن لوگوں کو کبھی بھولے سے بھی ان باطنی سکولوں اور روحانی کالجوں کی طرف گذر نصیب نہیں ہوا وہ کور چشم نفسانی ان باطنی علوم اور اس غیبی سر رشتۂ تعلیم اور ان کے روحانی استادوں اور پروفیسروں کو کیا جانیں اور اس باطنی روحانی دنیا کا انکار نہ کریں تو اور کیا کریں۔

حیف کیں بے بصراں تا بہ ابد بے خبر اند
زانچہ در دیدۂ صاحب نظراں مے آید
(حافظ)

ترجمہ: افسوس کہ یہ (دنیاوی) اندھے ابد تک بے خبر ہیں اس حقیقت سے جسے صاحب نظر لوگ مشاہدہ کرتے ہیں۔

غرض یہ دنیا دارُ الامتحان ہے۔ خواہ کوئی یہاں ٹھیک عمل کرے یا خطا، نہ کسی کو فوری سزا ملتی ہے اور نہ پوری جزا۔ کیونکہ نتیجے کا وقت مقررہ ابھی دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاقی غلطیوں اور شرعی جرموں پر اس دارِ فانی میں جلد اور فوری سزائیں مترتب نہیں ہوتیں اور نہ پوری سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص زنا کرتا ہے تو شریعت اسے سو دُرّے مارنے یا سنگسار کر کے ہلاک کرنے کا حکم دیتی ہے لیکن دوسرا شخص ہزاروں دفعہ زنا کر کے ہر قسم کی دُنیوی سزا سے بچ رہتا ہے۔ یا ایک شخص عمداً اور ارادتاً قتل کرتا ہے تو قانون اور شریعت اس کے لیے سزائے موت مقرر کرتے ہیں لیکن دوسرا شخص ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بے گناہ انسانوں کے قتل کا موجب بنتا ہے تو کیا ہزاروں دفعہ زنا کا مرتکب یا لاکھوں بے گناہوں کے قاتل کو اس مادی دنیا میں پوری پوری سزا دی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں، تو اس قسم کے اکابر مجرمین کو پوری اور واجبی سزائیں تب ہی مل سکتی ہیں جب کہ ان کے لیے ایسی دنیا قائم کی جائے جس میں وقت کا کوئی تعین نہ ہو اور عمریں بہت دراز ہوں اور ہر مجرم کو بے

شمار جسم عطا کیے جائیں اور انہیں بار بار مار کر اور زندہ کر کے عذاب دیا جائے۔ سو یہ کام دنیا کے محدود دارالاسباب میں مترتب نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے آخرت کا غیر مختتم دارالقدرت اور دارالمکافات قائم کیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اس قسم کے سنگین جرموں کے لیے سخت دردناک قسم کے طویل عذابوں کا ذکر جا بجا موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ۝ (الفرقان ۲۵ : ۱۳ ـ ۱۴)۔ ترجمہ: ''اور جب مجرم جہنم اور دوزخ کی تاریک وادیوں کے اندر زنجیروں میں جکڑے ہوئے ڈال دیے جائیں گے تو اس وقت وہ لوگ سخت دردناک عذاب سے بچنے کے لیے موت اور ہلاکت کی دعا اور درخواست کریں گے لیکن انہیں جواب ملے گا کہ تم ایک موت اور ہلاکت کی اُمید نہ رکھو بلکہ بے شمار موتوں کا عذاب تم نے چکھنا ہے۔'' اور دوسری جگہ آیا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النساء ۴ : ۵۶)۔ ترجمہ: ''جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہے عنقریب اُنہیں دوزخ کی سخت آگ جلائے گی۔ جس وقت ان کے چمڑے (جسم) جل جائیں گے تو انکے علاوہ انہیں اور چمڑے (جسم) دیے جائیں گے تاکہ پورا پورا عذاب چکھ لیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔'' غرض قیامت کا دارالقدرت اور دارالمکافات ضروری اور لازمی ہے اور یہ دنیا دائرُ الامتحان ہے۔ کمرۂ امتحان میں کسی کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ تو صحیح عمل کر رہا ہے یا غلط۔ نتیجے پر ہر شخص کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ افسوس کور چشمی اور ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں ہے اور ازلی بدبختوں کو اللہ کی مار ہے۔ ورنہ عقل، نورِ ایمان اور باطنی بصیرت والوں کے لیے کائنات کے ہر ذرّے کے اندر بے شمار آیات بیّنات اور ہزار ہا نشانیاں موجود ہیں۔ جو پکار پکار کر اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کر رہی ہیں۔

ترا ز دوست بگویم حکایتے بے پوست ۔۔۔ ہمہ از وست وگر نیک بنگری ہمہ اوست
جمالش از ہمہ ذرّاتِ کون مکشوف است ۔۔۔ حجابِ تو ہمہ پندار ہائے تو بر توست

ترجمہ: میں تجھ سے محبوب کی ایک اصلی حکایت بیان کرتا ہوں۔ ہر چیز اسی سے ہے اور

اگر تو غور سے دیکھے تو سب کچھ وہی ہے۔

کائنات کے ہر ذرہ سے اس کا جمال ظاہر ہے۔ تیرا غرور اور نخوت جو تجھ پر طاری ہے وہی تیرا حجاب ہے۔

..........................○..........................

# خُدا کی نسبت یورپ کے مشہور علماءِ سائنس کے خیالات

لارڈ کیلون (سرولیم تھامسن) جو سکاٹ لینڈ کی گلاسگو یونیورسٹی میں پچاس برس تک نیچرل فلاسفی پڑھاتے رہے اور جنہوں نے طبیعات اور ریاضیات میں نئی دریافتیں کیں اور کئی جدید ایجادات واختراعات آپ کے نام سے منسوب ہیں۔ آپ نے اپریل ۱۹۰۳ء میں لنڈن کی یونیورسٹی کالج کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''سائنس پختہ یقین اور کامل اعتبار کے ساتھ ایک خالقِ ارض وسما کی قائل ہے اور ہمیں اس قادرِ مطلق کے وجود پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ ہماری ہستی کا موجد اور اسے سنبھالنے اور قائم رکھنے والا بے جان مادہ نہیں ہے بلکہ وہ قوت ہے جس سے موجودات خلق ہوتی اور ہدایت پاتی ہیں۔ سائنس کی تحقیقات اور انکشافات ہمیں اس وجودِ لایزال پر ایمانِ کُلّی رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ جب ہم اپنے گردوپیش کے طبعی تبدّلات اور انقلابات اور موجودات کی حرکات وسکنات کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہم مذکورہ بالا نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خداوند خالق اپنی اس حکمت اور صنعت سے ظاہر ہوتا ہے جو نظامِ عالم اور موجودات کی ترتیب وترکیب میں نظر آتی ہے۔ سائنس ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ایسی قوت پر ایمان لائیں جو عالم کے تمام طبعی عملوں کو تحریک دیتی اور راہِ راست پر ڈالتی ہے اور وہ خالق قوتِ فطری، برقی یا مکینیکل قوت سے بالکل مختلف ہے۔ اسے ذرّات کے خود بخود آپس میں مل جانے کے نظریے سے کوئی سروکار نہیں جس کو زمانہ حال کے تمام سائنس دان اتفاقِ رائے سے نہایت لغو اور نامعقول ٹھہراتے ہیں یعنی تمام علما اور محققین اس امر پر متفق ہیں کہ عالم اور مافی العالم ذرّات کے اتفاقی ارتباط اور اتحاد سے وجود پذیر نہیں بلکہ ایک ذی عقل اور صاحب ارادہ وجود کی حکمت وقدرت سے موجودات نے ہستی قبول کی ہے۔ زندہ اجسام کے اندر جو مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ بھی اتفاقی نہیں ہوتیں بلکہ خالق کی ہدایت اور مقرر کردہ قانون سے عمل میں آتی ہیں۔ ان تمام عملوں میں سائنس ایک خالق کا وجود مانتی ہے۔

''چالیس سال ہوئے کہ جرمنی کے مشہور عالم کیمیات ڈاکٹر لی بک کے ساتھ شہر سے

باہر کھیتوں کی سیر کر رہا تھا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ 'فرمائیے کیا یہ پودے کیمیائی عمل سے پیدا ہوتے اور نمو حاصل کرتے ہیں؟' وہ کہنے لگے 'ہرگز نہیں، میری رائے یہ ہے کہ جس طرح علم نباتات کی کتاب آپ سے آپ مرتب نہیں ہو جاتی اسی طرح یہ پودے اور پھول بھی از خود پیدا نہیں ہوتے۔ اِرادت کا ہر فعل طبیعات، کیمیات اور ارضیات کے نزدیک خرقِ عادت ہے۔ آزادی اور بے باکی کے ساتھ سوچنے اور غور کرنے سے نہ گھبراؤ۔ اگر تم خوب فکر کرو گے تو خدا کی ہستی پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکو گے جو مذہب کی بنیاد اور اصل اصول ہے۔ سائنس ہرگز مذہب کی دشمن نہیں ہے بلکہ معاون ہے۔''

لارڈ سالس بری صرف مدبر ہی نہ تھے بلکہ ایک مشہور عالم بھی تھے۔ آپ ۱۸۷۷ء اور ۱۸۸۶ء میں کنسر ویٹو وزارتوں میں وزیر ہند مقرر ہوئے اور دو مرتبہ برطانیہ کے وزیر اعظم بھی مقرر ہوئے۔ آپ کی علمیت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ آپ ۱۸۴۰ء کی برٹش ایسوسی ایشن کے اجلاس کے صدر اعظم مقرر ہوئے۔ ''کنٹمپو رری ریویو'' اور نائینتھ سنچری'' میں ہربرٹ سپنسر کے ساتھ مسئلہ ارتقا پر ان کی خوب زوردار بحثیں ہوئیں اور کئی نمبروں میں دونوں طرف سے مسلسل عالمانہ مضامین شائع ہوتے رہے۔ آپ نے آکسفورڈ میں ایک ایڈریس کے دوران فرمایا تھا: ''مدت سے میرا یہ خیال ہے کہ اگر نباتات اور حیوانات میں عملِ ارتقا رونما ہوا ہے تو وہ انتخابِ طبعی کے مسئلہ میں نہیں پایا جاتا اور ارتقا کا صحیح مسئلہ اس سے بہت بیگانہ ہے۔ میں نے بہت غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ حیوانات کی ابتدا و تبلیغ کی بابت جو تحقیقات گذشتہ چند سال کے دوران ہوتی رہی ہیں اس میں مقاصد و اغراض کے استدلال سے بالکل چشم پوشی کی گئی ہے۔ کائنات کو بنظر غور دیکھنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ایک ذی عقل و ذی ارادہ ہستی نے موجودات کو ایک خاص مصرف کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کے ثبوت میں بے شمار دلائل ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ اگر علمِ طبیعات یا سائنس کی پریشانیاں ہماری بصارت پر پردہ ڈال دیں کہ کچھ دیر کے لیے ہم ان کی طرف سے بے پرواہ ہو جائیں تاہم وہ پھر ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ ان نشانات کی بنیاد پر ہم یہ ماننے کے لیے مجبور ہیں کہ ایک فعل مختار اور صاحب ارادہ ہستی نے کائنات اور موجودات کو اپنی قدرتِ کاملہ سے بنایا ہے۔ نیز ہم یہ بھی

سکھتے ہیں کہ تمام جاندار ہستیاں اس صاحب ذاتِ لایزال اور خالق بے زوال اور حاکم بے مثال کی حکمت وقدرت کی محتاج اور دست نگر ہیں۔“

ڈاکٹر الفریڈ اسل والس اقلیمِ سائنس کے پیر فرتوت کہلاتے ہیں۔ آپ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۳ء میں آپ نے اپنی نہایت مشہور علمی کتاب ”ورلڈ آف لائف“ شائع کرکے اپنے نصف صدی کے خیالات اور علمی تحقیقات کے نتائج دنیا کے سامنے رکھے۔ اس کتاب نے بڑا نام پایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف مسئلہ ارتقا بذریعہ انتخاب طبعی کے اِکتشاف میں ڈارون کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں۔ آپ خداپرست اور دیندار آدمی تھے۔ سائنسدانوں کی نظر میں آپ کا قول سند سمجھا جاتا ہے۔ آپ اپنی ایک تصنیف ”نیچرل سلیکشن“ یعنی انتخابِ طبعی میں ایک جگہ فرماتے ہیں ”انسان صرف عملِ ارتقا سے قادرِ مطلق کی قدرت وحکمت کے بغیر پیدا نہیں ہوا ہے۔ قوت نفسِ ناطقہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جتنی قسم کی قوت پائی جاتی ہے وہ قوت ارادہ ہے۔ اگر اِرادت کوئی چیز ہے تو وہ ایک طاقت ہے جو ان قوتوں کے عمل کی ہدایت کرتی ہے جو جسم کے اندر مجتمع ہیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جسم کا کوئی حصہ قوت کا اثر قبول کیے بغیر ہدایت کے تابع ہو۔ اگر ہم یہ معلوم کرلیں کہ ادنٰے سے ادنٰے قوت بھی اِرادت سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے سوا ہمیں قوت کا کوئی اور ابتدائی وسیلہ اور سبب معلوم نہ ہو تو ہم یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہر قسم کی قوت قوتِ ارادی ہوتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر یہ دعویٰ قائم ہوسکتا ہے کہ تمام عالم نہ صرف اعلیٰ ذی عقل ہستیوں پر منحصر ہے بلکہ انہی کے وجود پر مشتمل ہے یا یوں کہو کہ وہ سب سے اعلیٰ عقل وحکمت ہے۔“

کائنات کی تمام مخلوق کیا جاندار اور کیا بے جان، کیا حجر وکیا شجر، کیا چھوٹی کیا بڑی اور کیا علوی کیا سِفلی سب زبانِ حال سے اپنے خالق مالک اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور توحید کے گیت یک رنگی اور یک آہنگی سے گارہی ہے۔ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ (الجمعۃ ۶۲ : ۱) ۔ اشیائے کائنات میں یک رنگی اور انکی ترتیب میں یک آہنگی اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ ان کا خالق اور مالک ایک واحد لاشریک ہستی اور بے مثل وبے ہمتا ذات ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ فرض کرو ایک شخص بہت نیچے اتر کر تحت الثریٰ کی تاریکیوں میں سے ایک نرالی دھات کا ٹکڑا اٹھا لاتا ہے اور پھر بحرِ اوقیانوس کی گہرائیوں

میں کئی میل نیچے غوطہ لگا کر وہاں سے کوئی آبی خول نکال لاتا ہے اور تیسری دفعہ فضائے آسمان کی بلندیوں میں لاکھوں کروڑوں میل اوپر چڑھ کر کسی بہت دور کے ستارے سے کوئی کنکر اٹھا لاتا ہے۔ اب ان تینوں اشیاء کو خوردبین کے نیچے رکھ کر ان کے اجزائے ترکیبی کا موجودہ سائنس کی روشنی میں بغور مطالعہ کیا جائے تو موجودہ سائنس کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ان تینوں کے اجزائے ترکیبی میں وہی ذرّاتِ برقیہ ہیں جو اشیائے کائنات کی تمام اشیاء کے تمام چھوٹے بڑے اجسام اور اجرام میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ ماہ سے ماہی اور ثریا سے ثریٰ تک کائناتِ عالم کی تمام اشیاء کے اجزائے ترکیبی کی یہ وحدت صاف طور پر وحدتِ خالق کا ناقابلِ تردید مظاہرہ ہے یا دوسرے لفظوں میں اشیائے کائنات کے زبانِ حال کا متفقہ اعلان ہے کہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ یعنی یہ کہ ہمارا خالق، رب العالمین اور معبودِ برحق ایک واحد مطلق ذات ہے۔ چنانچہ مصر کے میناروں سے نکلی ہوئی ہزاروں سال کی چیزیں، مختلف زمانوں میں سنگبار ستاروں سے گرے ہوئے دھات اور پتھر کے ٹکڑے، بلند ترین پہاڑوں کی چوٹیوں سے لائے ہوئے مختلف کنکر اور سمندر کی گہرائیوں سے نکالے ہوئے خول اور گھونگے آج کل دنیا کے مختلف عجائب خانوں میں موجود ہیں اور موجودہ سائنس اور کیمسٹری کی روشنی میں ان کے عناصرِ ترکیبی کا تجزیہ کر کے بغور مطالعہ کیا گیا تو متفقہ طور پر وہی مذکورہ بالا نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان سب کی ساخت ایک ہی قسم کی ہے اور یہ سب ایک ہی کاریگر کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ٥ (الرحمٰن ۵۵: ۶)۔
ترجمہ: ”آسمان پر ستارے اور زمین پر درخت اپنے خالق مالک کے آگے سجدہ ریز ہیں۔“
اور تمام علوی اور سفلی مخلوق اس کی ربوبیت اور اپنی عبودیت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کی روشنی آسمان کے ٹمٹماتے ہوئے ستارے سے جھلک رہی ہے۔ اس کی صنعت اور حکمت کے نیم عریاں جلوے درختوں کے ناچتے ہوئے پتوں اور مسکراتے ہوئے پھولوں سے جھلک رہے ہیں۔ اُس کی عظمت بلند پہاڑوں سے ترانے گاتی ہوئی اترتی ہے اور فضا میں سیاہ خوفناک بادل اور مہیب اور ذخار سمندروں اور دریاؤں کی طوفانی لہریں اس کی ہیبت اور جلال سے گونج رہی ہیں۔ لیکن انسان ہے کہ پیر سے چوٹی تک غفلت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنی کوتاہ عقل اور پندار کا نکما اور خالی گھمنڈ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیاتِ بینات سے

بے وجہ اعراض اور بیہودہ چشم پوشی ہے۔ وَكَأَيِّنْ مِنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (یوسف ۱۲: ۱۰۵)۔ ترجمہ: ''آسمانوں اور زمینوں کے اندر خدائے تعالیٰ کی قدرت کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں اور ان غافل انسانوں کا اس پر دن رات گزر ہے لیکن وہ اُن سے جاہلانہ اور متکبرانہ اعراض اور کنارہ کرتے ہیں۔'' اندھے جاہل اور نادان انسان کو اپنے آپ کی اور ایک ذرۂ بے مقدار تک کی تو خبر نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے بے مثل اور بے مثال اور لم یزل ولا یزال ذات کی کُنہہ اور حقیقت میں عقلی گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ (یٰسٓ ۳۶: ۷۸)۔ ترجمہ: ''انسان ہماری نسبت تو مثالیں قائم کرتا ہے لیکن اسے اپنی خِلقت اور پیدائش تک کا پتہ نہیں۔''

| | |
|---|---|
| در[۱] ذاتِ خدا فکرِ فراواں چہ کنی | جاں رازِ قصورِ خویش حیراں چہ کنی |
| چوں تو نہ رسی بکنہِ یک ذرّہ تمام | درکنہ خدا دعویٰ عرفاں چہ کُنی |

(ابوالخیر ابوسعید)

مغرب کے وارثانِ علم وحکمت علم الاجسام کی موشگافیوں اور دقیق آرائیوں میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔ یہ لوگ اشیائے دنیا کے خواص اور اجسام کائنات کے ظاہری اثرات کی تحقیقات میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور مادی دنیا کی ہر شے کو دریافت کرنے اور ان کے ظواہر کے پیچھے لگ کر ان سے طلب عمل کرنے میں عمریں صرف کر رہے ہیں۔ مگر خود اپنے بارے میں کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا کہ ہم کیا ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ موت کے بعد انسان کا کیا حال ہوتا ہے۔ موت کا معمہ ان کے لیے نا قابلِ حل ہے اور فنا کا حجابِ اکبر ان کے لیے نا قابلِ عبور ہے۔ منتہائے حیات کا سرِّ عظیم کس قدر نا تلاش کردہ پڑا ہوا ہے۔ آفاق کے بحرِ ظلمات میں ان کے عقلی گھوڑے سکندرِ اعظم سے بھی آگے نکل گئے ہیں مگر انفس کی آبِ حیات کی تلاش میں یہ لوگ

---

[۱] تو اللہ تعالیٰ کی ذات میں زیادہ غور فکر کیا کر رہا ہے اور اپنی روح کو کوتاہ اندیشیوں سے کیوں حیران کرتا ہے۔ جب تو ایک ذرّہ کی حقیقت تک کامل رسائی حاصل نہیں کر سکتا تو ذاتِ باری تعالیٰ کی حقیقت میں عرفان کا دعویٰ کیوں کرتا ہے۔

لولے، لنگڑے، اندھے اور بہرے ہیں۔ دنیا کے علم الاشیاء میں سے مذہب بہت بڑا راز ہے مگر افسوس کہ مغرب کا دجال دینی آنکھ سے کانا ہے۔ گو اس کی دُنیوی آنکھ روشن ہے۔ وہ ہر چیز کو دُنیوی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے دُنیوی مفاد حاصل کرتا ہے۔ وہ قرآن جیسی عدیم المثال اور بے بدل روشن آسمانی کتاب کو محض تاریخی لحاظ سے پڑھتا ہے۔ وہ اندھے کی طرح آفتاب سے صرف تاپنے اور گرم ہونے کے سوا اور کچھ فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ اس لیے ان لوگوں نے مذہب کے ضروری علم کو دائرۂ عمل سے خارج کر دیا ہے اور اس کی تحقیق کو غیر ضروری خیال کر لیا ہے۔ ظاہر بین مادہ پرست مغرب نے مادے کے صدف کو تو اپنی گود میں لے لیا ہے لیکن مذہب کے عزیز القدر پوشیدہ دُرِ گرانمایہ کی تحصیل اور تلاش کی طرف مطلق کوئی توجہ اور التفات نہیں۔ یہ لوگ اپنی مادی عقل اور علم کے غرور اور دُنیوی ہنر اور فن کے گھمنڈ میں مذہب اور رُوحانیت حتیٰ کہ خدا کے وجود کا بھی انکار کر رہے ہیں۔ جدید علم رُوحانی یعنی سپر چولزم جس کے ذریعے یہ ارواح کی حاضرات کر کے ان سے بات چیت کرتے ہیں۔ گو یہ تمام مذاہبِ عالم کا ایک متفقہ اور مسلمہ عقیدہ اور نظریہ ہے کہ موت کے بعد ارواح زندہ رہتی ہیں اور سکھ اور دُکھ پاتی ہیں اور یہ علم مذہب اور دین کی عین تائید کر رہا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو مذہب کے نام سے اتنی چڑ ہے کہ اسے ایک نیا علم اور اختراع بتاتے ہیں اور مذہب کا نام نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ اسے مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور ہمارا یہ علم ابھی تک خدا کے وجود کے متعلق خاموش اور ساکت ہے۔ باوجود علم اور دیکھنے بھالنے کے اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کر رکھا ہے۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (الجاثیہ ۴۵: ۲۳)۔ ترجمہ: ’’آیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے پکڑا اپنی ہوائے نفس کو اپنا معبود اور اللہ تعالیٰ نے باوجود علم کے اسے گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دِل پر مُہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر کفر کا پردہ ڈال دیا۔ سو اللہ کے بعد ایسے شخص کو کون ہدایت کر سکتا ہے۔ آیا تم نہیں سمجھتے۔‘‘ ابھی تک یہ لوگ آسمانی کتابوں خاص کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست اتری ہوئی سچی بے مثل کتاب یعنی قرآنِ کریم کے زبردست اخلاقی اصولوں اور رُوحانیت و تصوف کے سچے ٹھوس حقائق اور معارف کے تمسخر

اور اِستہزاء کے درپے ہیں۔ ابھی تک تو مادے کے سطحی علوم سے بھی ایک نہایت ہی قلیل حصہ حاصل کیا گیا ہے اور نہایت ہی معمولی اشیاء کی حقیقت میں دانایانِ فرنگ کی عقلیں دنگ ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ایک ناچیز مکھی یعنی جگنو کی روشنی کی حقیقت میں دنیا کے سائنسدان حیران اور ششدر ہیں کیونکہ سائنس کے اصول کے مطابق روشنی اور حرارت لازم وملزوم ہیں لیکن جگنو کے وجود میں روشنی بغیر حرارت موجود اور قائم ہے۔ غرض آج تک سائنس اور علم جدید کی تحقیقات نے جس قدر اصول اور نظریے قائم کیے ہیں ان میں بے شمار واماندگیاں اور بے اندازہ خامیاں موجود ہیں۔ اکثر میں اختلاف رائے ہے اور جس طرح آج کل کے سائنسدانوں اور فلاسفروں نے اگلے زمانے کے حکماء اور فیلسوفوں کے قائم کردہ اصولوں اور نظریوں کو غلط ثابت کر کے جھٹلا دیا ہے اسی طرح آج سے سو سال پیچھے آنے والا زمانہ آج کل کے سائنسدانوں کے قائم کردہ مسائل اور اصولوں کو غلط ثابت کر کے ٹھکرا دے گا اور مادی علم کا سلسلہ اوّل سے آخر تک ظنّی اور قیاسی ثابت ہوگا۔ ہاں بعض قریب کی معمولی اشیاء کا علم جو حواسِ خمسہ کے دائرے کے اندر واقع ہیں ضرور انسان کو سائنس کے تجارب اور مشاہدوں سے حاصل ہوا ہے لیکن اس پر غرّہ ہونا اور اسی کو سب کچھ سمجھنا بڑی کوتاہ اندیشی، سخت تنگ ظرفی اور پرلے درجے کی نادانی ہے۔ ابھی تک تو عالمِ شہادت اور آفاق کا ایک وسیع جہان اُن کے سامنے ناتلاش کردہ پڑا ہے جو عالمِ غیب اور انفس کے لطیف جہان کے مقابلے میں اس قدر تنگ و تاریک ہے جتنا کہ اس مادی دُنیا کے مقابلے میں ماں کا رِحم ہے۔ بھلا جس جہان میں یہ لوگ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوئے بلکہ خام ناتمام جنین کی طرح رِحم مادرِ گیتی میں پڑے ہوئے ہیں وہ عالمِ دارِ آخرت کے وسیع اور عریض لامحدود اور غیر مختتم جہان کی حقیقت کیا جانیں۔

فلفی گشتی و آگہ نیستی[1] | خود کجا و از کجا و کیستی
از خود آگہ چوں نۂ اے بے شعور | پس نباید برچنیں علمت غرور

(رومی)

---

[1] تو فلفی ہو گیا ہے اور تو نہیں جانتا کہ تو کیا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کون ہے۔ اے بے عقل، جب تو اپنی ہستی کا شناسا نہیں تو ایسے علم پر تجھے مغرور نہیں ہونا چاہیے۔

دُنیا میں تمام مادی اشیا کی تین حالتیں ہیں: اوّل ٹھوس جامد جیسے اینٹ، پتھر اور لکڑی وغیرہ، دوم مائع بہنے والی مثلاً پانی، دودھ اور تیل، سوم گیس، اڑنے والی مثلاً بھاپ، دھواں اور ہوا وغیرہ۔ پانی کے اندر یہ تینوں حالتیں موجود اور محسوس ہوتی ہیں یعنی برف کی حالت میں یہ ٹھوس جامد صورت اختیار کر لیتا ہے، جب پگھل کر مائع بن جائے تو مائع ہے اور جب آگ پر اسے کافی حرارت دی جائے تو بھاپ اور گیس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان تینوں صورتوں میں گیس کی صورت بہت لطیف، غیر مرئی اور غیر محسوس ہے۔ اب اسی ہوا کو لیا جائے اور اس کے اجزائے ترکیبی کو دیکھا جائے تو وہ زیادہ لطیف گیسوں آکسیجن، ہائیڈروجن اور نائٹروجن وغیرہ سے مرکب ہے۔ اسی طرح یہ گیسیں بھی ایتھر کے ذرّاتِ برقیہ سے مرکب ہیں۔ لیکن انسانی حواس کی پہنچ اور علمِ سائنس اور کیمسٹری کے تجارب اور مشاہدات یہاں آکر ختم ہو جاتے ہیں اور اس سے آگے تجاوز نہیں کر سکتے۔ اس لیے انسان اس سے زیادہ لطیف اشیاء کی دُنیا کو خلا یا عدم کا نام دے کر اس کی ترکیب اور بناوٹ کی تشریح کو ختم کر دیتا ہے حالانکہ اشیاء کا یہ سلسلۂ لطافت عالمِ غیب اور عالمِ ارواح کی سرحد پر جا کر ختم ہوتا ہے اور اس سے آگے غیب کا لطیف جہان شروع ہوتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ لطیف روحانی دنیا اس ہمارے کرۂ زمین کے ہوائی طبقے کے اوپر کہیں دوسرا کرہ ہے۔ بلکہ وہ لطیف رُوحانی عالم ہمارے اس عالمِ آب وگِل سے آمیختہ اور مختلط بلکہ اس کا مخ اور مغز ہے۔ اور اس کے ذرّے ذرّے میں اس طرح جاری اور ساری ہے جس طرح انسان کے جسم میں خون اور خون میں جان ہے یا دودھ میں مکھن اور مکھن میں گھی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بے چوں اور بے کیف اتصال ہے۔ خواب میں انسان اپنے اردگرد ایک لطیف رُوحانی دنیا بنا لیتا ہے۔ جسے ہم رُوحانی دنیا کا ایک خام نا تمام ماڈل اور بطور مُشتے نمونہ از خروارے کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح جسم کے ساتھ رُوح کا اور مادی دنیا کے ساتھ باطنی روحانی دنیا کا ایک بے کیف غیبی اتصال اور تعلق ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ خالقِ مخلوقات کا اپنی تمام مخلوق کے ساتھ ہر طرح پر یعنی جزی وکلی، خارجی وداخلی، خلقی وامری اور ظاہری وباطنی طور پر ایک لطیف، بے کیف غیب الغیب تعلق اور تصرف ہے اور وہ اس کے ذاتی، صفاتی، اسمائی اور افعالی تجلیات کے آثار اور انوار ہیں جو کائنات کے ظہور وبواطن میں جلوہ گر ہیں جن پر تمام

کائنات اور مخلوقات کے وجود کا سارا دارومدار اور کلی نظام و قیام ہے۔

اوّل و آخر توئی چیست[1] حدوث و قِدم　　ظاہر و باطن توئی چیست وجود و عدم

اوّل بے اِنتقال آخر بے اِرتحال　　ظاہر بے چند و چوں باطن بے کیف و کم

افسوس کہ نفسانی لوگوں کو عالمِ غیب کی لطیف رُوحانی دنیا کا ادراک کرانا اور اللہ تعالیٰ کی غیر مخلوق کی بے مثل و بے مثال اور بے چون و بے چگوں ذات کا ادراک کرانا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے کہ کسی مادر زاد اندھے آدمی کو دنیا کی اشیا کے رنگوں اور شکل و شباہت یا آفتابِ عالم تاب کے وجود کا علم اور احساس کرایا جائے۔ ساتھ ہی فنِ تحریر انسانی دل و دماغ کے حقیقی خیالات اور خصوصاً باطنی دنیا کے بے کیف اور بے این اصلی حالات اور صحیح کیفیات کے ادا کرنے کا ازبس ناقص آلہ اور نامکمل مظہر ہے۔ اور نیز حروف والفاظ کا دائرہ اس قدر محدود اور تنگ ہے کہ ہمارے پاس اس کے سمجھانے کے لیے سوائے مثالوں اور استعاروں کے کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ تاہم جن لوگوں میں اللہ تعالیٰ نے تخمِ نورِ ایمان روزِ اوّل سے بطور ودیعت رکھ دیا ہے اور جن میں روحانی قابلیت اور روحانی استعداد موجود ہے اور انہوں نے اپنی بدعملیوں، نافرمانیوں اور بے اعتدالیوں سے اُسے ابھی تک ضائع نہیں کیا ان کے لیے ہمارے اشارے اور استعارے ضرور مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ لیکن ازلی شقیوں اور ابدی کور چشموں کا کوئی علاج ہی نہیں۔ ان کے لیے اگر تمام پردے اور حجاب ہٹا دیے جائیں اور حشر نشر قائم کر کے دکھایا جائے تو بھی وہ ماننے والے نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ

(الانعام ۶ : ۱۱۱)۔ اور ہم انہیں حشر نشر قائم کر کے پہلے دکھا دیں تب بھی کافر ماننے والے ہرگز نہیں مگر یہ کہ جسے اللہ ہدایت کرتا ہے۔ ہم مادی دنیا کے ساتھ روحانی دنیا کا اتصال اور تعلق تو کسی قدر بیان کر آئے ہیں اب ہم انسانی جسم کے ساتھ رُوح کے براہ راست تعلق اور اتصال کا حال بیان کرتے ہیں جس سے روح کی حقیقت پر انشاء اللہ کافی روشنی پڑے گی۔

واضح ہو کہ خارجی دُنیا کے مطابق انسانی وجود کے اندر بھی اشیا کی تینوں صورتیں ٹھوس

---

[1] اول اور آخر تو ہی ہے ماضی اور حال کی کچھ حقیقت نہیں۔ ظاہر اور باطن بھی تو ہے اور وجود و عدم کی کوئی حقیقت نہیں۔ تیرے اول و آخر کا انتقال اور ارتحال ممکن نہیں۔ تیرا ظاہر اور باطن چیگونگی اور کیف و کم سے منزہ ہے۔

مائع اور گیس موجود ہیں۔ یعنی ہڈی، گوشت اور چمڑا وغیرہ ٹھوس ہیں۔ خون اور پانی مائع اور سانس کی ہوا جو اندر پھیلی ہوئی ہے وہ گیس ہے۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ دل اور پھیپھڑے میں سانس کی ہوا کا خون کے دوران میں بڑا دخل ہے اور اسی ہوا یعنی ریح کے جھونکے پر زندگی کا تمام انحصار اور انسانی زیست کا دارومدار ہے۔ یہی وہ تارِ تنفس ہے جس سے انسانی رُوح کی برقی رو اپنے پاور ہاؤس سے نکل کر انسانی دل و دماغ کے بلبوں تک منتہی ہو کر تمام انسانی وجود کی مشین کو گرم، روشن اور چالو کیے ہوئے ہے۔ سائنس دان، کیمسٹ، اطبا اور ڈاکٹر اس پوشیدہ روحانی برقی رو کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ یہ لوگ خون یا اس کے لطیف بخار کو رُوح کہتے ہیں۔ حالانکہ روح اگر خون یا ہوا یا حرارت ہوتی تو موت واقع ہوتے ہی انسان کے وجود میں پھر ہوا یا مصنوعی حرارت داخل کرنے سے انسان دوبارہ زندہ ہو جاتا یا اگر روح محض عنصری وجود کا بخار ہوتا تو بعض انسانی اعضاء کے کٹ جانے سے روح ضرور کسی قدر ناقص اور کم ہو جاتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ روح عالمِ امر کی ایک الگ لطیف اور غیبی چیز ہے۔ وہ عالمِ امر کے نور کی ایک برقی رَو ہے جو اس معدنِ انوار کے پاور ہاؤس سے اس تارِ تنفس کے ذریعے انسانی وجود میں آتی جاتی ہے اور اسے زندہ اور تابندہ رکھتی ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۵﴾ (بنیٓ اسرآئیل ۱۷: ۸۵) ترجمہ: ”کہہ دے اے میرے نبیؐ! کہ روح میرے رب کے عالمِ امر کی چیز ہے اور اسے سمجھنے کے لیے تمہارا علم بہت تھوڑا ہے۔“ عالمِ خلق، عالمِ شہادت یا آفاق اس مادی ٹھوس جہان کو کہتے ہیں۔ اور عالمِ امر یا عالمِ غیب، یا عالمِ انفس لطیف باطنی اور روحانی دنیا کا نام ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (الاعراف ۷: ۵۴) ترجمہ: ”خبردار عالمِ خلق اور عالمِ امر ہر دو اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔“ اور وہ ان ہر دو کثیف اور لطیف جہانوں اور عالموں کا رب اور مالک ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ اسی روح کی نسبت فرماتے ہیں: وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر ۱۵: ۲۹)۔ یعنی ہم نے آدم علیہ السلام کے اندر اپنی روح پھونک دی۔ غرض روح کے بدنِ عنصری میں پھونکنے میں جو رمز اور اشارہ ہے وہ اس بات پر صاف صاف دلالت کرتا ہے کہ روح جس نفخ اور پھونک کے ذریعے جسمِ انسانی میں ڈالی گئی ہے وہ یہی تارِ نفس اور سانس کی ہوا ہے جو انسان کے اندر دم میں آتی

اور جاتی ہے۔ عربی میں ہوا کو ریح کہتے ہیں اور یہ لفظ روح اسی عربی لفظ ریح سے ماخوذ اور نکلا ہوا ہے۔ اور نَفَس بفتحہ فاء پھونک اور ہوا کو کہتے ہیں اور لفظ نَفْس بسکونِ فاء جان اور روح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ سو معلوم ہوا کہ روح اور ریح اور نَفَس اور نَفْس ہر دو مترادف اور ہم معنٰی الفاظ ہیں اور ہر دو ایک چیز ہیں۔ یہ اس لیے کہ روح کو ہوا کے ساتھ ایک قریب کا رشتہ اور باطنی تعلق ہے اور روح ہوا کی طرح ایک لطیف اور غیر مرئی چیز ہے۔ لہٰذا روح کے لطیف جوہر کو صانعِ حقیقی نے ہوا کے لطیف تاگے سے جسمِ انسانی میں باندھ رکھا ہے۔ یا یوں کہو کہ اس حکیم اور علیم خالق نے روح کے لطیف اور لامکانی پرندے کو ہوا کے لطیف تاگے کے ذریعے انسانی جسم کے کثیف پنجر اور عنصری پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔ روح چونکہ عالمِ امر کی ایک نہایت لطیف چیز ہے۔ مادے کے کثیف جہاں میں اس کا استقرار اور استحکام بجز تعلقِ لطیف چونکہ ناممکن تھا اس واسطے اس قادرِ مطلق نے اس مادی عالمِ عناصر میں سب سے لطیف ترین چیز گیس یعنی ہوا کا رابطہ اور رشتہ تجویز فرمایا اور یہی لطیف ڈوری اس شہبازِ لامکانی کے پاؤں میں ڈال کر اسے بدنِ انسانی کے پنجرے میں قید کر دیا۔ سو ریح اور ہوا کے ذریعے بدنِ انسانی میں روح مقید ہے اور اسی سانس کی ہوا اور تارِ تنفس کے ذریعے ہی عالمِ امر کے پاور ہاؤس سے اسے نور کی برقی رو یعنی روحانی غذا اور قوت وقُوت پہنچتی رہتی ہے۔

دنیا کی ہر شے کیا جماد کیا نبات اور کیا حیوان سب میں ایک قسم کی روح موجود ہے اور ہر شے سانس لیتی ہے۔ لیکن روحِ جمادی، روحِ نباتی، روحِ حیوانی، روحِ انسانی اور روحِ ملکوتی وغیرہ میں بسبب اختلافِ مدارج ومراتب فرق ہے۔ اور ہر روح اسی ہوائی تعلق کے ذریعے دنیا میں آتی ہے اور ماہرین حاضرات سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ریح یعنی ہوا کے تعلق کے بغیر ارواح کی لطیف غیبی مخلوق یعنی جن، ملائکہ، اور ارواح کی اس دنیا میں آمد اور حاضرات ناممکن ہے۔ اور جب کبھی اس مادی دنیا میں عالمِ غیب کی لطیف مخلوق بلائی جاتی ہے اور ان کی حاضرات شروع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ بند مکانوں میں ہوا کے جھونکے آتے ہیں اور ہوا چلنے لگتی ہے۔ غرض اس لطیف روحانی مخلوق کو دنیا کے کثیف جہان میں ہوا کی لطیف رفاقت اور معیت میں بھیجا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم اس پر شاہد ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے علمِ حاضرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ (الانبیآء ۲۱: ۸۱۔ ۸۲) ترجمہ: ''اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہم نے تند ہوا کو مسخر کر دیا تھا اور ہوا اس کے امر سے اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکت ڈال رکھی تھی جاری ہوتی اور اس کے ساتھ جنّات اور شیاطین حاضر ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے غوطے لگایا کرتے تھے اور اس کے علاوہ طرح طرح کے کام اور خدمات انجام دیتے تھے۔ اور اس عمل کے وقت ہم ہر طرح سے ان کے نگہبان اور محافظ رہتے تھے۔'' دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۝ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ (صٓ ۳۸: ۳۶۔ ۳۸)۔ ''اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا۔ اور جہاں کہیں بھی وہ چاہتا تھا اس کے امر سے وہ چل پڑتی تھی۔ اور جن شیاطین اس کے ساتھ حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ اور ان میں ہر ایک مکان بنانے والے اور غوطے لگانے والے شامل تھے اور باقی تسخیر کی زنجیر میں جکڑے رہتے تھے۔''

جنگِ احزاب میں حضرت رسالت مآب صلعم اور آپ ﷺ کے اصحابِ کبار کی امداد کے لیے آسمان سے ملائکہ کے نزول کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ (الاحزاب ۳۳: ۹)۔ ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ تم پر جنگِ احزاب میں کفار کے لشکر چڑھ آئے تھے۔ پھر ہم نے ان پر ہوا بھیج دی اور ساتھ ہی ایسا لشکر بھیجا جسے تم نہیں دیکھ سکتے تھے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے مروی ہے کہ جنگِ بدر میں ایسی سخت ہوا چلی کہ اس سے پہلے ہم نے کبھی ایسی تند اور تیز ہوا نہیں دیکھی تھی۔ اس طرح تین دفعہ تند اور تیز ہوا چلی۔ سو پہلی ہوا میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کو ہمراہ لے کر ہماری امداد کے لیے آئے اور دوسری بار حضرت میکائیل علیہ السلام اسی قدر ملائکہ کے ہمراہ اور تیسری دفعہ حضرت اِسرافیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ ہماری امداد کو آئے۔ غرض دنیا میں

پیغمبروں، اولیا اور اللہ تعالیٰ کے دیگر مقبول بندوں کی امداد اور کفار نابکار کے استیصال اور ہلاکت کے لیے جب کبھی اس قسم کی غیبی لطیف امداد اور لشکر کی ضرورت پڑی ہے وہ تند ہوا یا مہیب بادل کی لطیف رفاقت میں دنیا کے اندر بھیجی گئی ہے۔ سو ثابت ہوا کہ روحانی مخلوق کو اس مادی دنیا میں اُتارنے اور بھیجنے کے لیے ہوا کی لطیف سواری لابد اور اشد ضروری ہے۔ خود اپنا دنیا کے اندر نزول اللہ تعالیٰ لطیف بادل کی معیت میں فرماتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن يَأْتِيَهُمُ ٱللَّهُ فِى ظُلَلٍ مِّنَ ٱلْغَمَامِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ ٱلْأَمْرُ ۚ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ ٥(البقرة ۲: ۲۱۰)۔ ترجمہ: ”کیا وہ اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آئے ان کے پاس بادل کے سائے میں اور فرشتے اور امر پورا ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف تمام امور رجوع کرنے والے ہیں۔“

عورت جب بالغ ہو جاتی ہے اور اس کی زمینِ جسم تیار ہو جاتی ہے تو وہ مرد سے انسانی تخم حاصل کرنے کا تقاضا کرتی ہے اور فطرتاً بے تاب رہتی ہے۔ آخر جب اس کی زمینِ رحم میں انسانی نطفے کا تخم پڑ جاتا ہے تو وہ اندر ہی اندر نشو و نما پانے لگتا ہے اور بطنِ مادر کے اندر رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ تیار ہوتا رہتا ہے۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اسے مادی غذا ماں کے ذریعے اس کی غذا سے بذریعہ خونِ خام پہنچتی رہتی ہے اور اسی مادی غذا سے اس کے عنصری جسم کی پرورش اندر ہی اندر ہوتی رہتی ہے۔ اس وقت سے اس میں جمادی روح پڑ چکی ہوتی ہے جو اس گوشت کے لوتھڑے اور مضغہ کو منجمد رکھتی ہے۔ بعدہٗ اس میں نباتی روح پڑ کر اسے نشو و نما دیتی ہے اور بڑھاتی ہے۔ مگر جوں ہی اس میں حیوانی روح تقریباً چھ ماہ کے بعد پڑ جاتی ہے وہ پیٹ میں ہلتا جلتا اور حرکت کرتا ہے اور اسے غذا ناف کی ڈنڈی کے ذریعے پہنچتی رہتی ہے۔ لیکن جوں ہی بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے اور عالمِ امر کی انسانی روح اس میں ڈالی جاتی ہے تو وہ ہوا کے ذریعے سانس لینے لگ جاتا ہے اور تارِ تنفس عالمِ امر سے ایک غیبی ڈنڈی کی شکل میں اس کے ساتھ لاحق ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح ناک کے دونوں نتھنے اس کے لیے عالمِ امر کے ہر دو مثبت اور منفی یا جمالی اور جلالی برقی رو کے تارِ تنفس کے واسطے گذرگاہ بن جاتے ہیں اور نیز یہ تارِ تنفس روحانی غذا اور نیز خیالات اور قلبی واردات کا بھی رابطہ اور واسطہ بن جاتا ہے۔ جس کا سلسلہ عالمِ امر کے روحانی اور

باطنی پاور ہاؤس سے ملا ہوا ہوتا ہے اور اس سے انسانی قلب اور قالب کی ساری مشینری روشن اور چالو ہے۔ انسانی بدن کی ساخت پر غور کرو اس میں دو نتھنے، دو کان، دو آنکھیں، دو ہونٹ، دو جبڑے اور دو ہاتھ حواسِ خمسہ کے دو قسم کی بجلی کے تاروں کو انسانی دل اور دماغ تک پہنچنے کی گذرگاہ اور واسطہ بنے ہوئے ہیں۔ اور انسانی جسم ایک برقی مشین ہے جس میں مختلف برقی تاروں کے ذریعے مختلف قسم کی بجلیاں آتی جاتی ہیں اور یہ مشین کسی خاص غرض کے لیے چالو ہے۔ غرض اس بدنی مشینری یعنی نفس کی زندگی کا مقصد اور نصب العین اپنے اور اپنے متعلقین کے عنصری وجود کے لیے غذا مہیا کرنا، ان کی حفاظت کرنا اور ان کی ظاہری و دنیوی ترقی کے اسباب سوچ کر ان پر عمل کرنا اور مادی رزق کے حصول کے علوم اور فنون حاصل کرنا ہے۔ ایسے نفس کے انسان دنیا میں عام طور پر بکثرت ہیں۔ لیکن بعض خاص سعادت مند مردانِ خدا ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کے اندر روزِ ازل سے ملکوتی استعداد اور قابلیت ودیعت کر دی گئی ہوتی ہے۔ ان کی زمینِ قلب میں ملکوتی تخم پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ سرسبز ہونے اور پھلنے پھولنے اور آبِ تربیت اور نشو و نما حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ وہ ملکوتی نطفہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب اور بے قرار ہو کر آخر کسی مردِ کامل سے جا ملتا ہے اور اس سے رحمِ قلب میں نوری ملکوتی نطفہ حاصل کر لیتا ہے اور جب اس میں وہ نوری نطفہ پڑ جاتا ہے تو باطن میں شیخ الامر و شیخ العلم اس کے دو روحانی ماں باپ بن جاتے ہیں جو اس کی باطنی تربیت اور روحانی پرورش پر مامور اور متعین ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ملکوتی جنین اپنی ملکوتی ماں کے ساتھ ایک باطنی نوری ناف کے رشتے سے وابستہ ہوتا ہے جسے رابطۂ شیخ کہتے ہیں۔ اسی نوری ناف سے اسے نوری ملکوتی غذا پہنچتی رہتی ہے اور اس کی پرورش ہوتی رہتی ہے۔ یہ نوری معنوی طفل جب بطنِ باطن سے باہر آتا ہے تو روحانی ملکوتی دنیا کے لازوال عالم میں قدم رکھتا ہے۔ یہ نوری معنوی طفل مثل شہبازِ لامکانی عالمِ کون و مکان میں نہیں سماتا۔ وہ اپنے لطیف باطنی پروں کی ایک ادنیٰ جنبش سے اقطار السمٰوات والارض سے پار ہو جاتا ہے۔ تمام مادی دنیا اس کے لیے بمنزلۂ رحمِ مادر ہوتی ہے اور عالمِ آب و گل اُس کے لیے آشیانہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مقبول برگزیدہ بندوں کی یہ ملکوتی شخصیتیں ملائکہ اور فرشتوں کے اخلاقِ کریمانہ سے متخلق ہوتی ہیں۔ جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے

جب عفت اور پاک دامنی کے امتحان میں شہوانی اور بشری نفسانی جذبات پر غالب آ کر اور زنا کے فعلِ شنیع سے کنارہ کر کے ملکوتی صفات کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے زنانِ مصر کی زبانی قرآنِ کریم میں آپ کی یوں توصیف اور تعریف فرمائی: وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۖ إِنْ هٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ "o(یوسف ۱۲ : ۳۱)۔ یعنی "خدا کی پناہ یہ انسان اور بشر نہیں ہے بلکہ یہ تو نرا پاکیزہ فرشتہ ہے۔" اللہ تعالیٰ کی عبادت، اطاعت اور ذکر فکر ایسے پاک ملکی صفات انسانوں کی قُوّت اَور قُوت بن جاتی ہیں۔ بعض خاص الخاص اخص اِنسان اس سے بھی آگے ترقی کرتے ہیں اور فرشتوں سے بھی باطنی مراتب میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے کامل عارفوں کو اپنے انوار سے منور کر دیتا ہے اور ان میں اپنی خاص روح پھونک دیتا ہے۔ ایسے برگزیدہ وجودِ مسعود والے سالک روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ برحق بن جاتے ہیں اور نائبِ رسول صلعم اور اصلی حقیقی معنی میں آدم کی اولاد آدمی کہلاتے ہیں۔ فرشتے ان کی تعظیم کو جھکتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ قولہٗ تعالیٰ: وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِيْنَ o(الحجر ۱۵ : ۲۹) ترجمہ: "اور جب ہم اس میں اپنی روح پھونک دیں تو اے ملائکہ تم اس کے لیے سجدے میں پڑ جاؤ۔" مقامِ غور ہے کہ انسان کس طرح بتدریج باطنی حالات اور معنوی انتقالات سے گذرتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ یعنی جماد سے نبات، نبات سے حیوان، حیوان سے انسان اور فرشتۂ رحمان کے مقام اور منزل میں پہنچ کر اس سے بھی آگے عروج کر جاتا ہے۔ اسی روحانی ترقی اور باطنی انتقال کو مولانا روم صاحبؒ اپنی مثنوی میں یوں بیان فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| جمادی مُردم و نامی[1] شُدم | وزنما مُردم بحیواں سرزدم |
| مُردم از حیوانی و مردم شُدم | پس چہ ترسم کہ زمُردن کم شُدم |
| جملۂ دیگر بمیرم از بشر | تا بر آرم از ملائک بال و پر |

[1] میں جمادات سے فانی ہوا تو مجھ میں نشو و نما پیدا ہوئی۔ یہ نشو و نما زائل ہوئی تو میں عالمِ حیوانات میں آ گیا۔ پھر حیوانی اجزاء فانی ہوئے تو میں انسان بن گیا۔ پھر مجھے اس بات کا خوف نہیں ہے کہ اتنی بار مرنے سے مجھ میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ پھر تمام بشری قوتوں سے میں فانی ہو جاؤں گا تاکہ مجھ پر ملکوتی پر و بال نمودار ہو سکیں۔ پھر دوسری بار تمام ملکوتی صفات جب فانی ہو جائیں گی تو پھر میں وہ مقام حاصل کر پاؤں گا جو قیاس و گمان میں نہیں آ سکتا۔

بارِ دیگر از ملک قرباں شوم　　　آنچہ اندر وہم ناید آں شوم

(رومی)

مذکورہ بالا ترقی نیک سعید، پاک اور مقدس روحوں کو حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس بد بخت ازلی شقی ناپاک روحوں کو ترقیٔ معکوس حاصل ہوتی ہے اور وہ انسان سے حیوان اور حیوان سے شیطان بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ پس انسان میں ہر دو نیک اور بری استعداد موجود ہے اور بہت بھاری ابتلاء اور امتحان ڈال دیا گیا ہے۔ بہت خوش قسمت ہے وہ شخص جو اس بھاری امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

گہ ناز کند فرشتہ[1] بر پاکیٔ ما　　　گہ دیو کند عار ز ناپاکیٔ ما

ایماں چو سلامت بہ لبِ گور بریم　　　احسنت بریں چستی و چالاکیٔ ما

(ابو سعید ابوالخیر)

ہم یہاں اپنے مذکورہ بالا بیان اور انسانی خلقت کے مختلف درجات کی تائید میں یورپ کے ماہرین روحانیات یعنی سپر چولسٹس (SPIRITUALISTS) کے کچھ مشاہدات اور تجربات بیان کرتے ہیں جس سے زمانہ حال کے مغرب زدہ سائنس پروردہ دماغوں کو ایک گونہ تسلی اور تشفی ہو جائے کہ جو کچھ یہاں ہم بیان کر رہے ہیں وہ ہر دو عقل و نقل، درایت و روایت، علمِ سلف اور علمِ خلف کے مطابق صحیح اور درست ہے۔ حال ہی میں یورپ کے سپر چولسٹوں نے برقِ حیات کی ایک نئی لہر دریافت کی ہے جسے ان کی اصطلاح میں اورا (AURA) کہتے ہیں اور وہ ایک باطنی برقِ حیات کا گول دائرہ ہوتا ہے جو ہر چیز کے اردگرد لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے سائنسدان اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ چنانچہ سپر چولزم کے شعبۂ کلیر وائینس (CLAIRVOYANCE) یعنی علمِ جدید اور روحانیت کے شعبۂ روشن ضمیری میں اورا (AURA) یعنی حلقۂ برقِ حیات کو صاف اور ظاہر طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ ہر چیز جماد، نبات، حیوان اور انسان کا اور مختلف قسم کا اور علیحدہ رنگ کا بتاتے ہیں۔ اس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ تجربات اور مشاہدات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے

---

[1] کبھی فرشتہ ہماری پاکیزگی پر ناز کرتا ہے اور کبھی شیطان کو بھی ہماری ناپاکی سے عار محسوس ہوتی ہے۔ جب ہم سلامتی ایمان کے ساتھ قبر تک پہنچ جائیں گے تو پھر ہماری چستی اور چالاکی قابلِ تحسین و آفرین ہو گی۔

کہ نیند اور خواب کے وقت انسان کے وجود سے انسانی اور حیوانی اوراتو خارج ہو جاتا ہے لیکن جمادی اور نباتی اورا اس میں موجود رہتا ہے۔ اور موت کے وقت انسان سے انسانی، حیوانی اور نباتی اورا پے در پے خارج ہو جاتا ہے۔ صرف معدنی یا جمادی اورا اس میں باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ مٹی کا اورا ہے جو اپنے ہم جنس مٹی میں مل جاتا ہے۔ سو معلوم ہوا کہ انسان میں جمادی، نباتی، حیوانی اور انسانی برقِ حیات موجود ہے اور انسان سب کا جامع ہے۔ جماد ایک قسم کا، نبات دو قسم کا، حیوان تین قسم کا اور انسان چاروں قسم کے اورا نکالتا ہے اور اسی کے مطابق سانس لیتا ہے۔

انسان کے جسم میں دو سلسلے ہر وقت جاری رہتے ہیں۔ ایک تو ظاہری خارجی سانس اور تنفس کا سلسلہ ہے جو ہر دم میں جاری ہے۔ دوم باطنی داخلی خیالات کا سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ بھی کسی وقت انسان سے منقطع نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ ہر دو سانس اور خیالات کے سلسلے ہر وقت انسان کے جسم اور جان کے ساتھ لاحق اور وابستہ ہیں اور ان ہر دو کا آپس میں بھی ایک مخفی اور پوشیدہ تعلق ہے۔ خیالات کا سانس میں بڑا دخل ہے۔ بلکہ سانس اور تنفس خیالات کا روزن اور دروازہ ہے۔ اس لیے بزرگانِ دین اور سلف صالحین نے ذکر کے لیے پاس انفاس اور حبسِ دم کے طریقے رائج کیے ہیں۔ اس کی فلاسفی اور حکمت یہ ہے کہ دل کی یہ ایک مخصوص صفت ہے کہ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات سوچتا یا معنوی طور پر بولتا یا دوسرے لفظوں میں کسی نہ کسی چیز کا ذکر کرتا ہے۔ یہ ذکر کی صفت، اس کی خلقت اور فطرت میں اس واسطے دائمی طور پر موجود اور جاری ہے کہ انسان کی خلقت اور فطرت کی بنیاد ہی اس معدنِ اذکار یعنی اسم اللہ ذات پروردگار سے پڑی ہے اور انسان کا ہر وقت کوئی نہ کوئی بات سوچتے رہنا یا کسی نہ کسی چیز کا ذکر کرتے رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی باطنی حقیقت، اصلی فطرت اور حقیقی جبلت و سرشت ہی ذکر اِسم اللہ ذات سے پڑی ہے جو کہ تمام اذکار کا اصل معدن ہے اور تمام اشیاء کے اسماء مع ان کے اذکار کے اسمِ اللہ ذات کے فروعات اور ظلال ہیں اور اسمِ اللہ ذات سب اشیائے کائنات کی اصل ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ط (الجاثیہ ۴۵: ۱۳)۔ ترجمہ: ”اور ہم نے مسخر کیا تمہارے واسطے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی (کے نام) سے۔“ کیونکہ سب

کا ظہور اسی کے نام سے ہے۔ اس کی تسخیر بھی اسی کے نام سے ہے۔ اسی آیت کی تفسیر کی بابت حضرت ابنِ عباسؓ سے جب پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا: فِیْ کُلِّ شَیْءٍ اِسْمٌ'' مِنْ اَسْمَآئِہٖ تَعَالٰی وَ اِسْمُ کُلِّ شَیْءٍ مِنْ اِسْمِہٖ۔ یعنی ہر چیز کے اندر اللہ تعالیٰ کے اسما میں سے ایک اسم ہے اور ہر چیز کے اسم کا ظہور اللہ تعالیٰ کے اسمِ ذات سے ہے۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ روح جب آدم علیہ السلام کے وجود میں داخل ہوئی اور اُس نے مقامِ دماغ استخوان الابیض میں قرار پکڑا تو اس نے کہا یا اَللہ۔ جب نورِ نیرّ اسم اللہ ذات سے دماغِ آدم روشن اور منور ہوا اور اُس نے اُس آفتابِ عالم تاب کی طرف دیکھا تو اسے چھینک آئی۔ تب اس نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اور وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (الحجر ۱۵ : ۲۹) سے ثابت ہے کہ روح آدم علیہ السلام کے وجود میں ہوا کہ ساتھ پھونک دی گئی ہے۔ سو مذکورہ بالا بیانات سے روح کا ذکر اسمِ اللہ ذات اور نیز ذکر کا تمام اشیائے کائنات یعنی خیالات، سانس اور تنفس کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق، تام جنسیت اور محکم رابطہ و رشتہ ہے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں ایک ہی چیز ہیں۔ سو سانس اور تنفس کا ذکر اللہ تعالیٰ اور خیالات و تفکرات کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے۔ اسی تعلق کے انضباط اور استحکام کے لیے ذکر اللہ کے ساتھ پاس انفاس اور حبسِ دم کے طریقے رائج کیے گئے ہیں۔ سو انسانی روح کی بنیاد اور سرشت اسمِ اللہ اور توحید سے پڑی ہے۔ ذکر اللہ سب کی اصل ہے اور باقی تمام اشیائے کائنات اور عالمِ کثرت کا ذکر اس کی فروعات اور ظلال ہیں۔ جس وقت انسان اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے یعنی ذکر اسم اللہ کرتا ہے تو گویا وہ اپنی اصلی صفت اور ازلی فطرت پر ہوتا ہے اور اپنی اصل کی طرف متوجہ اور راجع ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ غیر اللہ کو یاد کرتا ہے تو یہ ذکر چونکہ عارضی ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے ماسوائے جُملہ اشیائے کائنات کا ذکر اور ان کے خیالات انسانی قلب اور دل کی اصلی صفت کے مخالف اور متعارض ہوتے ہیں۔ اور دل کی اصلی صفت اور حقیقی جبلت کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اور نیرّ اسم اللہ ذات کے لیے غیر ماسویٰ کا ذکر بادل اور ابر کی طرح حجاب بن جاتا ہے۔ نفسِ بہیمی اپنی مادی عنصری اشیاء خورد نوش اور دیگر مادی لوازمات اور ضروریاتِ زندگی کی طلب میں رہ کر ہر وقت ان مادی اور غیر ماسویٰ اللہ اشیا کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اور حواسِ خمسہ کے ذریعے اپنی ضروریات کی تمام اشیا کی یاد اور اسی

قسم کی نفسانی خواہشات اور دنیوی خطرات کو دل تک پہنچاتا رہتا ہے۔ سو ان غیر اشیا کے ذکر اور خیالات کی دل کی اصلی صفت اور حقیقی حیات ذکر اسم اللہ ذات کے ساتھ اندر ہی اندر ٹدھ بھیڑ ہو جاتی ہے تو دل کی حقیقی فطرتی صفت ذکر اللہ کو آلودہ اور مکدّر کر دیتے ہیں اور دل میں ذکر اللہ کا اثر نہیں ہونے دیتے۔ سو طریقۂ حبسِ دم اور پاسِ انفاس کی فلاسفی یہی ہے کہ ذاکر اور سالک دل کے دروازے یعنی سانس اور تنفس پر پاسبان اور چوکیدار کی طرح بیٹھ جائے اور اس کے اندر کسی غیر ماسوئ اللہ نامحرم یعنی غیر خیالات کو اندر گذرنے نہ دے اور اسے صرف گھر کے اصلی مالک اللہ تعالیٰ اور اس کے ذکر کی گذرگاہ بنائے رکھے۔ جیسا کہ کسی سالک نے کہا ہے۔

مرا در دِل[1] بغیر از دوست چیزے در نمی گنجد
بخلوت خانۂ سلطاں کسے دیگر نمے گنجد

درونِ قصرِ دل دارم یکے شاہے کہ گرگاہے
زدِل بیروں زند خیمہ بہ بحر و بر نمے گنجد

تنت گر ہمچو موئے شد حجاب جاں بود وے را
میانِ عاشق و معشوق موئے درنمے گنجد

حسابِ صد ہزار عاقل بحشر بگذرد یک دم!
حسابِ یک دمِ عاشق بصد محشر نمے گنجد

(خواجہ غریب نوازؒ)

ذکر اسم اللہ ذات اور ماسوئ خیالات کی مثال دِل کے لیے اس طرح پر ہے جیسے کسی شہر کے اندر کوئی تالاب یا حوض ہے جس کے اندر میٹھا اور پاک پانی خود بخود زمین میں سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔ مگر اس میں بیرونی راستوں سے شہر کی غلیظ اور گندہ نالیوں کا پانی بہہ کر آپڑتا ہے تو یہ لازمی امر ہے کہ بیرونی گندے مردار پانی کے آپڑنے سے اس تالاب اور حوض کا اپنا اصلی میٹھا پانی پلید، مکدر، غلیظ، مردار اور بدبودار ہو جائے گا۔ اگر ان غلیظ گندہ نالیوں کے مردار پانی کو کچھ عرصے کے لیے اسی طرح تالاب میں پڑنے دیا جائے اور اسے بند نہ کیا جائے تو ضرور اس کی غلیظ تلچھٹ اور مٹی تالاب کی تہہ میں جم کر اس کے اصلی پھوٹنے

[1] میرے دل میں محبوب کے سوا کوئی چیز سما نہیں سکتی۔ بادشاہ کی خلوت گاہِ خاص میں غیر کی مجال نہیں۔ میرے دل کے محل میں ایک ایسا شہنشاہ جلوہ گر ہے اگر وہ دل کے باہر خیمہ لگانا چاہے تو بحر و بر میں بھی نہیں سماتا۔ اگر تیرا جسم بال کے برابر بھی ہو جائے تو وہ بھی روح کے لیے حجاب ثابت ہوگا۔ عاشق اور معشوق کے درمیان ایک بال کے برابر بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہزار ہا عقلمندوں کا حساب کتاب محشر میں پل بھر کے اندر ممکن ہے لیکن عاشق کے ایک لمحے کا حساب سینکڑوں محشروں میں نہیں ہوسکتا۔

والے چشموں اور راستوں کو بند اور مسدود کر دے گی اور بجائے پاک میٹھے تالاب کے وہ حوض ایک گندہ اور مردار چھپڑ بن جائے گا۔ اس کے پینے والے بیمار اور ہلاک ہو جائیں گے۔ انسانی دل کا بعینہٖ یہی حال ہے۔ اسمِ اللہ اور ذکر اللہ کا نور دل کے اندر سے اصلی پھوٹنے والے پاک میٹھے آبِ حیات کی طرح ہے اور غیر ماسویٰ کی یاد اور نفسانی خیالات ظلمت اور تاریکی کا سیاہ مادہ ہے جو حواسِ خمسہ کی نالیوں سے دل کے پاک چشمۂ آبِ حیات میں گندہ اور مردار پانی کی طرح آ پڑتا ہے اور دل کے آبِ حیات ذکر اللہ کو گندہ، مکدّر اور بعدۂ بند اور مسدود کر دیتا ہے۔ سو پاس انفاس اور حبسِ دم کے ذریعے دل کے روزن اور منفذ کو ان کے ماسویٰ خیالات کی گندہ نالیوں سے جب محفوظ رکھا جائے اور اسے اپنی صفت اور جبلت ذکر اللہ پر چھوڑ دیا جائے تو ضرور ایسے دل میں نور ذکر اللہ کے باطنی اور غیبی چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور ایسے ذاکر پر اسرارِ حق کھل جاتے ہیں۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
گر نہ بینی سرِ حق بر ما بخند (رومیؒ)

ترجمہ: اپنی آنکھوں، کانوں اور لبوں کو ماسویٰ سے روک لے۔ پھر اگر تجھے حق کا بھید معلوم نہ ہو تو ہمارا مذاق اڑا۔

باطنی ہمت، روحانی توفیق اور دل کی قوت اور طاقت بڑھانے کے لیے یک سوئی و یک جہتی یعنی اپنے تصور اور تفکر کو یکجا، متحد اور مجتمع کرنا نہایت ضروری اور لازمی امر ہے۔ جس کو انگریزی میں کنسنٹریشن (CONCENTRATION) کہتے ہیں۔ اسی پر تمام روحانی ترقی کا دارومدار ہے اور اسی پر کل سلوکِ باطنی کا انحصار ہے۔ نیز ایک کلیہ قاعدے اور مسلمہ اصول کے مطابق خیالات اور تفکرات کا اتحاد اور اجتماع دل کی طاقت اور باطنی قوت کو بڑھانے کا موجب ہے اور خیالات کا انتشار اور اکتشار دل کی کمزوری کا باعث ہے۔ جیسا کہ لینز یعنی آتشی شیشہ میں سے جب کبھی آفتاب کی شعاعیں ایک نقطہ پر مجتمع ہو کر گذرنے لگتی ہیں تو اس میں اس قدر حدّت اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے کپڑا وغیرہ جلنے لگتا ہے اور جب وہی شعاعیں منتشر کر کے اور پھیلا کر گذاری جائیں تو ان میں وہ حدت اور حرارت نہیں رہتی۔ پس توحید اور وحدت کی طرف دل لگانا اس کی طاقت اور قوت کو گویا

بڑھاتا ہے اور عالمِ کثرت میں ڈالنا اس کی طاقت اور قوت کو ضائع کرنا اور کھونا ہے۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (یوسف ۱۲ : ۳۹)۔ ''آیا مختلف اور متفرق معبود قائم کرنا زیادہ بہتر ہے یا ایک اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد قہار کو پوجنا۔'' اسلام اور اسلامی تصوف تمام مذہبی اعمال اور دینی ارکان میں دل کی نیت اور اس کی یکسوئی اور یک جہتی پر زور دیتی ہے اور اسی کی تائید اور تاکید کرتی ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ یعنی عمل کا ردّ، قبول اور نقص و صحت نیت پر منحصر ہے۔ یعنی عمل کے وقت اگر دل کی نیت محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو وہ عمل قابلِ قبول ہے اور اگر کسی عمل کی نیت دنیوی اور نفسانی اغراض کی طرف راجع اور مائل ہے تو وہ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں رد اور مردود ہے۔ اسی لیے آیا ہے لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ۔ یعنی نماز درست اور صحیح نہیں ہوتی جب تک نماز میں دل اللہ کے ساتھ حاضر نہ ہو۔ اسی طرح جملہ اسلامی ارکان میں دل کا اللہ تعالیٰ کی طرف مائل اور راجع ہونا لازمی اور ضروری گردانا گیا ہے تاکہ ہر فعل اور ہر عمل میں دل اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف مائل اور راغب اور اس کے تصور اور تفکر میں محو اور منہمک ہو۔ اور یہی بات دل کی یکسوئی، یک جہتی اور اس کے باطنی حواس تصور، تفکر، توجہ، توہم اور تصرف کو ذکر اللہ اور اسمِ اللہ کے ایک ہی نکتہ اور مرکزِ توحید پر متحد اور مجتمع کرنے کا ذریعہ ہے۔ دل اور قلب کی باطنی قوت اور روحانی طاقت بڑھانے کا باعث بھی یہی چیز ہے اور یہی اسلامی توحید کی غرض و غایت ہے اور یہی مذہبی اور روحانی تصور کا مرکز ہے جسے ریلیجیس کنسنٹریشن (RELIGIOUS CONCENTRATION) کہہ سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندو یوگ والے اور مسمریزم، ہپناٹزم اور سپرچولزم والے اپنا تصور اور توجہ ایک نکتہ مفروضہ اور موہومہ پر جمانے اور باطنی طاقت بڑھانے کی مشق کیا کرتے ہیں۔ اسلامی مذہب اور روحانیت کا مرکزِ تصور اسم اللہ ذات ہے جو کہ مبداء و معادِ تمام کائنات اور مخلوقات ہے اور جس کا تعلق اور کنکشن مسمّٰی کی اس ذات لم یزل و لایزال خالق و قادر بے مثل و بے مثال کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن یوگ اور مسمریزم کے طریقے میں ایک روشن چیز یا ایک تاریک مفروضہ نکتے کے تصور سے صاحبِ تصور اس چیز یا اپنے وجود سے باہر تجاوز نہیں کرسکتا۔ اس ہندو یوگی اور یورپین مسمرسٹ اور سپرچولسٹ کا معاملہ عالمِ ناسوت کے ادنیٰ اور سفلی مقام تک محدود رہ جاتا ہے اور صاحبِ تصور

اسم اللہ ذات کی ترقی کا میدان بہت وسیع، لازوال اور لامحدود ہے۔ مذہب اسلام اور اسلامی تصوف کا سب سے اہم اور ضروری رکن کلمۂ طیّب ہے جس کے پڑھے بغیر نہ انسان مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ اس کے ذکر کی کثرت کے بغیر راہِ سلوک طے ہو سکتی ہے۔ اس کلمۂ طیّب کے ذکر نفی اثبات لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں بھی یہی راز مضمر ہے کہ عالمِ کثرت کے سب باطل معبودوں اور جملہ عارضی مقصودوں اور تمام فانی موجودوں کو دل سے نکال کر ان کی نفی کر دی جائے اور ایک اصلی حقیقی حی قیوم معبودِ برحق کے ذکر اور خیال کو دل میں ثابت اور قائم رکھا جائے۔ یہی اصلِ کار ہے اور اسی پر تمام مذہب و روحانیت کا دارومدار ہے۔

ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ دل کے خیالات کا دم اور سانس کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ عارف سالک کا دل ایک باغ کی طرح ہے۔ سانس اور دم بادِ صبا کی طرح جب اس پر گذرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی خوشبو سے لدا ہوا باہر نکلتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے اسے بہشتی حلّوں میں لپیٹ کر اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس ذاکر عارف آدمی کی طرف سے بطور ایک نہایت قیمتی تحفے کے پیش کرتے ہیں اور وہ دم اس ذاکر عارف کے لیے بطور ایک گوہرِ بے بہا اس کے خزانۂ آخرت میں داخل ہو جاتا ہے۔ جو دم اور سانس عارف ذاکر کا واپس آتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے فیض و فضل اور رحم و لطف سے معمور ہوتا ہے اور یہ دم اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا ایک تحفہ، ذکر کا جواب اور انعام ہوتا ہے۔ جس سے عارف سالک کے دل پر اللہ تعالیٰ کے انوارِ فیض و فضل کی بارش ہوتی ہے اور سالک کا باغِ دل سرسبز اور تازہ ہوتا ہے۔ ایسے کامل مردانِ خدا کا دم اور سانس جب فضائے قلوب میں کسی زندہ اور حساس دل سے ٹکراتا ہے تو اس دل کو بھی اپنی خوشبودار مہک سے معطر اور معنبر کر دیتا ہے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے۔

ستم است اگر ہوست[1] کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ   تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بچمن درآ

پے نافہ ہائے رمیدہ بو مپسند زحمتِ جستجو   بخیال از سرِ زلف اُو گرہے کشا بختن درآ

(بیدلؔ کانپوری)

---

[1] یہ ستم ہے کہ تجھے ہوس سرو و سمن کی سیر پر آمادہ کرے تو کسی غنچہ سے کم کھلا ہوا نہیں ہے۔ اپنے دل کا دروازہ کھول اور دماغ کے اندر داخل ہو جا۔ ان کستوریوں کے پیچھے جن کی خوشبو اڑ رہی ہے۔ جستجو کی زحمت نہ اٹھا اپنے خیال میں محبوب کی زلف کی گرہ کھول اور ملکِ ختن میں داخل ہو۔

برخلاف اس کے مردہ دل نفسانی، فاسق، فاجر، مشرک اور کافر آدمی کا دل ٹٹی اور پاخانے کی طرح دنیاوی اور نفسانی غلاظتوں اور گندگیوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ جب ایسے آدمی کے دم اور سانس کی بادِ سموم اس کے دل کا تعفن لے کر نکلتی ہے تو وہ شیطانی اور نفسانی زہریلی گیس کا گویا ایک بم گولہ ہوتا ہے جو ابلیس اور شیطان کی میگزین میں جمع ہوتا ہے اور وہاں سے حرص، طمع، حسد، کبر، شہوت وغیرہ کہ جملہ شیطانی اور نفسانی بداثرات لے کر آتا ہے۔ ایسا دم اور سانس جس دل سے جا ٹکراتا ہے اسے بھی مسموم اور متعفن کر دیتا ہے اور بیمار کر کے ہلاک کر دیتا ہے۔ غرض انسان جس وقت سانس لیتا ہے تو وہ سانس انسان کے دل اور ارواح کی بُو اور صفت لے کر نکلتا ہے اور انسانی دم اور سانس سے اس کے دل کے خیالات اور دل کی صفت معلوم اور محسوس کی جاتی ہے۔ لہٰذا انسان جب زبان سے ذکر کرے یا ظاہر اعضا سے اطاعت اور عبادت کرے لیکن اس کا دل غیر اللہ خیالات اور تفکرات میں مصروف ہو تو وہ ذکر اور عبادت اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اصل نظر نگاہ انسانی دل ہے نہ کہ اس کی زبان اور نہ ظاہری جسم اور اس کے اعمال۔ حدیث: **إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى أَجْسَامِكُمْ وَلَا إِلٰى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَنِيَّاتِكُمْ** (مسلم)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نہ تمہاری ظاہری صورتوں اور نہ عملوں کو دیکھتا ہے بلکہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے۔

برزباں اللہ در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

ترجمہ: ظاہر آزبان پر اللہ کا نام ہو مگر دل میں گاؤ خر کا خیال ہو تو ایسی تسبیح کب اثر رکھتی ہے۔ انسان کا جسم جب نماز میں ہو اور دل اپنے دنیاوی کاروبار میں لگا ہوا ہو تو ایسی نماز قبولیت نہیں رکھتی۔

دل[1] پریشان و مصلّی در نماز
ایں نمازے کے پذیرد بے نیاز

(رومیؔ)

---

[1] نمازی نماز پڑھ رہا ہے اور اس کا دل پریشان ہے۔ وہ بے نیاز ذات اسی قسم کی نماز کو کیونکر قبول فرمائے۔

غرض عارف روشن ضمیر لوگ کسی آدمی کے خیالات اور اس کے دل کی صفت ہوا میں اس کے دل کی باطنی رَو سے معلوم کر لیتے ہیں۔ کیونکہ انسان جب دل میں کچھ سوچتا ہے یا کسی کا ذکر کرتا ہے تو وہ گویا باطنی طور پر بولتا ہے اور اس کے دل کی یہ باطنی آواز قلوب کی باطنی فضا میں لہر اور تموّج پیدا کر کے اس کا حلقہ بجلی سے زیادہ سرعت کے ساتھ دور دور تک پھیل جاتا ہے اور اس کے دائرے میں جس قدر قلوب آتے ہیں سب سے وہ آواز جا ٹکراتی ہے۔ ہر زندہ، بیدار اور حساس دل اس آواز کو سن لیتا ہے اور اس ذاکر اور یاد کرنے والے کو دیکھ بھی لیتا ہے۔ لیکن جو دل پتھر کی طرح جامد اور مردہ ہوتے ہیں وہ اس باطنی آوازِ دل اور نظاروں سے بے بہرہ اور محروم ہوتے ہیں۔ اس باطنی احساس کو کشفِ قلوب کہتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام اور اولیا کرام کو یہ کمال بدرجۂ اتم حاصل ہوتا ہے۔ نہیں دیکھتے کہ جس وقت مصر سے یوسف علیہ السلام کے بھائی پیراہنِ یوسفؑ لے کر کنعان کی طرف چلے تو یعقوب علیہ السلام نے اسی وقوفِ قلبی کے طفیل اپنے گھر والوں سے فوراً فرما دیا تھا کہ اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ (یوسف ۱۲ : ۹۴) یعنی یعقوب علیہ السلام اپنے گھر والوں سے فرمانے لگے کہ "مجھے تو یوسفؑ کی بو آ رہی ہے اگر تم مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔"

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یمن کی طرف منہ کر کے حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ کے دل کی باطنی ریح اور بو محسوس کر کے فرمایا کرتے: اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ قِبَلِ الۡیَمَنِ ۔ یعنی "مجھے یمن کی طرف سے صفتِ رحمٰن کی بو اور ریح آتی ہے۔" ان ہر دو کلمات میں ریح یعنی ہوا کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی خیالات اور دل اور روح کی بو اور صفت کا ریح یعنی ہوا کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دینی لازمی ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کا باطنی کشف انبیا اور اولیا کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی معین اور خاص ضروری موقع کے لیے عطا کیا جاتا ہے۔ یعنی انہیں یہ باطنی بصیرت اور کشفی کمال ہر وقت اختیاری طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ جس طرح ہمیں دنیا میں مادی حواس دائمی طور پر حاصل ہیں کہ جس وقت اور جہاں چاہیں ہم ان سے مادی اشیا کو معلوم اور محسوس کر سکتے ہیں اسی طرح باطنی حواس بھی خدا کے خاص بندوں کو اللہ تعالیٰ وہبی طور پر ہمیشہ کے لیے عطا کرتا ہے کہ جس وقت اور جہاں چاہیں انہیں استعمال کر سکتے ہیں اور

ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض باتیں اپنے خاص مقبول بندوں سے مصلحتاً چھپا رکھتا ہے۔ جیسا کہ گھر کا مالک اپنے گھر کے بندوں سے بعض چیزیں چھپا کے رکھتا ہے یا بعض امور مصلحتاً ان سے پوشیدہ رکھتا ہے یا بعض دفعہ انسان ایک طرف دیکھ رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف کی چیزیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

انسان خواہ باطن میں خواص انبیاء عظام ہوں یا اولیاء کرام اور خواہ ظاہر بین عوام ہوں ان کے علوم اور احساس کا دائرہ محدود ہوا کرتا ہے اور خواہ کوئی انسان کتنا ہی عظیم المرتبہ اور منزہ صفات کیوں نہ ہو جائے اور کتنا ہی اللہ تعالیٰ کے قریب اور اس سے واصل ہو جائے اور اسکی ذات میں فنا اور بقا حاصل کر کے اس کے ساتھ زندۂ جاوید ہو جائے وہ پھر بھی حدوث اور امکان کے داغ سے داغدار رہتا ہے اور یہ داغ ہمیشہ کے لیے اس سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں پر گاہ گاہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی، صفاتی، اسمائی اور افعالی تجلیات کا نزول ہوتا ہے اور وہ حسب حیثیت اپنے باطنی ظرف کے مطابق اللہ تعالیٰ کے انوار کا انعکاس قبول کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کے ان مقبول بندوں پر اس خاص حالت میں اللہ تعالیٰ کا اطلاق ہو سکتا ہے اور ان کے قول، فعل اور عمل کو اللہ تعالیٰ کا قول، فعل اور عمل کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر کسی حالت میں بندے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

اس لیے قرآن کریم میں آیا ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ (المائدہ ۵ : ۱۷)۔ یعنی ”وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم بن گیا ہے“ یعنی اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم کے انسانی روپ میں آگیا۔ برخلاف اس کے اگر یوں کہا جاتا کہ جیسے ابن مریم نے خدائی نور اور روح القدس سے بھر کر خدائی کام کیے تو یہ کفر کی بات نہیں۔ اول الذکر لوگ حلول کے قائل ہیں اور یہ مذہب اہلِ اوتار کا ہے جو کہتے ہیں کہ خدا کبھی کبھی انسانی بھیس میں دنیا میں آتا ہے۔ اور مؤخر الذکر لوگ اس اعتقاد کے قائل ہیں جو صحیح بخاری کی اس حدیث سے واضح ہے: يَتَقَرَّبُ الْعَبْدُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَكُوْنَ عَيْنَيْهِ يَنْظُرُ بِیْ وَ اُذُنَيْهِ يَسْمَعُ بِیْ وَاَيْدِيْهِ الَّتِیْ يَبْطِشُ بِیْ وَ لِسَانَهُ الَّذِیْ يَنْطِقُ بِیْ الخ (بخاری) ترجمہ: ”بندہ زائد عبادت اور اطاعت سے میرے نزدیک ہو جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں وہ مجھ سے دیکھتا ہے اور اس کے کان بن جاتا ہوں

وہ مجھ سے سنتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں وہ مجھ سے پکڑتا ہے اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں وہ مجھ سے بولتا ہے۔" قرآن کریم میں بھی اس حدیث کے مطابق آیتیں موجود ہیں۔ قَوْلُہٗ تَعَالیٰ: وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (النجم ۵۳: ۳۔ ۴)۔ یعنی "میرا نبی ہوا سے نہیں بولتا بلکہ اس کا بولنا عین اللہ تعالیٰ کی وحی اور القاء ہے۔" قَوْلُہٗ تَعَالیٰ: وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ج (الانفال ۸: ۱۷)۔ ترجمہ: "اے میرے نبی! تو نے کافروں کی طرف کنکریاں نہیں پھینکی تھیں بلکہ وہ خود اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھیں۔" قَوْلُہٗ تَعَالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ج (الفتح ۴۸: ۱۰)۔ ترجمہ: "اے میرے نبی! جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں وہ عین اللہ تعالیٰ کی بیعت کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ تیرے ہاتھ کے اوپر ہے۔" سو اس قسم کا اعتقاد آیات اور احادیث سے صحیح اور درست ثابت ہے۔

گفتۂ او گفتۂ[1] اللہ بود     گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خُدا     اُو نشیند در حضورِ اولیاء

اَولیاء اللہ و اللہ اَولیاء     ہیچ فرقے درمیاں نہ بود روا

(رومیؒ)

ترجمہ: اس کا کہنا اللہ تعالیٰ کا کہنا ہوتا ہے۔ چاہے وہ اللہ کے بندے کی زبان سے ادا ہو جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بیٹھنے کا آرزومند ہے وہ اس کے اولیا کی مجلس میں بیٹھتا ہے۔

اور کسی بزرگ کا یہ قول اس کے مطابق ہے۔

مردانِ خُدا خُدا نہ باشند     لیکن ز خُدا جُدا نہ باشند

ترجمہ: خدا کے مقبول بندے خدا تو نہیں ہوتے لیکن وہ خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے۔

جس کا اردو ترجمہ یوں ہے۔ (داغؔ)

آدم کو خدامت کہو آدم خدا نہیں     لیکن خدا کے نور سے آدم جدا نہیں

---

[1] جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات میں فنا حاصل کر لیتے ہیں یعنی اپنی ذات کو بالکل مٹا کر اللہ تعالیٰ کی ذات سے واصل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ایک طرح پر اللہ ہی کا کہنا ہوتا ہے چاہے وہ اس بندے کے منہ سے ہی نکلتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے مصر سے پیراہنِ یوسفی کی بُو معلوم اور محسوس کرنے کے ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یعقوب علیہ اسلام کو یوسف علیہ السلام کا مطلق کوئی علم نہ تھا۔ اگر علم ہوتا تو کنعان کے کنوئیں میں سے انہیں جا کر کیوں نہ نکال لائے۔ سو یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی نسبت اس قدر علم تو ضرور تھا کہ انہیں بھیڑیوں نے نہیں کھایا بلکہ وہ زندہ ہے۔ اس لیے آپ نے بیٹوں کے اس بہانے کو جھٹلاتے ہوئے فرمادیا تھا کہ: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ (یوسف ۱۲ : ۱۸)۔ یعنی: ''یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے نہیں کھا گئے۔ بلکہ تم اپنی طرف سے جھوٹا منصوبہ بنالائے ہو۔'' اور دوسری بار جب آپؑ اپنے بیٹوں کو غلہ لانے کے لیے مصر بھیج رہے تھے تو انہیں یہ تلقین فرمائی کہ: یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ (یوسف ۱۲ : ۸۷)۔ یعنی ''اے فرزند جاؤ اور یوسفؑ اور اس کے بھائی بنیامین کو ڈھونڈ لاؤ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔'' اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا تھا کہ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ؕ (یوسف ۱۲ : ۸۳)۔ یعنی ''عنقریب اللہ تعالیٰ ہر دو یوسف اور اس کے بھائی کو لاکر مجھے ملا دے گا۔'' یعقوب علیہ السلام باوجود علمِ غیبی اور کشفِ باطنی کچھ تو بسبب ضعفِ بشری اندیشناک اور تذبذب میں رہے اور کچھ اللہ تعالیٰ کے امتحان صبر سے خائف تھے اور فرماتے رہے فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ (یوسف ۱۲ : ۸۳)۔ ''صبر ایک عمدہ فعل ہے۔'' ورنہ آپ اپنے گھر میں ہر وقت یوسفؑ کی باتیں کرتے رہتے کہ اب وہ فلاں جگہ ہے اور فلاں کام کر رہا ہے اور بھائی آپ کی ان باتوں کو آپ کے جنون اور مالیخولیا سے تعبیر کرتے حالانکہ وہ صحیح کشف ہوتا۔ یعقوب علیہ السلام کا یہ امتحان کا معاملہ بعینہٖ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرح تھا کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی فرمائی کہ اپنے بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دے تو ساتھ ہی یہ بھی وعدہ فرمادیا تھا کہ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ○ (القصص ۲۸ : ۷)۔ یعنی ''ہم اس بچے کو پھر تمہارے پاس زندہ سلامت پہنچادیں گے اور اسے پیغمبر بنائیں گے''۔ لیکن باوجود اس صحیح بشارت اور باطنی بصارت کے اس کا دل بے قرار اور بے صبر رہا۔ قولہٗ تعالیٰ: وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ

الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (القصص ۲۸ : ۱۰)۔ ”موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل اتنا بے قرار ہوا کہ سارا معاملہ ظاہر کر دیتی اگر ہم اس کا دل مضبوط نہ کرتے تا کہ ہمارے وعدے پر اسے ایمان اور اطمینان ہو۔“ سو پیغمبروں اور اولیاء کو باوجود کشفِ صحیح اور بصارتِ باطنی پھر بھی بسبب ضعفِ بشری خدشہ اور اندیشہ لاحق رہتا ہے اور داغِ بشریت کسی وقت انسان سے دور اور زائل نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ چیز ہے جو عبد کو معبود اور بندے کو خدا سے جدا اور ممیز کرتی ہے۔

اگر خدا کے خاص بندوں کو علمِ غیب حاصل نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی کیوں فرماتے: وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ (آلِ عمرٰن ۳ : ۴۹)۔ ترجمہ: ”عیسیٰ علیہ السلام نے کہا میں (اپنے خداداد علم سے) تمہیں بتا سکتا ہوں کہ جو کچھ تم اپنے گھروں میں روزانہ کھایا کرتے ہو اور جو کچھ تم آئندہ کے لیے ذخیرہ جمع رکھتے ہو۔“ غرض اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو اپنے اوپر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ جیسا مولانا روم صاحب ؒ فرماتے ہیں ؎

کارِ پاکاں [۱] راقیاس از خود مگیر  گرچہ باشد در نوشتن شیر و شِیر
آں یکے شیر است کہ مردم درد  ویں دگر شِیر است کش مردم خورد
گر بصورت آدمی انساں بدے  احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

سو ذکر میں اصل معاملہ دِل کا ہے۔ ظاہری صورت اور خالی زبانی ذکر کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ بہت لوگ ساری رات زبانی ذکر کیا کرتے ہیں لیکن ان کا دل ذکر سے غافل ہوتا ہے۔ اور بعض ایسے عارف کامل ذاکر ہیں جو مطلق زبان نہیں ہلاتے لیکن ان کا لطیفۂ دل ذکر اللہ سے گویا ہوتا ہے ؎

بدل [۲] مذکر حق باش ورنہ طوطی ہم
بصوت و حرف خدا را کریم مے گوید

---

[۱] ترجمہ: پاک لوگوں کے اعمال کو اپنے پر قیاس نہ کر اگرچہ لکھنے میں شیر اور شِیر یکساں ہیں۔ ان میں ایک تو شیر وہ ہے جو لوگوں کو پھاڑتا ہے اور دوسرا شِیر (دودھ) ہے جسے لوگ پیتے ہیں۔ اگر آدمی شکل اور صورت کے اعتبار سے ہی انسان ہوتا تو حضور رسالت مآب ﷺ اور ابوجہل بھی برابر ہوتے۔

[۲] تو اپنے دل سے اللہ کا ذاکر ہو ورنہ طوطی بھی حرف اور آواز کے ساتھ خدا کو کریم کہتی ہے۔

محبانِ حق اور عارفانِ الٰہی کا ہر ایک سانس گویا محبت اور شوقِ الٰہی سے بھرا ایک باطنی پیغام اور روحانی پروانہ ہوتا ہے جو تارِ برقی اور لاسلکی رَو کی طرح اللہ تعالیٰ کی پاک بارگاہ میں جا پہنچتا ہے اور ذاکر کی طرف سے اپنے شوق اور محبت کا عرض حال گذارتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے قرب، وصال اور مشاہدے کے انوار لے کر آتا ہے۔ اسی طرح ذاکر مذکور، عبد معبود اور محبّ اور محبوب کے درمیان فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرة ۲: ۱۵۲) (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا) کی تارِ برقی اور يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ (المآئدہ ۵: ۵۴) (محبت کرتا ہے اللہ ان سے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں) کی لاسلکی رَو جاری رہتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ دل سے ہزار دفعہ اللہ تعالیٰ کا نام اور زبان سے ایک دفعہ اللہ کہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ لوگ ہزاروں لاکھوں دفعہ اللہ اللہ کرتے ہیں۔ انگلیاں تسبیح کے دانے اور منکے پھیرتے پھیرتے تھک جاتی ہیں اور تسبیح کے تاگے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن دل کو آگاہی اور خبر بھی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میر صاحبؒ فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| یہ بات مری سن کہ نہیں بے تاثیر | ہر چند کہ طاعت میں ہوا ہے تو پیر |
| منکے کی طرح من نہ پھرے جب تک میر | تسبیح بکف پھرنے سے کیا کام چلے |

یہ فقیر ایک دفعہ رمضان کے آخری عشرے میں ایک مسجد کے اندر معتکف تھا۔ وہاں ایک اور شخص بھی اعتکاف کی نیت سے مقیم تھا جو بڑا شب بیدار اور محنتی معلوم ہوتا تھا۔ عشاء سے لیکر صبح تک ساری رات اللہ اللہ کیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ بندۂ خدا! تم بہت محنت کرتے ہو۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے اپنے مرشد نے بارہ ہزار دفعہ اللہ اللہ پڑھنے کا روزانہ امر فرمایا ہے۔ سو میں بمشکل ساری رات میں اس کو ختم کرتا ہوں۔ میں نے پھر اس سے دریافت کیا کہ تم نے کتنے عرصے سے یہ محنت شروع کر رکھی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ تقریباً دس سال سے روزانہ بلاناغہ یہ محنت اور مجاہدہ کر رہا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ اس محنت کا کوئی پھل اور اس مجاہدے کا کوئی مشاہدہ بھی تمہیں باطن میں حاصل ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کچھ نہیں۔ صرف اس قدر ہے کہ مرشد کا امر پورا کر رہا ہوں اور جس روز یہ امر پورا ہو جاتا ہے اس روز نفسیاتی اثر کے تحت دل خوش اور مطمئن رہتا ہے کہ فرض ادا کیا ہے۔ اور اگر کچھ کوتاہی ہو جائے تو دل پریشان رہتا ہے۔ میں نے کہا میاں! تمہاری محنت تو

بڑی ہے لیکن مزدوری خاک اور صفر ہے۔ اس نے کہا کہ مرشد کا فرمان پورا کرنا فرض ہوا کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ ایسے بے اثر اور بے نتیجہ فرمان سے کیا حاصل۔ خیر وہ بے چارہ اپنے کام میں لگا رہا اور میں نے اسے زیادہ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ایسے ہزاروں لوگ بے جا اور بے طریقہ رائیگاں سخت محنت اور ریاضت کرتے ہیں اور انہیں بمقتضائے عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ۝ (الغاشیۃ ۸۸: ۳) سوائے محنت اور تھکاوٹ کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ حی قیوم زندہ اور پائندہ ذات ہے اور وہ سمیع بصیر یعنی شنوا اور بینا ہے۔ اور نیز قریب مجیب یعنی قریب اور جواب دینے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات (معاذ اللہ) کوئی ٹھوس جامد بت نہیں کہ بندہ اسے پکارے یا اللہ اور وہ جواب نہ دے لَبَّیْکَ یَاعَبْدِیْ یعنی اے بندے میں حاضر ناظر ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس کی خالص عبادت کرے یا اس کے نام پر پاک اور طیب مال بے ریا دیوے اور اللہ تعالیٰ غنی اور کریم ہونے کے باوجود اسے معاوضے اور انعام سے سرفراز نہ فرماوے۔ جس ذکر، فکر، دعا، عبادت اور خیرات وصدقات پر فوری اثر اور نتیجہ مترتب نہ ہو اور بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی بابت خواب، مراقبے یا بیداری میں کوئی اعلام یا الہام نہ ہو تو سمجھ لو کہ وہ دعا، صدقہ اور عبادت وغیرہ قبولیت کے درجہ کو نہیں پہنچیں اور ان کی شرائط اور لوازمات وغیرہ میں کوتاہی رہ گئی ہے۔ اور بسبب باطنی نقص اور عیب وہ چیز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو ہر عمل اور ہر عبادت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے طرح طرح کی بشارتیں اور غیبی اشارتیں پہنچتی رہتی ہیں۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج (حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۳۰۔۳۱)۔ ترجمہ: ”تحقیق وہ لوگ جنہوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس اقرار پر عملی طور پر قائم بھی رہے تو ہم ان پر فرشتے نازل کرتے ہیں جو انہیں بشارتیں دیتے ہیں کہ کسی قسم کا غم اور خوف نہ کرو اور جنت کی بشارت سے خوش رہو جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم یہاں دنیا میں اور نیز آخرت میں تمہارے یار اور مددگار ہیں۔“

انسان کو چاہیے کہ عبادت، طاعت، دعوت اور ذکر فکر میں حضورِ دل کو ضروری اور لازمی

جانے۔ اپنے سانس اور دم پر نگاہ رکھے کہ کوئی دم اور سانس ذکر اللہ کے بغیر نہ نکلے۔ کیونکہ جو سانس اللہ تعالیٰ کے خیال اور تصور سے نکلتا ہے وہ ایک گوہر بے بہا بن کر ذاکر کے لیے خزانہ آخرت میں جمع ہوتا ہے۔

ہر دم کہ میرود نفس از عمر گو ہر یست
کا نرا خراج عمر دو عالم بود بہا
(حافظؔ)

ترجمہ: زندگی کے ہر دم کا جو سانس جاتا ہے وہ ایک ایسا گوہر ہے جس کی قدر و قیمت دونوں جہان کی عمر کے برابر ہے۔

کیونکہ جو دم گذر جاتا ہے وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے اس کا واپس آنا محال ہے۔ اور جو آئندہ آنے والا ہے خدا جانے وہ آئے یا نہ آئے۔ غرض دمِ ماضی اور دمِ مستقبل ہر دو اختیار اور اعتبار سے باہر ہیں۔ انسان صرف اسی ایک ہی دم کا مالک ہے جو زمانہ حال میں جاری ہے۔ اگر یہ دم اللہ تعالیٰ کے خیالِ خاص اور ذکرِ با اخلاص سے نکل گیا تو یہ سمجھو کہ گوہر بے بہا بن گیا جس سے دارین کی دولت اور کونین کی سعادت خریدی جا سکتی ہے۔ اور اگر یہ دم غفلت میں گذر گیا یعنی نفس و شیطان اور دنیا کے خیال میں گذر گیا تو یہ جانو کہ یہ دم نہیں تھا جو ہوا میں اڑ گیا بلکہ دارِ آخرت اور عالمِ عقبیٰ میں ابدی عذاب اور لازوال آلام کا پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑے گا۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ دم کی قدر جانے۔

نگہدار دم راکہ عالم دمے است — دمے پیش دانا بہ از عالمے است
سکندر کہ بر عالمے حکم داشت — درآں دم کہ بگذشت عالم گذاشت
میسر نہ بودش کہ زو عالمے — ستانند و مہلت دہندش دمے
(سعدیؔ)

ترجمہ: اپنے دم (سانس) کی حفاظت کر کیونکہ دنیا بھی ایک دم ہی ہے اور دانا کی نظر میں ایک دم بھی عالم سے بہتر ہے۔ سکندر جو دنیا کا حکمران تھا جس وقت وہ فوت ہوا اس نے دنیا کو چھوڑ دیا۔ اسے یہ بات حاصل نہ ہو سکی کہ اس سے دنیا کا ایک قطعہ لے کر (اس کے بدلے) مزید پل بھر کی مہلت مل جائے۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ کا اپنے طالبوں، مریدوں کے ہمراہ چند قبروں پر گذر رہوا۔ آپ وہاں فاتحہ پڑھنے کے لیے چندہ منٹ ٹھہرے اور بعدہٗ ان کے احوال کی طرف متوجہ اور مراقب ہوئے۔ جب آپ مراقبے سے فارغ ہوئے تو آپ نے ایک درد بھری آہ نکالی اور آبدیدہ ہوئے۔ مریدوں نے دریافت کیا کہ جناب یہ کیا حالت ہے۔ فرمایا کہ یہ چند قبریں جن لوگوں کی ہیں یہ دنیا میں بڑے زاہد، عابد اور پرہیز گار گذرے ہیں۔ لیکن دنیا میں معدودے چند دم اور سانس ان کے اللہ کی یاد سے غفلت میں گذر گئے تھے۔ ان چند دموں اور سانسوں کی نسبت ان کے دلوں میں اس قدر حسرت اور ارمان ہے کہ اگر ان میں سے ایک اہلِ قبر کے دل کی حسرت اور ندامت نکال کر تم سب کے دلوں میں تقسیم کر کے ڈال دی جائے تو خدا کی قسم تم سب پاگل اور دیوانے ہو جاؤ گے۔ غرض موت کے بعد انسان کو اس بات کا غم نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پیچھے عزیز بچے، پیاری بیوی، بھائی بہن، دوست، آشنا، مال و دولت، پیارا وطن اور گھر بار وغیرہ چھوڑ کر آیا ہے۔ اسے جب معلوم ہوتا ہے کہ بازارِ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر، یادِ الٰہی اور طاعت و عبادت کے بغیر اور کوئی دام نہیں چلتا اور نہ اس سچے سکے کے بغیر کوئی کام نکلتا ہے تو اسے اگر کوئی غم اور درد ہوتا ہے تو صرف اس بات کا ہوتا ہے کہ ہائے عمر گراں مایہ کی وہ زریں قیمتی گھڑیاں اور تارِ تنفس کی سنہری کڑیاں ہاتھ سے نکل گئی ہیں۔ جن کے ایک ایک تارِ تنفس میں زندگی کا اصلی گوہرِ مقصود پرویا ہوا تھا۔ صد افسوس، دن رات میں چوبیس ہزار دم حاصل تھے اور ہر دم میں اللہ تعالیٰ کے قرب، مشاہدے اور وصل وصال کے موقعے شامل تھے۔ اب ان میں سے ایک بھی واپس ہاتھ آنے کا نہیں۔ ہائے غفلت اور نادانی اب وہ چابی گم ہوگئی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے قرب کا دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔

دلا[1] تو غافلی از کار خویش و مے ترسم
کہ کس درت نہ کشاید چو گم کنی مفتاح

غرض اس عمرِ عزیز اور اس کے قیمتی اور زرّیں دموں کی قدر و قیمت موت کے بعد معلوم ہوگی جب کہ یہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اور نادان انسان بے چارا غفلت کا مارا زار زار

---

[1]: اے دل تو اپنے کام سے غافل ہے اور مجھے اس بات کا ڈر لگتا ہے کہ اگر تجھ سے کلید گم ہوگئی تو کوئی تیرا دروازہ نہیں کھول سکے گا۔

پکارے گا یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰهِ وَاِنْ کُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ ۝ (الزمر ۳۹:۵۶)۔ یعنی "ہائے افسوس اس بات پر کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے قرب میں کس قدر کوتاہی کی اور میں نے تو ٹھٹھے اور مسخری میں عمر گذار دی۔"

سوائے عزیز و! اِن چند دموں کو جو تمہیں اس زندگی میں حاصل ہیں غنیمت جانو اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اللہ تعالیٰ کی یاد میں گذر گیا تو تمام دنیا کی بادشاہی سے بہتر ہے۔

خاقانی مردِ حقانی نے کیا اچھا کہا ہے ۔

پس از سی سال ایں معنیٰ محقق شد بخاقانی

کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

ترجمہ: خاقانی کو تیس سال بعد اس حقیقت کا علم ہوا کہ ایک دم باخدا رہنا سلیمانؑ کے ملک سے بھی بہتر ہے۔

اے مردِ خدا عقل سے کام لے۔ دم کے اس درِ گراں مایہ کو فضول اور لایعنی اشغال اور لہو و لعب میں ضائع نہ کر ورنہ سخت پچھتائے گا۔ انسانی زندگی کا اصل مقصد عبادت اور معرفت ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ (الذّٰریٰت ۵۱:۵۶) یعنی "ہم نے جن اور انسان کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔" اور عبادت کا مقصد معرفت ہے۔ جیسا کہ اس حدیث قدسی سے ظاہر ہے کُنْتُ کَنْزًا مَّخْفِیًا فَاَرَدْتُّ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ترجمہ: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ پس میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے (اپنی معرفت اور پہچان کے لیے) مخلوق کو پیدا کیا۔" اور نیز ازل کے روز جب اللہ تعالیٰ نے ارواحِ مخلوق کو مخاطب کر کے فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ط (الاعراف ۷:۱۷۲)۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔" تو اس زبانی (ORAL) سوال سے بھی اللہ تعالیٰ کی غرض و غایت اپنی معرفت اور پہچان معلوم ہوتی ہے کہ آیا تم مجھے اپنا رب جانتے ہو یا نہیں۔ تو ارواح نے جواب دیا بَلٰی (الاعراف ۷:۱۷۲) یعنی ہم پہچانتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے۔ غرض مخلوق کی پیدائش کا اصلی مقصد اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان ہے۔ بعض نادان، حریص، کور چشم طلب دنیا اور حصولِ معاش کو ہی زندگی کا اصلی مقصد اور عبادت خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ

خدمتِ خلق ہی اصلی عبادت ہے اور نماز، روزہ، تلاوت، ذکر، فکر اور عبادت وطاعت کو تضیع اوقات اور رہبانیت کی مشق خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت کے دوسرے حصے میں ان کے اس دعویٰ کو صاف طور پر رد کردیا ہے۔ اور وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ٥ (الذّٰریٰت ۵۱: ۵۶) کے بعد صریح طور پر فرمایا ہے کہ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ٥ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ٥ (الذّٰریٰت ۵۱: ۵۷۔۵۸) ترجمہ: ”ہمارا منشا اُن سے رزق پیدا کرنے کا ہرگز نہیں ہے اور نہ ہماری یہ خواہش ہے کہ وہ ہماری مخلوق کو طعام پہنچائیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ خود رازق مطلق اور زبردست قوت اور طاقت والا ہے۔“ یعنی: وہ تمام مخلوق کیا چرند اور کیا پرند، کیا جن اور کیا اِنس، سب کو رزق پہنچانے سے عاجز اور کمزور نہیں ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند [1] تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

(سعدی)

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو انسان اور جنات کے رزق اور پرورش کی خدمت پر لگا دیا ہے اور انسان اور جنات کو محض اپنی عبادت اور معرفت کے لیے پیدا کیا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرہ ۲: ۲۹) ۔ یعنی اے میرے بندو! آسمان اور زمین کے اندر جس قدر چیزیں موجود ہیں وہ سب میں نے تمہارے لیے پیدا کی ہیں۔ لیکن تمہیں اپنے لیے پیدا کیا ہے۔

کارسازِ [2] ما بفکرِ کارِ ماست
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ماست

(رومی)

[1] ترجمہ: بادل، ہوا، سورج، چاند اور آسمان سب اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تو ایک روٹی حاصل کرے اور غفلت سے نہ کھائے سب کے سب تیرے لیے سرگرداں اور فرماں بردار ہیں۔ یہ انصاف کی شرط نہ ہوگی اگر تو فرماں برداری اختیار نہ کرے۔

[2] ترجمہ: ہمارا کارسازِ مطلق ہمارے کام کی فکر میں ہے۔ کام کے اندر ہمارا فکر ہی مصیبت کا باعث بنتا ہے۔

وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (ھود ۱۱:۶)۔ ترجمہ: ''اور کوئی نہیں پاؤں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی۔'' ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ انسان کے وجود میں روح ہوا کے ذریعے پھونکی گئی اور روح جب آدم کے وجود میں داخل ہوئی تو اس نے اسم اللہ کہا۔ سو انسان کی فطرت اور خلقت کی بنیاد اسم اللہ کے نور سے پڑی ہے اور اپنی اسی اصل کی طرف رجوع کرنا اور اسی حقیقی سرشت کے ساتھ موافقت پیدا کرنا اور اپنے آپ کو اپنے اصل اور معدن تک پہنچانا یعنی ذکر اللہ سے مذکور اللہ تعالیٰ تک اور اسم سے مسمّٰی تک پہنچنا اس کا حقیقی فطری فعل اور زندگی کا اصلی مقصد ہے۔ انسان کے اندر ہر وقت کسی نہ کسی شے کی یاد اور ہر وقت خیالات اور ذکرات کا تسلسل اسی اسم اللہ ذات کے تاثرات اور مقتضیات سے ہے۔ سو انسان کی سرشت اور فطرت میں اسم اللہ کا نور اور اس کا ذکر بطور تخم ودیعت رکھ دیا گیا ہے۔ انسان فطرتاً اپنے خالق مالک کے ساتھ اسی مخفی باطنی رابطے اور غیبی رشتے کے ذریعے وابستہ ہے۔ اسی لیے ہر مذہب خصوصاً مذہب اسلام کے تمام دینی ارکان اور شرعی اعمال مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمہ وغیرہ کا دارومدار اور انحصار اسم اللہ اور ذکر اللہ پر ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اسلامی فطرت لے کر دنیا میں آتا ہے اور نیز اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی اسی کی تائید میں ہے: فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ط لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ط ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ق وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ o (الروم ۳۰:۳۰)۔ ترجمہ: ''پس تو اپنا رخ دینِ حنیفی یعنی توحید کی طرف پھیر جو کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ازلی اور اصلی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ سو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اس ازلی فطرت اور اصلی خلقت میں تبدیلی واقع نہ ہو۔ یہی ہے دینِ محکم اور مضبوط۔ لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔'' غرض اسلام وہ خاص حقیقی اور اصلی توحیدی دین ہے جس کا تخم اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل سے انسان کی سرشت اور پیدائش میں بطور امانت رکھ دیا ہے۔ پس اسی اصلی ودیعت کے سلامت رکھنے کا نام اسلام ہے اور اسی ازلی امانت کا مامون اور محفوظ رکھنا عین ایمان ہے اور اسی فطرت کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہے: کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ وَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ۔ یعنی ''ہر بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے تو

اس کی فطرت اسلام پر ہوتی ہے۔ لیکن بعدہٗ والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں۔" یعنی والدین اپنے آبائی اور تقلیدی دین کا جوا اُس کے گلے میں ڈال کر اسے مشرک بنا لیتے ہیں۔ اور یہی شیطان کا بڑا زبردست حیلہ اور فریب ہے کہ وہ انسان کی اصلی دینی فطرتی اور ازلی مذہبی خلقت کو بگاڑ دیتا ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ (النساء ۴: ۱۱۸-۱۱۹)۔ ترجمہ: "اور شیطان نے اللہ تعالیٰ کو جواب دیا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک بڑے حصے کو پکڑ لوں گا اور انہیں گمراہ کر دوں گا اور انہیں طرح طرح کی جھوٹی تسلیاں دوں گا اور سبز باغ دکھاؤں گا اور وہ ان جاہل حیوانوں کے کان کتر ڈالیں گے (یعنی انہیں اپنے تقلیدی دین کا حلقہ بگوش اور تابعدار بنا ڈالیں گے)۔ اس کے بعد اُنہیں امر کروں گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی اصلی خلقت کو بگاڑ کر رکھ دیں گے۔" آیت فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ (الروم ۳۰: ۳۰) اور حدیث كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلٰى فِطْرَتِ الْاِسْلَامِ میں جس فطرتِ دینی اور سرشتِ ازلی کی طرف اشارہ ہے وہ نور پیدائشی طور پر بچپن میں بچے کے حواس سے ٹپکتا ہے اسی لیے بچہ کائنات کی جملہ اشیاء کو اپنے حقیقی رنگ میں دیکھتا ہے۔ اسی فطرتی نظارے کی آرزو میں بعض اہل اللہ نے یہ دعا مانگی ہے اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَآءَ كَمَا هِیَ یعنی اے اللہ ہمیں چیزیں اپنے اصلی رنگ میں دکھا۔ اسی بچپن کے پُر لطف، سرور انگیز اور حسین ورنگین زمانے کو یاد کر کے ہر شخص افسوس اور ارمان کرتا ہے۔ انسان جب معصوم بچہ ہوتا ہے تو گویا ابھی تک اس کی روح اپنے آدم علیہ السلام کے ازلی ورثے یعنی بہشت کی حق دار اور مستحق ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ماں کی چھاتیوں سے دودھ اور شہد کی نہریں جاری کر دی جاتی ہیں۔ لیکن جونہی وہ شجرِ ممنوعہ کے قریب جاتا ہے اور دانۂ گندم کھانے لگ جاتا ہے تو اس پر اپنے فطرتی اور ازلی بہشت کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ سو بچے کی اصلی اور ازلی فطرت اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر اسم اللہ ذات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان پڑھی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام و ذکر اللہ یاد دلا کر اسے اپنی اصلی ازلی فطرت کی طرف راغب اور مائل کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کے تخم اسم اللہ ذات پر ذکر اللہ کے آبِ حیات کی ترشح

کی جاتی ہے تا کہ مقامِ دنیا میں اپنے اصل کی طرف رجوع کرے اور جب مُرغ روح قفسِ عنصری سے موت کے وقت پرواز کرنے لگتا ہے اس وقت بھی اسے اپنے اصلی ازلی وطن کی یاد دلانے کے لیے اسم اللہ اور ذکر اللہ اور کلمۂ طیّب کی تلقین کی جاتی ہے تا کہ وہ اپنے اصلی اور حقیقی منزلِ مقصود کی طرف رجوع کرے اور شیطان اسے صحیح راستے اور صراطِ مستقیم سے گمراہ نہ کر دے۔ اور ایک حدیث میں انسان کی پیدائش کے وقت اور نیز موت کے وقت رونے اور گریہ کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ شیطان اس وقت اس کی اصلی فطرتِ دینی کو بگاڑنے اور اسے گمراہ کرنے کے لیے اس پر ہاتھ ڈالتا ہے اور وہ اصلی راہزن انسان سے حقیقی گوہرِ مقصودِ زندگی چھیننے کا ابتدائی اور آخری حملہ بڑی سختی اور شدت سے کرتا ہے۔ اس لیے طفلِ روح پیدائش اور موت کے وقت روتا ہے۔

.................................○.................................

# سائنس اور مذہب کا مقابلہ

کس قدر نادان اور غافل ہیں وہ لوگ جو اسم اللہ اور ذکر اللہ کی قدر و قیمت اور اہمیت نہیں جانتے۔ بلکہ الٹا کہتے ہیں کہ مذہب انسان کو محض لفظ ''اللہ'' کی طرف بلاتا ہے جو ایک بے ہمہ زندگی ہے۔ یعنی مذہب انسان کو رہبانیت، جمود اور بیکاری کی تعلیم دیتا ہے جو کہ قدرت کے عطا کردہ اعضا اور قویٰ کا انعطال ہے۔ مگر اس کے برعکس سائنس انسان کو عمل اور اللہ تعالیٰ کے مشاہدے کی طرف بلاتی ہے۔ یعنی مادی دنیا اللہ تعالیٰ کا فعل اور عمل ہے اور سائنس اس عمل اور فعل کے مشاہدے کا نام ہے اور یہی اصل غایت اور غرضِ زندگی ہے۔ ملاحدۂ دہر کا یہ دعویٰ کہ سائنس بنی نوع انسان کے لیے آرائش و آسائش کے سامان مہیا کرتی ہے اور اقوامِ عالم کی ترقی و بہبودی کا باعث ہے۔ مگر مذہب وضو کرنے، نماز پڑھنے، روزہ، تلاوت، حج، زکوٰۃ، ذکر، عبادت وغیرہ بے اثر اور بے نتیجہ کاموں کا نام ہے۔ جس سے سوائے تضیع اوقات کے اور کوئی ٹھوس اور مادی فائدہ نہیں ہے۔ غرض اس قسم کے بے شمار واہیات خرافات، مذہب اور روحانیت کے خلاف کہہ کر خلقِ خدا کو اپنے خالق اور مالکِ حقیقی کی عبادت، معرفت، قرب، وصال اور مشاہدے سے روکنے اور باز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شیطان کے ہاتھ یہی متاعِ دنیا ایک بڑا پُر فریب کھلونا ہے جس سے وہ طفل مزاج انسانوں کو مادی دنیا کی چند روزہ فانی زندگی کی لذت و ہوا و ہوس اور لہو و لعب میں مبتلا اور فریفتہ کر کے انہیں دارِ آخرت کی ابدی سرمدی زندگی اور اصلی حقیقی روحانی مسرتوں اور لذتوں سے محروم اور غافل کرتا ہے۔

سچ پوچھو تو اسم اللہ، ذکر اللہ، طاعت اور عبادت ہی محض سعادتِ دارین اور گنجینہ ہائے کونین کی واحد کلید اور ابدی سرمدی زندگی، عشرتِ جاودانی اور دولتِ اُخروی کا ذریعہ اور وسیلۂ وحید ہے۔ کیونکہ اسم اللہ ذات ہی تمام کائنات کا باعثِ ایجاد اور یہی اسم پاک تمام آفرینش کا مبداء و معاد ہے۔ افسوس کہ مادہ پرست نفسانی مردہ دل لوگ محض خیالی، وہمی عارضی اور چند روزہ فانی زندگی کی تنگ و تاریک شبِ یلدا میں مادی جسم کے کثیف لحاف اوڑھے ہوئے اور غفلت کی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں اور خواب و خیال کے طلسمی جہان

کے نظارے میں محو اور مگن ہیں۔ اور اس حقیقی روشن بیدار روحانی جہان کی پائیدار ابدی لذتوں اور مسرتوں سے غافل اور بے خبر ہیں جو انسانی پیدائش اور زندگی کی اعلیٰ غرض اور اصل مقصود ہے۔ تمام مادی دنیا اور اس کا علمِ سائنس اور دنیوی نفسانی فانی لذتوں اور مسرتوں کے حصول کے لیے جدوجہد، تمام دوڑ دھوپ اور ساری کوشش محض خاکرانی، تحصیلِ حاصل اور بے سود ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۵ عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا o ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۙ وَھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اھْتَدٰی o (النجم ۵۳: ۲۹ - ۳۰)۔ ترجمہ: ”پس تو روگردانی کر اس شخص سے جس نے ہمارے ذکر سے روگردانی کی اور اس نے محض دنیا کی زندگی کو ہی اپنا مقصود بنایا۔ یہی اس نادان کے علم کی پہنچ ہے۔ لیکن تیرا رب خوب جانتا ہے راستے سے بھٹکنے والوں اور سیدھے راستے پر چلنے والوں کو۔“

لذاتِ[1] جہاں چشیدہ باشی ہمہ عمر    بایار خود آرمیدہ باشی ہمہ عمر
چوں آخرِ عُمر زیں جہاں باید رفت    خوابے باشد کہ دیدہ باشی ہمہ عُمر
(خیام)

مانا کہ آج کل سائنس کے طلسمِ ظاہری اور مادے کے سحرِ سامری نے لوگوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کی بدولت انسان بادلوں میں اڑ رہے ہیں، زمین پر لکڑی اور لوہے کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں، دریاؤں اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں، مشرق اور مغرب کی باتیں ایک آن میں سنائی دیتی ہیں۔ سائنس اگرچہ چند روز کے لیے دنیا میں ظاہری آرام اور آسائش کے سامان مہیا کرنے والی مفید چیز معلوم ہوتی ہے مگر ساتھ ہی اس نے خلقِ خدا کی تباہی اور ہلاکت کے وہ زمیں پاش اور کوہ شکن اور لرزہ افگن آلاتِ حرب پیدا کیے ہیں کہ تعجب نہیں کہ سائنس جس کو سارا زمانہ ابرِ رحمت برسانے والا میکائیل فرشتہ سمجھ رہا ہے وہ قیامت آفریں اسرافیل ثابت ہو جو اپنے محشر انگیز دم سے کسی دن ساری دنیا کو ایک دم میں عدم کی نیند سلا دے گا۔ دوسری طرف

---

[1]: اگر تو عمر بھر جہان کی لذتوں سے بہرہ یاب رہے اور ساری زندگی تو اپنے محبوب کے ساتھ گذار دے لیکن جب تجھے زندگی کے آخری لمحات میں اس دنیا سے جانا پڑے گا تو یوں محسوس ہوگا جیسے زندگی بھر تو نے ایک خواب دیکھا ہے۔

اعمالِ خدا کے مشاہدے کا یہ جھوٹا مدّعی دن بدن لوگوں کو الٹا بیکاری، سستی اور جمود کی طرف لے جا رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب کہ قدرتِ الٰہی اور حکمتِ خداوندی میں یہ خواہ مخواہ کا بے جا دخیل بنی نوع انسان کو تعطل اور بیکاری کے گھاٹ اتار دے گا۔ آج اس کے ہاتھوں دنیا کا کثیر حصہ پریشان اور نالاں نظر آ رہا ہے۔ کیونکہ ہر قسم کی صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ پیشے اور دیگر تمام دستکاری کے کام جنھیں غریب اور نادار انسان سائنس کے ظہور سے پہلے اپنے ہاتھوں سے کر کے روٹی کماتے تھے آج سائنس کی بدولت مشینوں کی شکل میں سرمایہ داروں نے اپنے قبضے میں کر لیے ہیں اور غریب بیچارے بیکاری اور بے روزگاری کا شکار ہو کر بھوک سے بلک رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ سائنس کا کیا یہ تھوڑا ظلم اور ستم ہے کہ مذہب نے جو معیارِ مساوات تمام بنی نوع انسان کے درمیان بلا امتیازِ رنگ و نسل قائم کیا تھا سائنس نے اس سارے صحیح اور درست نظام کو بگاڑ کر مسخ کر دیا ہے اور تمام دنیا کا اقتصادی، معاشی، اخلاقی اور مذہبی شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ مانا کہ سائنس ایک علم اور حکمت ہے لیکن حریص نفسانی قوموں کی جوع الارض نے سائنس جیسی عزیز اور شاندار حکمت کو ایک عالم گیر لعنت بنا دیا ہے اور لعنت پر لعنت بڑھا رہی ہے۔ خلقِ خدا کی خدمت کی بجائے اسے عالم گیر ہلاکت اور تباہی کا سامان بنا دیا ہے اور دن بدن ایسی خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے کہ اس زمانے کے ان ستم شعار لوگوں کی اپنی حکمت ہی ان پر قیامت لانے کا باعث بنے گی اور انہیں تباہ اور برباد کر دے گی۔

فرض کیا کہ سرمایہ دار اقوام آج کل سائنس کے ایجاد کردہ سامانِ حرب اور آلاتِ جنگ کے ذریعے ساری دنیا کے مالک ہو گئے اور ان قارونوں اور شدّادوں نے دنیا کے تمام زرّ و جواہر جمع کر لیے اور آسائش اور آرائش اور دنیوی عیش و عشرت کے عدیم المثال سامان مہیا کر لیے ہیں اور چند روز کے لیے اپنے ہم جنس بنی نوع انسان کو اپنا غلام اور محکوم بنا لیا۔ پھر کیا ہے۔ ایسی زر خرید، عارضی چند روزہ فانی قوت اور طاقت کو خاک پائیداری ہے جس کی بناء مکڑی کے جالے اور تارِ عنکبوت کی طرح کمزور ہے۔ جسے قدرت کا مہلک و منتقم اور جابر ہاتھ ایک معمولی سی جنبش سے مٹا کر رکھ دے گا اور نیست و نابود کر دے گا۔

خون کے دریا بہے عالم تہ و بالا ہوئے
اے ستم گر کس لیے دو دن حکومت کے لیے

(نظیر اکبر آبادی)

مادے کی مردار عارضی حکومت، سائنس کی جھوٹی سلطنت اور سرمایہ داری کا باطل راج دنیا میں اس وقت رواج پاتے ہیں جب دنیا سے مذہب اور روحانیت کی سچی طاقتیں مفقود ہو جاتی ہیں اور لوگ اخلاقی ہتھیاروں سے تہی دست ہو جاتے ہیں۔ مبارک تھا وہ زمانہ جب کہ روحانیت کا سچا سلیمان وہ باطنی انگوٹھی پہنے ہوئے تھا جس پر اللہ کا اسمِ اعظم منقوش تھا جس کی بدولت تمام دنیا مذہب اور روحانیت کے زیرِ نگین تھی اور دنیا ایمان کے دائرالامان اور اسلام کے دارالسلام میں ایک عام اخوت اور عالمگیر مساوات کے تحت امن اور آسائش کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ لیکن جس روز سے وہ سلیمان اپنی باطنی انگوٹھی کھو بیٹھا تب سے مادے کے دیو لعین اور سرمایہ داری کے عفریتِ آتشیں نے عنانِ حکومت سنبھالی ہے اور اسی دن سے نفسانی اور شیطانی حکومتیں قائم ہوئی ہیں جس نے خلقِ خدا پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ سحرِ سیاست کے نت نئے کھیل کھیلے جا رہے ہیں اور آئے دن پالیٹکس کے نئے دام اور پراپیگنڈے کے نئے داؤ استعمال کیے جا رہے ہیں اور بنی نوع انسان کی غلامی اور محکومی کی زنجیریں مضبوط کی جا رہی ہیں۔ سائنس ظاہری اور مادی زیب و زینت کے سامان مہیا کر کے خلقِ خدا پر کوئی احسان نہیں کر رہی بلکہ الٹا نہیں چند روزہ فانی، نفسانی اور شہوانی و شیطانی لذات میں منہمک کر رہی ہے اور اپنے خالق مالک کی عبادت اور معرفت سے دور اور ابدی سرمدی زندگی سے غافل کر رہی ہے۔ سائنس انسان کا تعلق مادے کے خالی ڈھانچے اور مردہ مردار عارضی عنصری بدن اور چھلکے سے تو جوڑ رہی ہے مگر اس، کو تر و تازہ اور زندہ و تابندہ رکھنے والے اصل مغز یعنی روح اور روحانی دنیا سے اس کا رشتہ توڑ رہی ہے۔ مذہب اور روحانیت انسان کی ہر دو جسمانی و روحانی، ظاہری و باطنی اور دینی و دنیوی غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں ترقی کے ضامن ہیں۔ مذہب تمام مخلوق کو یکساں طور پر بموجب فرمان اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" (الحجرٰت ۴۹: ۱۰)۔ ہر مومن کو بلا امتیازِ رنگ و نسل اپنا فطری اور پیدائشی حق آزادی اور مساوات عطا فرماتا ہے اور بمصداق

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات ۴۹:۱۳) سب سے لائق فائق یعنی اہلِ قابلیت اور شرافت کو حقِ سرداری بخشتا ہے اور حکومت پر مامور کرتا ہے۔ جیسا کہ امرِ نبویؐ ہے سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوا کرتا ہے۔ مذہب اور روحانیت سے انسان اپنے خالق مالک کی عبادت، معرفت، قرب، وصال اور مشاہدہ حاصل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاک نوری اخلاق سے متخلق اور اس کی پاک منزہ صفات سے متصف ہو کر اس کے بے چون و بے چگوں، بے مثل و بے مثال اور لم یزل ولایزال ذات کے انوار میں فنا اور بقا حاصل کر کے اس کی ابدی اور سرمدی بادشاہی میں جا داخل ہوتا ہے۔ اور اس کی حی قیوم ذات کے ساتھ زندۂ جاوید ہو کر اس کے وصل مشاہدے اور دیدار سے لطف اندوز رہتا ہے۔

سائنس بذاتِ خود بری چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو ایک نفیس علم اور حکمت ہے اور ایک خیرِ کثیر ہے۔ قصور ان ظالم، سفاک، خودغرض نفسانی سرمایہ دار اقوام کا ہے جنہوں نے اس علم کو غلط اور برے راستے میں استعمال کیا ہے اور بجائے خدمت اور آسائشِ خلق کے اسے کمزور، مظلوم اور بے گناہ مخلوق کی غلامی، افلاس، تباہی اور ہلاکت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ ہم صرف ان تخریب کار عناصر کی مذمت کرتے ہیں جنہوں نے سائنس کو مذہب اور روحانیت کا حریف بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اور اسے مذہبی اور روحانی حقائق کی تائید کی بجائے تردید اور مخالفت کا ذریعہ بنایا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ دنیا ایک دن سیاست کی ان سفاکیوں، حکومت کی تباہ کاریوں اور سرمایہ داری کی ستم رانیوں سے تنگ آ کر خود بخود مذہب کے دارالامن اور روحانیت کے دارالسلام میں پناہ ڈھونڈے گی۔ اور اس زمانے کے جابر، قاہر سرمایہ دار اور ستم گر سیاست دانوں اور ڈاکو ڈکٹیٹروں کی حکومت کا جوأ گلے سے اتار کر دور پھینک دے گی۔ اور بموجب اصول اَلنِّھَایَۃُ ھُوَ الرُّجُوْعُ اِلَی الْبِدَایَۃِ "ہر چیز کی نہایت اس کی ابتدا کی طرف راجع ہو جاتی ہے" دنیا پھر ابتدائی زمانے کی طرح خادمِ خلق، مشفق، مہربان، رحم دل، سراپا رحمت وشفقت مذہبی پیشواؤں اور روحانی رہنماؤں کے دامن میں چھپ کر پناہ ڈھونڈے گی اور اصلی امن اور حقیقی چین پائے گی۔ وہ دن دور نہیں جب کہ خود سائنس اور فلسفہ عنقریب جب اپنے انتہائی عروج اور آخری کمال پر جا پہنچے گا، مادی علوم کے یاجوج ماجوج جب قافِ قلب کو سوہانِ زبان سے چاٹ چاٹ کر اور

سائنس کے تیشوں سے کاٹ کاٹ کر اس میں راستہ اور روزن نکالنے سے عاجز آ جائیں گے اس وقت ان پر اسم اللہ کے اصلی کارگر اوزار کا راز کھل جائے گا اور وہ اس سدِ سکندری پر انشاء اللہ کی ضرب کاری لگائیں گے تو دنیا اس وقت مذہب اور روحانیت کے زیر نگیں ہو جائے گی اور مادی عقل کا دجّال مسیحِ روحانیت کے ہاتھوں مغلوب اور محکوم ہو کر ہلاک اور فنا ہو جائے گا۔ تب سارا جہان مذہب اور روحانیت کی صداقت کا دم بھرنے لگے گا اور دنیا عدل و انصاف سے بہشت بریں بن جائے گی۔

انسان دو جثوں سے مرکب ہے: ایک سفلی نطفی جثہ جس کی پیدائش انسانی مادی جوہر نطفے یعنی مردار منی کے قطرے سے ہے، دوم علوی لطفی جسم جو کہ نوری لطیف جثۂ روح ہے جس کی اصل اللہ تعالیٰ نے اپنے امر سے ڈالی ہے۔ پہلا مادی کثیف گوشت اور ہڈیوں کا ڈھانچہ جثہ عالمِ خلق سے ہے۔ دوم علوی لطیف روح عالم امر سے ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (الاعراف ۷: ۵۴)۔ یعنی عالمِ خلق اور عالمِ امر ہر دو اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ جیسا کہ آیا ہے: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ (بنی اسرآئیل ۱۷: ۸۵)۔ اور ہر جثے کا میلان اور رجوع اپنی اصل کی طرف ہوتا ہے کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِهٖ۔ سفلی مادی جسم کی ترکیب اور بناوٹ چونکہ مادی دنیا کی اشیا اور مادی عناصر سے ہے اس لیے اس کا میلان بھی دنیا اور مادی غذاؤں کے استعمال کی طرف رہتا ہے جو کہ عام حیوانات کا خاصہ ہے۔ ان سب سفلی مادی غذا والوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دَآبَّةٍ یعنی حیوان کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود ۱۱: ۶)۔ یعنی نہیں ہے زمین میں کوئی حیوان مگر اس کا رزق اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اور دوسرے علوی لطفی لطیف جثۂ روح کی اصل عالمِ بالا یعنی آسمان اور عالمِ غیب و عالمِ امر سے ہے۔ اور اس جثۂ لطیف روح کی خواہش اور طلب اپنی اصلی روحانی اور آسمانی غذا کی طرف رہتی ہے۔ اس واسطے اس رزق کا ذکر ایک علیحدہ آیت میں یوں کر دیا ہے۔ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ (الذّٰریٰت ۵۱: ۲۲)۔ یعنی تمہارا وہ نوری لطیف رزق آسمان میں ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ صحیح طور پر موت کے بعد ملے گا۔ جس طرح اس مادی جسم اور نفس کی خواہش اور طلب مادی اشیا مثلاً کھانے، پینے، پہننے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی طرف لگی

رہتی ہے اسی طرح دوسرے باطنی علوی جثے کی رغبت اور خواہش اپنی آسمانی اور ملکوتی غذاؤں یعنی ذکر، فکر، عبادت، طاعت، خیرات، صدقات اور اعمالِ صالحہ کی جانب لگی رہتی ہے۔

کیونکہ جملہ عالمِ غیب، ملائکہ اور ارواح کی غذا اللہ تعالیٰ کے ذکر فکر، تسبیح وتہلیل اور اپنے خالق مالک کی تقدیس، تحمید، تکبیر، تلاوت کلام اللہ دعوات اس کی معرفت، قرب، وصال اور مشاہدے اور دیگر اعمال صالحہ اور اعمالِ حسنہ کے انوار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے۔ اِذَامَرَرْتُمْ بِرِیَاضِ الْجَنَّۃِ فَارْتَعُوْا۔ یعنی "جب تم بہشت کے باغوں پر گذرو تو ان میں چرنے لگ جایا کرو۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ بہشت کے باغ کیا ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر کی مجلسیں اور حلقے۔ غرض اس علوی آسمانی لطیف جثے کی فطرت اسلام پر واقع ہوئی ہے اور یہی جثہ اپنے اندر دینی اور اسلامی استعداد ازل سے رکھتا ہے اور اسی فطرت اور استعداد کو صحیح اور سلامت رکھنے اور تبدیل نہ کرنے اور اسے پرورش اور تربیت دینے اور اسے پایۂ تکمیل اور درجۂ اتمام تک پہنچانے کا نام اسلام، ایمان، ایقان، عرفان، وصال، مشاہدہ، عشق، فنا اور بقا ہے۔ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (التحریم ۶۶: ۸)۔ ترجمہ: "اے رب ہمارے! تکمیل اور اتمام تک پہنچا ہمارے لیے ہمارے نور کو، اور ہمارے گناہ معاف کردے، تحقیق تو ہر چیز پر قادر اور توانا ہے۔"

انسان کا یہ سفلی عنصری جسم علوی لطیف جثۂ روح کے لیے بمنزلۂ پوست یا چھلکے کے ہے اور اس مادی دنیا میں اس کے رہنے سہنے، چلنے پھرنے اور کام کرنے کا مرکب اور سواری ہے۔ سفلی نطفی ناسوتی جسم کا محل پیدائش اور جائے استقرار انسانی وجود کے مقامِ اسفل اور عضوِ ارزل میں واقع ہے اور اس کا تولد وتناسل بھی انسان کے خبیث اور رذیل ترین مقام میں ہوتا ہے۔ اس مقام میں ابلیس مع اپنے جنودِ خبیثہ اور سلاح وہتھیارِ شیطانی مثلاً اوصافِ رذیلہ اور اخلاقِ ذمیمہ ڈیرے ڈالے رہتا ہے۔ انسان کا یہ جثۂ نفسِ امارہ شیطان کے موافق احکامِ الٰہی اور ارکانِ مذہب کے خلاف نری برائی پر ہمیشہ آمادہ اور مستعد رہتا ہے۔ اس کے خلاف انسان کا لطیف علوی جثۂ روح جس وقت وجود میں زندہ اور بیدار ہو جاتا ہے تو ہر وقت نیک اعمال، ذکر فکر، طاعت عبادت کی طرف مائل اور راغب رہتا ہے اور ہر وقت نفس کو نیکی کا اعلام اور الہام کرتا ہے اور اسے برائی پر ملامت کرتا ہے۔ اس لیے ایسے نفس کو ملہمہ

اور لوامہ کہتے ہیں۔ نہیں دیکھتے کہ اس لطیف نوری وجود کا مقامِ ورود و استقرار انسان کا مقامِ اعلیٰ و اشرف یعنی دل و دماغ ہے۔ اور اس کا نزول مقامِ بالا آسمان سے ہے۔ اور جب وہ مکمل اور تیار ہو جاتا ہے تو ملاء الاعلےٰ اور ملائکہ اس کی تعظیم کے لیے جھکتے ہیں اور اس وجودِ مسعود کا ادب اور احترام کرتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ٥ (الحجر ۱۵ : ۲۹)۔ ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں آدم کے وجود کو تیار کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کی تعظیم و تکریم کے لیے جھک جاؤ۔'' خود قلبِ صنوبری کی ساخت اور بناوٹ ہی اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ ایک آسمانی اور عالمِ بالا سے اتری ہوئی چیز ہے کیونکہ مضغۂ قلب کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اس کا تیر کی طرح باریک سرا نیچے کی طرف لٹکا ہوا نظر آتا ہے اور اس کے موٹے تنے اور شکم کے ساتھ دو موٹی رگیں دو جڑوں یا ٹانگوں کی طرح پیچھے سے لگی ہوئی ہیں۔ پس ان دو علوی و سفلی، ملکوتی و ناسوتی اور لطیف و کثیف جثوں کے درمیان انسانی وجود میں آزمائش کے طور پر لڑائی اور جھگڑا واقع ہوا ہے۔ اور جو جثہ غالب آ جاتا ہے اس کی حکومت اور مملکت وجودِ انسانی میں قائم ہو جاتی ہے۔ اَلْمُلْكُ لِمَنْ غَلَبَ ؕ قولہ تعالیٰ: اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ق نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ٥ (الدھر ۷۶ : ۲)۔ یعنی ''ہم نے انسان کو ملے جلے اور مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کی آزمائش کریں اور اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا ہے''۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (الملک ۶۷ : ۲)۔ ترجمہ: ''وہ ہے اللہ تعالیٰ جس نے موت اور زندگی کو مقرر اور مقدر کیا تا کہ تمہارا امتحان لے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے''۔ غرض انسانی وجود میں دو متضاد اور مخالف، نیک اور بُرے اور لطیف و کثیف جثوں کے درمیان امتحاناً جنگ اور جھگڑا واقع ہوا ہے۔ اس سفلی نطفی جثے کی باطنی مثالی صورت حیوان اور دابہ کی ہے جس کو نفسِ بہیمی کہتے ہیں۔ اور بسبب اپنی سفلیت اور دنائیت شیطان کا قرین اور جلیس ہے۔ شیطان اسی کی رفاقت سے انسان کو معصیت اور گمراہی کے گڑھے میں ڈالتا ہے اور علوی لطیف جسم کی باطن میں ایک لطیف نوری شکل فرشتے کی سی ہے جسے روحِ مقدس اور نفسِ مطمئنہ بھی کہتے ہیں۔ یہ جثہ بسبب اپنی لطافتِ باطنی اور نورانیت فرشتے کے ہم جنس ہے۔

عالمِ غیبی اور ملکوت سے اس وجودِ مسعود کو نیکی کی ہدایت اور تائید پہنچتی ہے۔ انسان ہر دو جشوں کا معجون مرکب ہے۔

آدمی[1] زادہ طرفہ معجونیست
از فرشتہ سرشتہ و زحیواں

(سعدیؒ)

ترجمہ: آدمی زادہ ایک عجیب معجون مرکب ہے، جو مبارک فرشتہ اور حیوان سے بنا ہے۔

نفسِ بہیمی کی قوت مادی غذاؤں اور قوت اخلاقِ ذمیمہ سے ہوتی ہے اور اس کا داعی اور مدعی شیطان لعین ہے۔ اور نفسِ مطمئنہ اور روح کے لطیف جثے کی قوت اور غذا ذکر فکر، طاعت، عبادت اور قوت و طاقت اخلاقِ حمیدہ اور اعمالِ حسنہ ہیں۔ اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ ؕ (فاطر ۳۵: ۱۰) اور ارواح کے ہادی اور راہبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور دیگر انبیاء اور مرسلین اور اولیائے مقربین اور علمائے عاملین ہیں۔ اور یہ ہر دو خیر و شر کے داعی مع ساز و سامان اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ وَالۡقَدۡرِ خَیۡرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی کے یہی معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کے باعث بھی روزِ اوّل سے انسانی وجود میں روح اور نفس کی صورت میں پیدا کر دیئے ہیں۔ اور خیر و شر کے سامان اور اسباب بھی خارج میں بشکل لذات و شہواتِ نفسانی اور زیب و زینت دنیائے فانی اور باطن میں درجات و مراتب اور حظوظِ روحانی اور لذات و نعم اخروی و جاودانی بھی مہیا کر دی ہیں اور ہر دو طرف کے داعی یعنی خیر اور شر کی طرف بلانے والے بھی مامور اور مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اپنی کتابیں نازل فرما کر خیر اور شر کے راستے بتا دیئے ہیں اور شر سے بچنے اور خیر کی طرف جانے کا حکم فرما دیا ہے اور ان کے طور طریقے واضح طور پر بیان فرما کر اپنی حجت تمام کر دی ہے۔

اب انسان امتحاناً مخیّر اور فعل مختار ہے خواہ شر اور بدی کے راستے پر چل کر جہنم میں جائے خواہ خیر اور نیکی کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر بہشتِ بریں میں داخل ہو۔ فَمَنۡ

---

[1] یعنی اس کا خاکی جسم تو حیوانوں کا سا ہے لیکن اس کا روحانی جثہ فرشتوں کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور فرشتوں کی سی صفات رکھتا ہے۔

شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ط(الکھف ۱۸: ۲۹) اللہ تعالیٰ کی ذات پر انسان کے برے یا اچھے فعل کرانے کا کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔

مادی غذا اور ظاہری خوراک کو تو ہر شخص سمجھتا ہے لیکن ذکر، فکر، طاعت، عبادتِ الٰہی اور اعمالِ صالحہ وغیرہ کی باطنی، قلبی اور روحانی غذاؤں کو محض مثالوں اور استعاروں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سو واضح ہو کہ مادی دنیا میں جب انسان کام کاج اور ظاہری کسب اور معاش کے حصول سے عاجز رہ جاتا ہے تو اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور مناسب غذا کے نہ ملنے سے پریشان حال، کمزور، بیمار اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روحانی دنیا میں جب دل کا لطیف جثہ اپنی باطنی غذا کے کسب اور کمائی سے روک دیا جاتا ہے اور ذکر فکر، طاعت، عبادت وغیرہ سے محروم رکھا جاتا ہے تو اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور آخر ضعیف و ناتواں اور بیمار ہو کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴)۔ ترجمہ: ”جو شخص میرے ذکر سے اعراض اور کنارا کرتا ہے تو اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور ہم قیامت کے روز یعنی دوسری زندگی میں اسے اندھا کر کے کھڑا کریں گے۔“ اس آیت میں اعراضِ ذکر یعنی ذکر اللہ سے کنارہ کشی کا نتیجہ ظاہری دنیوی تنگی اور افلاس ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اللہ کے ذکر اور عبادت سے اعراض اور کنارہ کرنے والے اکثر دنیا میں عیش و عشرت اور ناز و نعمت کی زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کلامِ حق نظام میں سخت اشکال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ رزق اور روزی دو طرح کی ہے: ایک جسمانی دوم روحانی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مختلف آیتوں میں دونوں قسم کے رزقوں کا ذکر الگ الگ بیان فرمایا ہے۔ یعنی جسمانی غذا والے حیوانوں کا ذکر اس آیت میں بیان فرمایا ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود ۱۱: ۶)۔ اور اس روحانی اور آسمانی غذا کا ذکر اس آیت میں فرمایا ہے: وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ (الذّٰریٰت ۵۱: ۲۲)۔ سو جس طرح انسان کو مادی دنیا کے اندر فقر و فاقہ اور بھوک و افلاس سے پریشانی لاحق ہوتی ہے اور جب انسان کی روزی فراخ ہو جاتی ہے اور اس کا دل سیر ہو جاتا ہے تو وہ باجمعیت اور مطمئن ہو جاتا ہے اسی طرح باطنی دولت اور روحانی غذا کی فراوانی سے انسان کا باطن یعنی دل سیر

اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرعد ۱۳: ۲۸) ۔ یعنی ”خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔“ اور یہ اطمینانِ قلبی کسی قدر معمولی اہلِ ذکر فکر اور اطاعت و عبادت گذار لوگوں کو صاف طور پر معلوم اور محسوس ہوتا ہے۔ جس دن انسان رات کو وظیفہ ذکر فکر عبادت وغیرہ ادا کرتا ہے تو طبیعت ہشاش بشاش اور خوش وخرم اور دل لطف و سرور سے لبریز رہتا ہے۔ گھر میں خواہ کچھ بھی نہ ہو اور خالی ہاتھ ہو لیکن دل اس قدر قانع اور مستغنی ہوتا ہے کہ گویا سب کچھ حاصل ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ ذکر اللہ اور اطاعتِ الٰہی سے بے بہرہ اور محروم ہیں باوجود دولت و ثروت کے سخت پریشان خاطر اور بے جمعیت رہتے ہیں۔ اور برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کے راستے کے سالک عارف محض باطنی دولت کی بدولت دائم خرسند، ہمیشہ مسرور اور ابدالآباد تک مطمئن رہتے ہیں۔ خواہ ان کے پاس دولتِ دنیا کا ایک دام اور متاعِ دنیا کا ایک حبہ تک بھی نہ ہو۔

..........................○..........................

# حقیقتِ دُنیا

دنیا کی مادی غذا سے ایک وقت کے لیے ہم مادی پیٹ تو بھر سکتے ہیں لیکن دل کا وسیع بطنِ باطنی اس متاعِ قلیل سے سیر نہیں ہو سکتا۔ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے متاعِ قلیل فرما کر اس کی قلت، علت اور ذلت کو الم نشرح اور آشکارا کر دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ (النسآء ۴: ۷۷)۔ دنیا کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو یہ مع جملہ سامانِ عیش و عشرت ایک بہت ہی حقیر اور ذلیل چیز ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی قدر و قیمت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو دنیا میں پانی کا ایک گھونٹ بھی نصیب نہ ہوتا۔ لیکن دنیا آخرت کے نعیمِ جاودانی کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر سے بھی زیادہ ناچیز اور حقیر ہے۔ اب ہم دنیا کی حقیقت کو تھوڑا سا واضح کرتے ہیں۔ اوّل تو دنیا کی لذت کم مقدار اور ناپائدار ہے۔ دوم اس میں انسان کی عمر بہت کوتاہ اور تھوڑی ہے اور اس کے حصول کے لیے سر دردی، محنت اور دکھ بہت زیادہ اور راحت و آرام بہت تھوڑا ہے۔ دنیا کی تمام متاع یا خوردنی یا آشامیدنی یا بوئیدنی یا پوشیدنی یا شنیدنی ہیں۔ خوردنی یعنی کھانے کی چیزوں کی ماہیت پر اگر غور کیا جائے تو ان میں سے بہترین اشیا یا تو حیوانوں کا خون یا اس کا نچوڑ اور فضلہ ہے مثلاً گوشت، گھی اور دودھ وغیرہ یا کھاد اور گندگی کی پیداوار ہیں مثلاً ترکاریاں، اجناس اور میوہ جات وغیرہ۔ کھاد اور گندگی جو زرعی اشیا کی خوراک اور ضروری جزو ہے وہ حیوانات کا متعفن پاخانہ ہے۔ قولہ تعالیٰ: نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ (النحل ۱۶: ۶۶)۔ یعنی ''حیوان تم کو وہ چیز جو ان کے گوبر اور خون کے درمیان سے نکلا ہوا فضلہ یعنی دودھ پلاتے ہیں''۔ آشامیدنی یعنی پینے کی چیزوں میں سب سے بہترین اور لذیذ ترین چیز شہد ہے جو ایک ناچیز مکھی کے لعابِ دہن کی آمیزش سے بنا ہے۔ بوئیدنی یعنی سونگھنے کی چیزوں میں سب سے اعلیٰ اور افضل مشک کستوری ہے جو ایک حیوان یعنی ہرن کی ناف کا منجمد خون اور میل کچیل ہے۔ اور پوشیدنی یعنی پہننے کی چیزوں میں سب سے نفیس ترین چیز ریشم ہے اور وہ ایک کیڑے کا فضلہ ہے۔ اور شنیدنی یعنی سننے کی جملہ لذات اور سامانِ سرود و سماع جانوروں

کے چمڑوں اور ان کی رگوں اور رودوں کی رگڑ اور ضربوں سے ماخوذ ہیں۔ دنیا میں ایک اور لذتِ مساس بھی ہے۔ جس کا ذکر کرنا خلاف تہذیب ہے۔ لیکن اتنا کافی ہے کہ وہ انسان کے اسفل اور ارذل ترین اور بدتر مردار ترین عضو کا استعمال ہے۔ غرض دنیا کی جملہ متاع اور لذات کے ماخذ یہی ہیں جو ہم نے گن گن کر بیان کر دیئے ہیں۔

حال[۱] دنیارا بپر سیدم من از فرزانۂ گفت یا خوابیست یا وہمیست یا افسانۂ
باز پرسیدم ز حالِ آنکہ دل دروے بہ بست گفت یا دیویست یا غولیست یا دیوانۂ

اب ذرا اُن کی مدت اور مقدارِ لذت بھی ملاحظہ ہو۔

دنیا کے تمام لذیذ اور عمدہ کھانے جب تک نوکِ زبان پر ہیں تو محض چند سیکنڈ کے لیے سرِ زبان کو ایک نہایت خفیف سی لذت بھوک کی حالت میں محسوس ہو رہی ہوتی ہے۔ لیکن جب شکم پُر ہوا اور طبیعت سیر ہوئی تو وہ خفیف سی لذت بھی مفقود ہے۔ اور وہی نگلی ہوئی غذا دل کا بوجھ اور وبالِ جان بن جاتی ہے۔ اسی طرح تمام لذاتِ جسمانی کی مدتِ لذت بالکل قلیل اور اس کا محاذ بہت تنگ ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے تمام متاعِ دنیا کو قلیل کہا ہے۔ پھر اس ناپائدار، حقیر اور فانی متاع کے حصول کے لیے کس قدر خاک رانی، سر دردی اور جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ اور کس قدر ظلم و ستم ڈھائے جاتے ہیں اور کتنے مظلوموں کا خون بہایا جاتا ہے۔ لذاتِ دنیا کا ایک ہیچ اور پوچ پہلو اور بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقدارِ لذت مفلس اور دنیادار کے لیے برابر رکھ دی ہے۔ دنیادار روزمرہ اچھے لذیذ طعام کھانے، ہر وقت نفیس کپڑے پہننے، سربفلک عالیشان عمارتوں میں دن رات رہنے، خوب صورت عورتوں سے ہمیشہ ہم صحبت رہنے، غرض دنیا کے تمام لذائذ اور حظوظ میں ہر لحہ اور ہر لحظہ محو اور منہمک رہنے سے ان چیزوں کے بہت عادی اور خوگر بن جاتے ہیں۔ اس لیے ان چیزوں میں ان کی اشتہا اور ذوق و ذائقہ بالکل کم بلکہ تقریباً زائل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اصل ذائقہ فاقہ میں ہے اور وہ ان کے ہاں مفقود ہوتا ہے۔ اور غریب و نادار لوگ بسبب شدتِ فاقہ

---

[۱] میں نے کسی دانا سے دنیا کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے کہا یہ دنیا ایک خواب ہے یا وہم ہے یا افسانہ ہے۔ پھر میں نے اس شخص کے حال کے متعلق پوچھا جس نے دنیا سے دل لگا لیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ شخص کوئی دیو یا بھوت یا دیوانہ ہے۔

اور حدتِ جوع روکھی سوکھی میں وہ لذت پاتے ہیں جو امیروں اور دنیاداروں کو طرح طرح کے لذیذ کھانوں اور غذاؤں میں میسر نہیں ہوتی۔ غرض کھانے کا لطف قوتِ ہضم اور مقدارِ اشتہا پر موقوف ہے اور وہ دنیاداروں میں مفقود ہوتا ہے۔ یہ نعمتِ غیر مترقبہ بدرجۂ کمال ناداروں کو مفت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح دنیادار اور سرمایہ دار رات کے وقت اپنے عالی شان، ہوادار محلات اور نرم بستروں پر دنیا کے افکار اور حوادثِ روزگار میں سرشار ساری رات بے چین اور بے آرام ہو کر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک غریب مزدور دن بھر کا تھکا ماندہ محنت مشقت سے چور بے بستر اور بے بالین ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر ایسی گہری اور خوشگوار نیند سوتا ہے کہ اس کی ساری رات ایک ہی پہلو پر لیٹے گذر جاتی ہے۔ دنیادار ساری عمر ایک لمحہ کی خوشگوار نیند اور ایک لحظہ کی حقیقی بھوک کو ترستے رہتے ہیں۔ اسی طرح قوتِ جماع میں بھی دنیادار صفر پائے جاتے ہیں اور باوجود تین چار بیویوں کے اولاد سے محروم رہتے ہیں۔ غرض اس پر تمام حظوظ اور لذات کو قیاس کر لینا چاہیے۔ غریب اور نادار فائدے میں ہیں۔ دنیاداروں کو اطمینانِ قلب ہرگز میسر نہیں ہوتا بلکہ جس قدر کوئی شخص دنیادار مالدار ہوتا جاتا ہے اس کی پریشانی اور بے اطمینانی بڑھتی جاتی ہے۔ اگر بالفرض مادی دنیا کی تمام دولت اور عیش و عشرت کے تمام سامان ایک ہی شخص کو حاصل ہو جائیں تو بھی دل کا چین اور اطمینانِ قلب اسے ہرگز حاصل نہیں ہوگا۔ بڑے بڑے دولت مندوں، امیروں اور تاجروں حتیٰ کہ نوابوں اور راجاؤں اور بادشاہوں تک سے جا کر پوچھو کہ تمہارے پاس خدا کا دیا ہوا سب کچھ موجود ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ کھانے کو عمدہ لذیذ غذائیں اور میوے ہر وقت تیار موجود ہیں، پینے کو میٹھے اور ٹھنڈے شربت ہیں۔ پہننے کو نرم اور نفیس کپڑے ہیں۔ رہنے کو عمدہ، خوب صورت اور عالی شان مکان ہیں۔ سیر و سیاحت اور سواری کے لیے عمدہ گھوڑے، تانگے، اور موٹر ہیں۔ باغ، چمن، کھیل، تماشے ریڈیو، سینما، ناچ و رنگ اور رقص و سرود کے سامان ہر وقت حاصل ہیں۔ خوب صورت عورتیں اور غلام خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ غرض تمہاری دنیا کی تمام مرادیں پوری اور عیش و عشرت کے سامان مہیا ہیں۔ اگر ان سے سوال کرو کہ کیا ان تمام عیش و عشرت، ناز و نعمت اور آسائش و راحت کے باوجود تم حقیقی طور پر خوش ہو اور کیا تمہارا دل مطمئن ہے تو

تقریباً سب کے سب یہی جواب دیں گے کہ وہ ہرگز اس دنیا میں خوش نہیں ہیں۔ وہ یہی کہیں گے کہ گو ہمارے جسم عیش و عشرت اور ناز و نعمت میں لوٹ رہے ہیں مگر ہمارے سینوں میں خدا جانے کیوں بلا وجہ دل افسردہ اور خاطر پژمردہ ہے۔ ہم اپنے دل میں ہر دم ایک بے وجہ لازوال ملال اور ایک نامعلوم قلق محسوس کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تم ضرور قلب کی بے اطمینانی اور دل کی پریشانی سے شاکی و نالاں پاؤ گے۔ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں دل کی غذا مفقود ہے۔ اس لیے گو ان کے پیٹ سیر ہیں لیکن دل اپنی مخصوص غذا ذکر اللہ سے محروم ہے۔ اس لیے وہ بے اطمینان رہتا ہے۔ جن اقوام میں دل کی غذا مفقود ہے اور جہاں الحاد، دہریت اور مادہ پرستی کا دور دورہ ہے اور جس سرزمین میں روحانی قحط برپا ہے وہاں کے غنی اور سرمایہ دار لوگ باوجود عیش و عشرت، اور جاہ و ثروت کے دل کی بے اطمینانی سے سخت طور پر نالاں ہیں۔ یورپ میں اس بے اطمینانی کا ایک عالم گیر ماتم برپا ہے۔ اہلِ فرنگ اور اہلِ امریکہ جنہوں نے دولت کی فراہمی میں قارون کو بھی مات کیا ہوا ہے اور تمام دنیا سے سرمایہ داری میں گوئے سبقت لے گئے ہیں اس دل کے بے اطمینانی سے چیخ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں باوجود کمال دولت اور سامانِ عیش و عشرت جس کثرت سے خودکشی کی وارداتیں ہو رہی ہیں افلاس زدہ اور نادار ممالک میں ان وارداتوں کا عشرِ عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ خصوصاً مسلمان قوم جو دنیوی حالت میں تمام قوموں سے پست تر اور کم تر ہے خودکشی کی بہت کم مرتکب ہوتی ہے۔ وجہ صاف معلوم ہے کہ اگرچہ مسلمانوں نے اپنے مذہبی احکام اور دینی ارکان بہت حد تک ترک کر دیئے ہیں اور ان کی قلبی اور روحانی غذاؤں یعنی ذکر فکر، نماز، روزہ، طاعت اور عبادت وغیرہ میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے مگر پھر بھی اسلام ایک ایسا حاوی، محیط اور ہمہ گیر مذہب ہے کہ اس پاک مذہب کے اثرات ایک مسلم کے مہد سے لیکر لحد تک تمام زندگی کے حرکات و سکنات اور اعمال و افعال میں جاری اور ساری رہتے ہیں۔ اسلیے مسلم بندہ خواہ کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہ ہو وہ خواہ مخواہ بے ارادہ اپنی قلبی اور روحانی غذا میں سے تھوڑا بہت حصہ لے ہی لیتا ہے۔ اور چاہے اسے مادی دولت اور دنیوی راحت سے محروم ہی کر دیا جائے پھر بھی وہ قلبی اور روحانی غذا کے سہارے اپنے آپ کو سنبھالے رہتا ہے اور سخت مضطرب و پریشان ہو کر آپے سے باہر نہیں ہوتا اور خودکشی نہیں کرتا۔ مگر اس کے

برعکس کفار نابکار کی دنیوی حالت میں جب کبھی قدرے انقلاب رونما ہو جاتا ہے اور دنیوی عیش و عشرت میں زوال آ جاتا ہے تو مکڑی کے جالے کی طرح ان کے نفس کے کچے تار بکھر جاتے ہیں اور ان کے حبابِ زندگی کا خام خیمہ جو محض پانی کے ایک قطرے اور صرف ہوائے نفس کے سہارے قائم ہوتا ہے حوادثِ دنیا کی بادِ مخالف کی تاب نہ لا کر فوراً ٹوٹ جاتا ہے اور درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودکشی کے اکثر وہی لوگ زیادہ مرتکب ہوتے ہیں جن کی مذہبی اور دینی حالت نہایت ناقص اور پست ہوا کرتی ہے اور جن کے دل دینی استعداد اور باطنی غذا سے محروم ہوتے ہیں۔ یورپ جو کہ الحاد اور دہریت کا معدن ہے اور روحانی طور پر سخت قحط زدہ علاقہ ہے اور اکثر بے اطمینانئ قلب کی وجہ سے زندگی سے تنگ آیا ہوا ہے اور سخت پریشان ہے ان میں سے بعض نے تو اپنی پریشانی اور بے اطمینانی کا یہاں تک مظاہرہ کیا ہے کہ آپے سے باہر ہو کر پاگلوں اور دیوانوں کی طرح کپڑے اتار لیے ہیں اور بالکل ننگ دھڑنگ ہو گئے ہیں۔ انہیں نفیس اور زرّین لباسوں میں اطمینانِ قلب نصیب نہیں ہو سکا۔ یہ سب قلبی بے اطمینانی اور باطنی بے چینی کی علامات اور اثرات ہیں جو مختلف صورتوں میں ان سرمایہ دار اقوام سے صادر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے اندر اس باطنی قلبی مرض کی بے چینی اور قلق محسوس کر رہے ہیں اور اس کے علاج میں دیوانوں کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مگر ان کی مادی سعی ظاہری کوششیں، بیرونی دوڑ دھوپ اور سطحی تگ و دو بالکل بے سود ہے۔

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

(مومنؔ)

دراصل اس مرض کی دوا محض ذکر اللہ ہے۔ لیکن یہ دوا اس سرزمین میں عنقا کی مانند کم یاب اور مفقود ہے۔ اس لیے سوائے ذکر و عبادت کے ان کے تمام مادی علاج معالجے اور ظاہری تگ و دو میں سعی اور کوشش بالکل بے سود ہے۔

حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے ایک دن اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ اے اللہ! مجھے دنیا اپنی اصلی صورت اور حقیقی رنگ میں دکھا دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تجھے دنیا اپنی اصلی شکل میں عنقریب دکھا دوں گا۔ چنانچہ ایک روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنگل میں جا رہے تھے کہ

انہیں دور سے ایک برقعہ پوش عورت نظر آئی جس کا برقعہ ریشمی بیل بوٹوں اور زردوزی کام سے زرق برق آفتاب کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں قیاس کیا کہ ایسے حسین اور زرق برق زرّین برقعے کے اندر ضرور کوئی ماہِ طلعت حور ملبوس ہوگی۔ وہ برقعہ پوش عورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے آئی اور جونہی اس نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھایا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر حیران اور ششدر رہ گئے کہ اس زرق برق نقاب کے اندر سے ایک بہت بوڑھی اور سخت مکروہ، بدصورت اور نہایت ڈراؤنی بدشکل ،سیاہ فام ژولیدہ مو عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ جس کے دیکھنے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ اے عجوزہ! تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا "میں دنیا ہوں۔" آپ نے اس سے پوچھا اے عجوزہ! اس مکروہ، بدنما اور قبیح صورت پر یہ زرق برق خوب صورت زرّین لباس کیوں؟ اس نے جواب دیا اس ظاہری لباس سے تو میں لوگوں کو اپنے اوپر فریفتہ اور شیدا کرتی ہوں ورنہ میری اصلی اور حقیقی صورت یہی ہے جو تو دیکھ رہا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے جب اس کے ہاتھوں کی طرف دھیان کیا تو اس کا ایک ہاتھ خون سے آلودہ تھا اور اس سے خون ٹپک رہا تھا اور دوسرا ہاتھ حنا یعنی مہندی سے رنگا ہوا تھا۔ آپؑ نے اس سے دریافت کیا کہ تیرا ایک ہاتھ خون سے کیوں آلودہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ جو میرا شوہر اور خاوند بنتا ہے میں اسے فوراً قتل کر ڈالتی ہوں۔ ابھی ایک شوہر کو تازہ قتل کر آئی ہوں۔ یہ ہاتھ اسی کے خون سے آلودہ ہے۔ آپؑ نے پوچھا کہ یہ دوسرا ہاتھ مہندی سے کیوں رنگین ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اب ایک دوسرے شوہر کی دلہن بن رہی ہوں۔ آپ نے متحیر ہو کر سوال کیا کہ تیرے نئے شوہر کو تیرے اس خون آلودہ ہاتھ سے عبرت حاصل نہیں ہوتی؟ اس نے جواب دیا اے عیسیٰؑ! تو اس بات سے تعجب نہ کر کہ میں ایک گھر کے اندر ایک بھائی کو قتل اور ہلاک کر دیتی ہوں اور اسی وقت دوسرا بھائی مجھے لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ غرض اس قسم کی بہت عبرت ناک اور نصیحت آموز سوال و جواب عجوزۂ دنیا اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان ہوئے جس سے حضرت عیسیٰؑ پر دنیا کی اصلی حقیقت کھل گئی۔ اکثر باطن بین اور حقیقت شناس اہل اللہ لوگوں کو دنیا اپنے اصلی رنگ اور حقیقی روپ میں نظر آتی ہے اور ظاہر بین کور چشم بوالہوس نفسانی لوگ اس کے ظاہری لباس پر مرتے

ہیں اوراس کے ہاتھوں ہلاک اورقتل ہو جاتے ہیں۔

عارفے خواب رفت در فکرے　　دید دنیا بصورت بکرے
کردازوے سوال کائے دلبر　　بکر چونی بایں ھمہ شوہر
گفت یک حرف باتو گویم راست　　کہ مرا ہر کہ بود مرد نخواست
وانکہ نامرد بود خواست مرا　　زاں بکارت ہمیں بجاست مرا

ہم ذیل میں دنیا کے چند بڑے بڑے سرمایہ داروں اور دنیا داروں کے حسرتناک انجام اورعبرت ناک خاتمے کے چند واقعات بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی سلیم العقل، نیک بخت اور سعادت مند انسان اس سے سبق اور عبرت حاصل کرے اوراس خونخوار، مکار عجوزہ کے دام سے بچے۔

## ایک کروڑ پتی انسان کا عبرت ناک بیان

"میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اس کا حساب بھی نہیں کرسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ میری جائیداد پانچ کروڑ پاؤنڈ (۷۵ کروڑ روپے) سے زیادہ ہے۔ لیکن یہ ساری جائیداد دینے کو میں بخوشی تیار ہوں اگر ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھا سکوں۔" یہ الفاظ امریکہ کے مشہور کروڑ پتی "شاہِ روغن" راک فیلر کی زبان سے نکلے ہیں جس کی دولت وثروت کے افسانے نئی دنیا اور پرانی دنیا دونوں کے گوشہ گوشہ میں زبان زدِ خاص وعام ہیں۔ ایک دنیا آج تک اس کی قسمت پر رشک کر رہی ہے اور خدا جانے کتنے ایسے ہیں جن کے منہ میں اس کا نام سن کر پانی بھر آتا ہوگا۔ لیکن خود اس بچارے کا یہ حال ہے کہ باوجود اس امیری کے مفلس اور لاچار ہے۔ اور باوجود اس افراطِ سیم وزر کے ایک وقت پیٹ بھر کھانے کی حسرت رکھتا ہے اوراس نعمت کے آگے اپنے کروڑوں پونڈوں کے ڈھیر پر لات مارنے کو تیار ہے۔ اس کی عمر پچاسی سال کی ہو چکی لیکن اسے شروع ہی سے سوءِ ہضم کی بیماری رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے اپنے علاج پر کیا کچھ نہ خرچ کیا ہوگا۔ بایں ہمہ بجز تھوڑے سے دودھ اور بسکٹوں کی قلیل مقدار کے دن بھر کچھ نہیں کھا سکتا۔ حالانکہ اس کے ادنیٰ مزدور اور نوکر چاکر دن بھر پیٹ بھر بھر کر کئی بار دنیا کی نعمتیں اور لذیذ غذائیں کھاتے ہیں۔ یہ لاکھوں انسانوں کی

قسمت کا مالک ایک وقت پیٹ بھر حسب دلخواہ کھانے کو ترستا ہے اور بغیر تھوڑے سے دودھ اور چند بسکٹوں کے اور کسی چیز کو چھو تک نہیں سکتا۔

دنیا کی زندگی پر رشک کرنے والے غریبو! اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکریہ ادا کرو کہ دنیا کا متمول ترین انسان خود تمہاری حالت پر رشک کر رہا ہے۔

## ہنری فورڈ کی حالت

ایک دوسرے امریکی ''شاہ موٹر'' ہنری فورڈ کا حال سنو جس نے اپنی دولت میں قارون کو بھی مات کیا ہوا ہے۔ وہ ایک معمولی سی قلیل مقدار میں پرہیزی غذا کے بغیر اور کچھ نہیں کھا سکتا۔ ڈاکٹرں کی ایک جماعت ہر وقت اس کی نگرانی میں لگی رہتی ہے۔ وہ تمام لذتوں سے یکسر محروم ہے۔ حالانکہ اس کے ادنیٰ غلام اور نوکر چاکر اس کی آنکھوں کے سامنے عیش وعشرت کرتے ہیں اور وہ انہیں دیکھ کر ترستا ہے۔ جاننے والوں کا بیان ہے کہ دولت وثروت سے جتنے لطف انسان اس مادی دنیا میں اٹھا سکتا ہے اور جو لذتیں روپیہ سے خرید سکتا ہے ان سب سے یہ قارونِ وقت یکسر محروم ہے۔ دولت کو حاصلِ عمر اور روپیہ کو ثمرۂ زندگی سمجھنے والو! زر و دولت کی اس لاحاصلی کو دیکھ رہے ہو؟

## مسٹر ایڈورڈ کرپس

امریکہ میں ایک کروڑ پتی اور مالکِ اخبارات مسٹر ایڈورڈ کرپس تھے۔ سالہا سال کی عیش وعشرت کے بعد اس کا دل دنیا کے ہنگاموں سے سرد ہوگیا اور اسے سکون ویکسوئی کی تلاش پیدا ہوئی۔ تہذیب وتمدن کے مرکزوں میں یہ بات کہاں نصیب؟ بالآخر چالیس لاکھ ڈالر کے صرف سے ایک جہاز بنوایا اور آلات کی مدد سے اسے ہر قسم کی آوازوں سے محفوظ کر لیا۔ یعنی کوئی ہلکی سے ہلکی آواز بھی کانوں تک نہ پہنچ سکتی تھی اور اسطرح اپنے گرد و پیش ایک مصنوعی خاموشی اور عالمِ سکوت قائم کر کے یہ سمجھے کہ اب سکونِ خاطر کی تلاش میں دیر نہ لگے گی۔ اخبارات کا کاروبار لڑکے کے سپرد کیا اور تلاشِ سکون کی مہم پر جہاز روانہ ہوگیا۔ ایک ملک دو ملک نہیں ساری دنیا کا چکر لگایا اور ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ لگایا لیکن دل کا سکون اور

اطمینان مادی آوازوں کا راستہ بند کر دینے سے نہ حاصل ہونا تھا نہ ہوا۔ اسی حالتِ حسرت و یاس میں پیامِ اجل آپہنچا۔ اسکی لاش حسبِ وصیت سمندر کی گہری خاموشیوں کے حوالے کر دی گئی۔ دولت جمع کرنے والو! اور اس کی طلب میں جان و ایمان تک قربان کرنے والو! سرمایہ داروں کی اس ناداری پر نظر ڈالو۔

## گوبسپ بوگیانی

اٹلی کے ایک امیر کبیر گوبسپ بوگیانی ہو گذرے ہیں جنہوں نے امریکہ آ کر بے شمار دولت پیدا کی اور پھر امریکہ ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ یہ آغاز تھا انجام یہ ہوا کہ کومو کی خوش منظر جھیل کے کنارے قیام گاہ بنا رکھی تھی۔ ایک درخت سے اپنی گردن میں پھندا لگا کر خودکشی کر لی اور حسب ذیل تحریر چھوڑ گیا:

"مجھے اپنی طویل زندگی میں تجربہ ہو گیا کہ راحت کی اگر تلاش ہے تو وہ روپیہ کے ڈھیروں میں نہیں ملتی۔ اب اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں اس لیے کہ میں تنہائی اور افسردگی کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ جس وقت میں نیویارک میں ایک معمولی مزدور تھا اس وقت مجھے پوری مسرت حاصل تھی۔ لیکن آج جب کروڑوں کا مالک ہوں میری افسردگیٔ خاطر اور بے اطمینانی کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ایسی تلخ زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔"

روپیہ کو ہر درد کی دوا جاننے والو! دولت کی عاجزی اور بے اثری دیکھو۔

## جے پٹر لوائیٹ مارگن

جے پٹر لوائیٹ امریکن کروڑ پتی کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت دنیا کے سب سے بڑے خزانہ مصنوعاتِ لطیفہ کا مالک ہے جس کی دولت کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ گھر میں بہتر سے بہتر سامانِ عیش موجود ہے لیکن انتڑیوں کی بیماریوں سے اس قدر مجبور ہے کہ معمولی غذائیں بھی نہیں چھو سکتا۔ ساری عمر ایک سخت قسم کی پرہیزی غذا کھاتے کھاتے گذر گئی۔ ایک وقت بھی حسبِ منشا غذا نصیب نہ ہوئی۔ دردِ شکم میں ہر وقت مبتلا اپنے ادنیٰ نوکروں کی غذا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ دیکھ کر حسرت بھری آہیں بھرتا ہے۔ مگر کیا مجال کہ ایک لقمہ

بھی زبان پر رکھ سکے۔

امیروں پر رشک کرنے والو! امیری کی تمنائیں اور آرزوئیں رکھنے والو! یہ عبرت ناک اور درد انگیز منظر دیکھ رہے ہو کہ ایک شخص دریا کے اندر کھڑا ہے اور پھر بھی اس سے اپنی پیاس بجھانے کو ترستا ہے۔

## مسٹر بریوسٹر

نیویارک امریکہ کے ایک کروڑ پتی مسٹر بریوسٹر تھے۔ اس کی میم صاحبہ کا حسن و جمال زبان زدِ خاص و عام تھا۔ شوہر اس قدر دولت مند اور بیوی اس قدر حسین۔ بظاہر ان سے زیادہ پُرمسرت اور کامیاب زندگی کس کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک اچھی خاصی تعداد ملک میں ایسے لوگوں کی تھی جو اس خوش نصیب جوڑے کی زندگی پر رشک کر رہی تھی۔ جون ۱۹۲۶ء میں میاں بیوی دیہات میں اپنے علاقہ پر گئے۔ ایک روز صبح کو خدمتگاروں نے دیکھا کہ مسٹر بریوسٹر کی خواب گاہ میں میاں بیوی دونوں مقتول پڑے ہیں اور دونوں کی لاشیں گولیوں سے زخمی ہیں۔ اس طرح ان کی خودکشی کا راز بھی دونوں جسموں کے ساتھ ہی مدفون ہو گیا۔

دولت اور حسن وصورت کے پرستارو! دولت اور حُسن دونوں کی بے بسی اور بیکسی دیکھ لی؟

مذکورہ بالا مفروضات نہیں بلکہ سچے واقعات ہیں۔ فرضی اور تمثیلی قصے کہانیاں نہیں بیتی ہوئی سرگذشتیں ہیں۔ ایک طرف بڑے بڑے عظیم الشان سرمائے ہیں، بڑے بھاری کارخانے ہیں اور بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں ہیں۔ کروڑوں اور اربوں کی جائیداد اور اس کے پہلو بہ پہلو بے قراریاں، بے اطمینانیاں، حسرتیں، مایوسیاں، حیرانیاں، ناکامیاں، اور افسردگیاں ہیں۔ اور آخر انجام خودکشی۔ دوسری طرف فقیری اور مفلسی ہے، ٹوٹی ہوئی کٹیا اور چھوٹی سی جھونپڑی ہے۔ ساگ پات اور جَو کی سُوکھی روٹی ہے۔ پھٹی ہوئی کمبلی اور پیوند لگے ہوئے گودڑی ہے۔ لیکن اس کے دوش بدوش دل کی خوشی، قلب کا اطمینان، روح کا سرور، قناعت کا خزانہ اور باطن کی بے تاج ابدی بادشاہی ہے۔ ملائکہ اور روحانیوں کی محفلیں اور

مجلسیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرب، وصال اور دیدار کی لازوال سرمدی لذتیں ہیں جو نہ آنکھوں نے دیکھی ہیں اور نہ کانوں نے سنی ہیں اور نہ کسی دل پر ان کا خیال گذرا ہے۔ زندگی کے دونوں رخ سامنے کھلے ہوئے ہیں اور انتخاب کے لیے ہر شخص آزاد ہے۔

حقیقی راحت کی اگر تلاش ہے، اصلی سکونِ خاطر کی اگر تمنا ہے اور دائمی دل جمعی کی اگر آرزو ہے تو ہار کر، تھک کر ہر طرح کا تجربہ کر کے بالآخر اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کی عبادت، کنج درویشی اور فقر کی طرف آنا پڑے گا۔ باقی واقعاتِ خودکشی کی اگر تعداد بڑھانی ہے اور دوزخ کے ایندھن میں اگر اضافہ کرنا ہے تو دنیا کے دروازے کھلے پڑے ہیں۔

| | |
|---|---|
| عمرِ برق و شرار ہے دنیا | کتنی بے اعتبار ہے دنیا |
| داغ سے کوئی دل نہیں خالی | کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا |
| ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع | عرصۂ کارزار ہے دنیا |
| گرچہ ظاہر میں صورتِ گل ہے | پر حقیقت میں خار ہے دنیا |
| زندگی نام رکھ دیا کس نے | موت کا انتظار ہے دنیا |

(مومن خان مومن)

یاد رہے کہ انسانی جثۂ لطیف قلب اور روح کی اصلی غذا اللہ تعالیٰ کی عبادت، ذکر فکر، تلاوت، اعمالِ صالحہ وغیرہ ہیں اور اس غذا سے دل کو حقیقی اور دائمی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جب باطنی جثۂ قلب اور روح کو اپنی مخصوص غذا ذکر و فکرِ الٰہی سے محروم کر دیا جاتا ہے تو وہ بھوک کے اضطراب اور اضطرار سے تنگ آکر مجبوراً نفسِ بہیمی کی نجس غذا کھانے لگ جاتا ہے۔ جیسا کہ عام جانوروں میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اگر ان کو اپنی مخصوص غذا گھاس چارہ اور دانہ وغیرہ سے محروم رکھا جائے تو وہ مجبوراً گندگی اور پاخانہ کھانے لگ جاتے ہیں اور اسی کو اپنی مخصوص غذا بنا لیتے ہیں جس سے ان کی فطرت اور سرشت بھی مردار خور جانوروں کی سی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قلب کا ملکوتی جثہ اپنی مخصوص غذا ذکر، فکر، طاعت اور عباداتِ الٰہی سے جس وقت محروم کر دیا جاتا ہے تو وہ مجبوراً نفسِ بہیمی کی سفلی مادی کثیف غذا یعنی جیفۂ دنیا کی گندگی کو اپنی قوت اور قُوت کا ذریعہ بنا لیتا ہے اور اسی سے اپنا پیٹ بھرنے لگ جاتا ہے۔ اور انسانی قلب بھی نفسِ بہیمی کی خُو بُو اختیار کر لیتا ہے اور اسی کے

اوصافِ ذمیمہ سے متصف اور اس کے اخلاقِ رذیلہ سے متخلق ہو جاتا ہے۔ اور اپنی اعلیٰ ملکوتی احسنِ تقویم سے گر کر بہیمیت، سبعیت اور شیطنت کے درکِ اسفل میں جا گرتا ہے۔
اور جب ایسی حالت میں مرتا ہے تو بعد از موت ہمیشہ کے لیے ظلمت اور سفلی مخلوق شیاطین الانس والجن اور ارواحِ خبیثہ کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے اور ان کے درکِ اسفل یعنی مقام سجین میں داخل کیا جاتا ہے اور ابدالآباد تک قسم قسم کے باطنی آلام، روحانی مصائب اور طرح طرح کے عذابوں میں معذب اور مبتلا رہتا ہے اور قیامت کے روز جہنم کی آگ میں جھونک دیا جاتا ہے۔ لیکن سعادت مند شخص کا بختِ ازلی یاور ہوتا ہے۔ اس کی فطرت اپنی اصلی ملکوتی نوری معدن کی طرف رجوع کرتی ہے اور اس کا باطنی جثہ اپنی مخصوص لطیف غذا ذکر فکر کی طرف مائل اور راغب ہو جاتا ہے۔ اور باطنی کمائی یعنی نوری غذا کے حصول کے لیے کمربستہ اور مستعد ہو جاتا ہے اور اسے حاصل کر کے اس سے پرورش اور تربیت پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق کہ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ج (النسآء ۴: ۱۰۳) ہر وقت ذکر فکر اور طاعتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتا ہے تو کثرتِ ذکرِ دوام اور ذکرِ سلطان اس کے جسم کے تمام اعضا، حواس وقویٰ اور آخر دل کو غرض تمام ظاہر و باطن کو گھیر لیتا ہے اور دل ذکرِ الٰہی کے انوار اور مشاہدات کی لذت اور ذوق شوق میں محو اور مست ہو جاتا ہے۔ اس وقت نفسِ بہیمی بھی جو لطیفۂ قلب کا قریبی ہم نشیں اور پڑوسی ہے اپنے رفیق دل کی نوری غذا کی بو اور لذت معلوم کر کے اس ملکوتی غذا کا شائق اور شیدائی ہو جاتا ہے۔ اس وقت نفس کا دابہ مادی غذا اور چندروزہ دنیوی عیش کی ناپائدار اور فانی لذات سے منہ موڑ کر ذکر فکر، طاعت اور عبادتِ الٰہی یعنی ملکوتی نوری غذاؤں سے پرورش اور تربیت پاتا ہے اور ملکوتی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور حیوانی اور بہیمی اوصافِ ذمیمہ کی قیود سے چھوٹ جاتا ہے۔ قولہ تعالیٰ: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ (الشمس ۹۱: ۹)۔
ترجمہ: ''دتحقیق وہ شخص چھٹکارا پا گیا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر کے اسے پاک کر لیا۔''
قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (الجمعة ۶۲: ۱۰)۔ ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو تا کہ تم چھٹکارا پالو۔'' اس وقت نفسِ بہیمی قلبِ ملکوتی کے رنگ سے رنگین اور اس سے متحد ہو کر صفتِ بہیمی سے فنا ہو جاتا ہے اور ملکوتی صفات اور روحانی

اخلاق اختیار کر لیتا ہے اور عالمِ ملکوت اور ملاءِ اعلیٰ کی نوری مخلوق میں شامل ہو کر ابد الآباد تک اس پاک لطیف عالم کے نوری غیر مخلوق لذات اور نظاروں سے لطف اندوز رہتا ہے جو نہ ان مادی آنکھوں نے کبھی دیکھے ہیں نہ ان کانوں نے کبھی سنے ہیں اور نہ کسی مادی خیال میں ان کا کبھی گذر ہوا ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ أُخۡفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعۡيُنٖ جَزَآءَۢ بِمَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ۝ (السجدہ ۳۲:۱۷) ترجمہ: "کوئی شخص نہیں جانتا مومنوں کی ان نعمتوں کو جو ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے ان سے چھپا رکھی ہیں۔ ان کے نیک اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔" خدا کے نیک اور برگزیدہ لوگوں کے قلوب پر جب اس باطنی لطف کے دروازے کھل گئے تو پہاڑوں کے غاروں میں بیسیوں برس مست اور مگن رہے۔ بعض امراء اور بادشاہوں نے جب یہ باطنی چاشنی چکھی تو وہ شاہی تاج اور تخت پر لات مار کر اس کی طلب میں جنگلوں اور بیابانوں میں جا نکلے اور پھر بادشاہی اور تخت و تاج کا نام تک نہ لیا۔ گوتم بدھ، حضرت ابراہیم بن ادھمؒ اور شاہ شجاع کرمانی وغیرہ نے بادشاہیاں اس دائمی اور سرمدی سلطنت کی خاطر ترک کر دیں۔ کہتے ہیں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ پر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے باطنی واردات اور نوری تجلیات کی بارش ہونے لگتی تو آپ فرماتے کہ کہاں ہیں دنیا کے بادشاہ۔ خدا کی قسم اگر ان نعمتوں میں سے وہ ایک ذرّہ اور ان نظاروں میں سے ایک شمہ دیکھ پائیں تو سب تخت و تاج چھوڑ کر جنگل کی طرف دوڑ آئیں۔

حضرت محبوبِ سبحانی، قطبِ ربانی، غوثِ صمدانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز کو ایک دفعہ سلطانِ سنجر نے ایک عریضہ بدیں مضمون بھیجا کہ "اگر حضور ایک دفعہ قدم رنجہ فرما کر میرے علاقہ کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمائیں اور مجھے اپنی زیارتِ فیض بشارت کا موقع بخشیں تو میں نیمروز کا سارا علاقہ حضور کے لنگر کے لیے وقف کر دوں گا۔ حضور نے اس عریضہ کی پشت پر یہ رباعی تحریر فرما کر قاصد کے حوالے کر دی۔

| | |
|---|---|
| چوں چترِ[1] سنجری رخِ بختم سیاہ باد | با فقر اگر بود ہوس ملکِ سنجرم |
| تا یافت خاطرم خبر از ملکِ نیم شب | صد ملکِ نیمروز بیک جو نمے خرم |

---

[1] آسمان کے چتر کی طرح میرا چہرہ سیاہ ہو اگر فقر کے ہوتے ہوئے مجھے ملکِ سنجر کی ہوس ہو۔ جب سے میرا دل ملکِ نیم شب سے آشنا ہو گیا ہے سنجر جیسا سو ملک میں ایک جو سے نہیں خریدتا۔

غرض اس باطنی دوام دولت اور روحانی لازوال لذت کا کیا کہنا۔ اس کی قدر و قیمت وہی جانتے ہیں جنہوں نے یہ چاشنی چکھی ہے۔

یک[1] بار چراغ آرزو ہا پف کن | قطع نظر از جمال ہر یوسف کن
زیں شہد یک انگشت رسانم بلبت | از لذت اگر محو نہ گردی تف کن

(ناصر ناخدا)

جو لوگ اس عنصری جثہ یعنی گوشت اور ہڈیوں کے ڈھانچے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یا اربع عناصر اور ان کے لطیف بخار کو روح کہتے ہیں یا اطباء کی طرح خون کو روح بتاتے ہیں وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ نیز جو لوگ اس ترکیب مادی اور نظامِ عنصری کے درہم برہم ہونے کو انسانی زندگی کا خاتمہ خیال کرتے ہیں وہ نہایت نادان ہیں۔ کیونکہ تمام اہل مذہب اور اہل فلسفۂ جدید و قدیم اور اہلِ علم روحانی یعنی اہلِ سپر چولزم اور اہلِ سائنس سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ روح اس عنصری جثہ اور مادی جسم کے سوائے ایک الگ اور علیحدہ خارجی چیز ہے۔ اور اس عنصری بدن اور مادی جسم کی ہلاکت اور اس چھلکے کے اتر جانے کے بعد بھی روح زندہ اور پائندہ رہتی ہے۔ اور آج کل تو روحوں کو حاضر کرنے اور ان سے بات چیت کرنے کے تجربے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں۔ اس کے لیے مزید زبانی دلائل اور عقلی براہین پیش کرنے کی حاجت نہیں رہی۔ جو لوگ اس ہستیٔ موہوم اور دنیا کے آب نما سراب کو لا متناہی، غیر مختتم اور سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں وہ پرلے درجے کے کوتاہ بین اور نادان کور چشم ہیں۔

تو مے گوئی کہ من ہستم خدا نیست | جہان آب و گل را انتہا نیست
من اندر حیرتم از دیدنِ تو | کہ چشمت آنچہ بیند ہست یا نیست

(ذکریا رازی)

ترجمہ:۔ تو کہتا ہے کہ میں موجود ہوں مگر خدا نہیں ہے اور اس پانی اور مٹی کی دنیا کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میں تیرے اس مشاہدہ پر حیران ہوں کہ تیری آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے

---

[1] ایک دفعہ تو آرزوؤں کے چراغ بجھا دے اور ہر محبوب سے قطع تعلق کر لے۔ عرفانِ الٰہی کے اس شہد سے ایک انگلی میں تیرے ہونٹوں تک پہنچا دیتا ہوں اگر دنیا کی لذات تیرے ذہن سے ختم نہ ہو جائیں تو مجھ پر افسوس کرنا۔

درحقیقت موجود ہے بھی یا نہیں۔

اب اگر کوئی یہ اعتراض کر بیٹھے کہ انہیں وہ علوی لطیف جثۂ روح دکھادیا جاوے تب ہم اسے مانیں گے۔ ہم ایسی چیز کو جونظر نہ آئے اور نہ سمجھ میں آئے کیونکر مانیں تو اس ہٹ دھرمی کا علاج ہی نہیں۔ اور یہ ایسا سوال ہے جیسا کہ موسٰی علیہ السلام کی قوم نے ان سے کیا تھا کہ حَتّٰی نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (البقرۃ ۲:۵۵)۔ یعنی ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا دکھایا جائے، تب ہم مانیں گے۔ ایسے شقی مادر زاد اندھے اگر اپنی ضد اور انکار پر اڑے رہیں تو وہ اپنی کور چشمی کی وجہ سے معذور ہیں۔ کیونکہ انکے دل مادے کے غلیظ غلاف اور پردے میں محصور ہیں۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ ؕ (البقرۃ ۲:۸۸)۔

ہزار معجزہ بنمود عشق و عقل جہول — ہنوز در پے اندیشہائے خویشتن است

(حافظ)

ترجمہ: عشق نے ہزاروں معجزے دکھلا دیئے لیکن جاہل عقل ابھی تک اپنے اندیشوں کی پیروی کر رہی ہے۔

بعض یہ کہیں گے کہ اگر روح کوئی چیز ہے یا دنیا میں آنے سے پہلے مقامِ ازل میں موجود تھی تو ہم کو وہ مکان اور وہ زمان اور وہ ارواح کیوں یاد نہیں ہیں۔ سو یاد رہے کہ روح مقامِ ازل میں بیدار تھی۔ جس وقت اس نے اس دنیا میں جنم لیا اور مادی جہاں میں جسمِ کثیف کا لحاف اوڑھ کر خوابِ غفلت میں سو کر بے ہوش ہوگئی تو وہ ازل کا زندہ بیدار جہان اور وہاں کا مکان اور زمان اسی طرح فراموش کر گئی جس طرح ہم خواب کے اندر اس زندہ جہان اور یہاں کے مکان اور زمان کو بھول جایا کرتے ہیں۔ اور اگر بالفرض ہمیں خواب کی دنیا میں بند کر دیا جائے اور سالہا سال تک بیدار نہ کیا جائے تو چونکہ ہمارے سامنے خواب کی ایک خیالی اور مثالی دنیا اس زندہ دنیا کی مثل موجود ہوتی ہے، ہم کبھی اس زندہ دنیا کو یاد بھی نہیں کریں گے اور نہ بیدار ہونے کی آرزو کریں گے۔ اسی طرح نفسانی لوگوں کے قلوب اور ارواح اس مادی دنیا میں غفلت کی نیند سوئے ہوئے ازل کے زندہ بیدار جہان سے غافل اور بے خبر ہیں۔ چنانچہ اس دنیا میں خواب کے اندر نفس جب اپنے حواس اور قویٰ سے معطل ہو جاتا ہے گویا ایک گونہ مر جاتا ہے تو دل بعض دفعہ اس مقام کو اپنے

باطنی حواس سے معلوم اور محسوس کرتا ہے اور خواب کے اندر ایسے نادیدہ مقامات دیکھتا ہے جو اس نے دنیا میں پہلے کبھی نہیں دیکھے ہوتے۔ لیکن وہ ان مقامات سے اس طرح مانوس اور مالوف ہوتا ہے جس طرح وہ اس کے اپنے گھر ہوں اور انہیں گویا اس نے بہت مدت استعمال کیا ہے۔ یا بعض وقت خواب کے اندر ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے جنہیں دنیا میں پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا لیکن وہ خواب میں دوست، آشنا اور رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں۔ یا کبھی کسی ولی یا بزرگ یا نبی کی خواب میں زیارت ہو جاتی ہے اور ہم خواب میں انہیں شکل اور نام سے اچھی طرح پہچانتے ہیں اور ان سے واقف کاروں اور محرم رازوں کی طرح بات چیت کرتے ہیں حالانکہ دنیا میں وہ ہم سے بہت زمانہ پہلے گذر چکے ہیں لیکن ہمارا دل اور روح اُس توفیق سے انہیں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ روح جسم سے علیحدہ اور الگ وجود رکھتی ہے اور اس جسمِ عنصری کے فنا ہو جانے کے بعد زندہ رہے گی۔ اور جسمِ عنصری اختیار کرنے سے پہلے بھی مقام ازل میں موجود تھی۔ اور خواب میں جو بعض دفعہ ہم نادیدہ مانوس مقامات یا اجنبی اشخاص کو دیکھ کر پہچانتے ہیں تو وہی ازلی مقامات اور وہی ازلی آشنا اور یار دوست ہیں جن سے روزِ ازل میں روح مانوس اور مالوف رہی ہے۔ انسان کا عنصری ڈھانچہ اور مادی جثہ فنا پذیر ہے اور موت کے بعد ہم اسے دیکھتے ہیں کہ گل سڑ کر مٹی میں مل جاتا ہے لیکن انسان کا باطنی جثۂ نفس قلب وروح وغیرہ اور ان کے باطنی حواس اور قویٰ یعنی تصور، تفکر، توجہ تصرف کو نہ مٹی کھاتی ہے اور نہ یہ چیزیں گلنے سڑنے والی ہیں۔ لیکن ان کا خود بخود بغیر کسی آوند اور ظرف یعنی وجود کے قائم رہنا محال ہے۔ اس لیے موت کے بعد ان باطنی حواس، قویٰ اور خیالات وغیرہ کو باطنی لطیف وجود عطا کیا جاتا ہے۔ سو تمام سلوکِ تصوف اور روحانیت کی غرض وغایت یہ ہے کہ انسان اسی زندگی میں ایک ایسا لطیف نوری مرکب تیار کر لے جو ان باطنی حواس اور قویٰ وغیرہ کا حامل ہو اور دوسری ابدی لطیف دنیا میں پہنچ کر وہاں زندگی بسر کرنے اور رہنے سہنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے کے قابل ہو۔ جس کی خام ناتمام صورت گاہے گاہے بطور مشتے نمونہ از خروارے ہم خواب میں پاتے ہیں۔ خواب میں انسان کا ایک لطیف معنوی پیکر انسانی حواس، قویٰ اور خیالات کا حامل اور مرکب بن جاتا ہے۔ وہ لطیف جثہ خواب کے اندر

ایک لطیف دنیا کے اندر دیکھتا، بھالتا، بولتا، چلتا پھرتا، سوچتا سمجھتا اور سب کام کرتا ہے اور بعض دفعہ تو خواب دیکھنے والا اتنا بھی سمجھتا ہے کہ یہ جو میں دیکھ رہا ہوں یہ خواب کی حالت ہے۔ لیکن چونکہ نفسانی آدمی کا یہ جثہ ابھی خام اور ناتمام حالت میں ہوتا ہے اس لیے اسے اس جثے کی نسبت نہ پوری آگاہی حاصل ہوتی ہے اور نہ پورا شعور حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ خواب کی دنیا کو خیالی دنیا سے تعبیر کرتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت خواب کی دنیا خالی خیالی دنیا ہی نہیں ہوا کرتی اور نہ ہر خواب روزمرہ کے عادی دنیوی پریشان خیالات کا مجموعہ ہوا کرتا ہے بلکہ خدا کے مقبول اور برگزیدہ بندوں کے خواب آئندہ واقعات کے سچے نمونے اور لوحِ محفوظ کی متحرک فلم اور ٹھوس حقائق ہوا کرتے ہیں اور وہ خواب صبح صادق کی طرح صحیح اور درست ثابت ہوتے ہیں۔ عارف سالک لوگ جب مراقبہ کرتے ہیں تو ہوش و حواس اور عقل و شعور کے ساتھ خواب کے لطیف غیبی جہاں میں داخل ہوتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں پہنچ جاتے ہیں اور جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ عوام نفسانی لوگوں کا یہ لطیف جثہ چونکہ ابھی رحم کے اندر جنین کی طرح مردہ اور بے حس ہوتا ہے اس لیے اسے خواب کے اندر شعور و ادراک اور ہوش و حواس حاصل نہیں ہوتے۔ لیکن عارف زندہ دل آدمی کا لطیفۂ قلب طفلِ معنوی کی طرح بطنِ باطن سے زندہ اور صحیح و سلامت انسان کی طرح عالمِ غیب میں پیدا اور ہویدا ہو جاتا ہے اور شعور و ادراک اور ہوش و حواس کے ساتھ وہاں آمد و رفت رکھتا ہے اور عالمِ غیب اور عالمِ آخرت کے حالات اور واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اصطلاح تصوف میں اس لطیف وجود کو لطیفہ کہتے ہیں۔

یہ لطیفہ جسدِ عنصری کی طرح تمام باطنی لطیف اعضا اور حواس کا مکمل معنوی انسان ہوتا ہے۔ وجودِ عنصری کو کپڑے اور چھلکے کی طرح اتار کر عالمِ غیب میں اپنے اختیار سے آتا اور جاتا ہے۔ تصوف کی کتابوں میں ان لطائف کا ذکر پڑھنا اور ان کی نسبت قیل و قال اور گفت و شنید کرنا نہایت آسان کام ہے لیکن خود اللہ تعالیٰ کے لطف کا لطیف معنوی انسان اور نوری پیکر بننا نہایت دشوار کام ہے۔ بہت سے رسمی دکاندار مشائخ تصوف اور سلوک کی کتابوں میں ان لطائف کا حال پڑھ کر طالبوں کو زبانی طور پر بتاتے ہیں کہ نفس اور قلب کے دو لطیفے عالمِ خلق سے ہیں اور لطیفۂ روح، سر، خفی، اخفیٰ اور لطیفۂ انا یہ پانچ لطائف عالمِ

امر کے ہیں۔ اوران لطائف کے مقام بتاتے ہیں کہ سینے میں یہ مقام نفس ہے اور یہ مقامِ قلب ہے اور دماغ میں یہ مقام فلاں ہے اور یہ مقام فلاں، اور طالبوں کو حبسِ دم کرا کر کہتے ہیں کہ دل کی طرف فکر کرو اس میں ذکر کی حرکت معلوم ہوگی اور ذکر کی آواز آئے گی۔ جس وقت سادہ لوح طالب بچارے حبسِ دم کر کے دل کی طرف خیال کرتے ہیں تو اس میں واقعی خون کے دوران یعنی خون کے دل میں داخل ہونے اور نکلنے کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی حرکت تمام بدن اور رگ وریشے میں معلوم اور محسوس ہوتی ہے اور ساتھ ہی خون کے دھکیلنے کی ٹپ ٹپ کی سی آواز بھی طالب کو سنائی دیتی ہے۔ یہ رسمی رواجی پیر نادان طالبوں کو دورانِ خون کی ان حرکات اور اصوات کو ذکرِ قلبی، روحی اور سرّی وغیرہ بتاتے ہیں۔ اور سادہ لوح بدھو طالب ان حرکات کو اصلی ذکر، لطائف کا زندہ ہونا اور ذکر سلطان سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ حالانکہ دورانِ خون کی ان حرکات اور اصوات کو ذکرِ الٰہی اور باطنی لطائف سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگر دورانِ خون کی دل اور تمام اعضاء کے اندر یہ تحریک، جنبش اور مادی آواز ذکرِ قلب ہے تو یہ ذکر تو کلب یعنی کتے اور ہر جانور میں موجود ہے۔ افسوس کہ آج کل کے رسمی، رواجی، ریاکار، دکاندار مشائخ نے تصوف اور سلوک کو بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ جیسے چھوٹی بچیاں گڑیا بنا کر ان سے کھیلتی ہیں، ان کی شادیاں اور بیاہ رچاتی ہیں حالانکہ دراصل نہ کوئی شادی ہوتی ہے اور نہ بیاہ۔ اصل کجا اور نقل کجا۔

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

(اسماعیل میرٹھی)

قلب کا ذکر اللہ سے زندہ ہونا اور اس کی حرکت اور جنبش بہت بڑی بات ہے۔ جب قلب زندہ ہو کر جنبش اور حرکت میں آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عرشِ معلےٰ کو جنبش اور حرکت ہوتی ہے اور حاملانِ عرش حیرت میں آجاتے ہیں۔ سالک زندہ قلب پر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں اور اسے ایک رائی کے برابر نظر آتے ہیں۔

دل کہ مے جنبد جنباند عرش را  عرش را دل فرش سازد زیر پائے

(رومی)

ترجمہ:۔ دل جب جنبش میں آتا ہے تو عرش کو بھی ہلا دیتا ہے۔ اور دل عرشِ بریں کو اپنے پاؤں تلے کا فرش بنالیتا ہے۔

سالک عارف کا یہ باطنی لطیف جثۂ قلب جب زندہ ہو جاتا ہے تو باطنی اور لطیف دنیا میں ایک لطیف نوری بچے کی طرح گویا از سرِ نو تولد ہو جاتا ہے۔ سو سلوک اور تصوف کی غرض و غایت ان باطنی لطائف کا ذکر اللہ سے زندہ کرنا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ دنیا کے مادی شجر تن کے ساتھ ہماری قندیل دل میں نوری چراغ اسم اللہ ذات لٹک رہا تھا لیکن فنا اور موت کی تند آندھی سے درختِ تن گرنے لگا اور اس قندیل کے ٹوٹنے اور پھوٹنے کا خطرہ لاحق تھا۔ لہٰذا اس کے ہوشیار مالک نے اس سے ایک دوسرا چراغ روشن کر دیا اور اسے باطن کے لطیف، پرامن، دائم، استوار اور پائدار درخت یعنی شجرِ طیبہ کے ساتھ نوری قندیل میں لگا دیا جہاں اسے نہ ٹوٹنے کا خطرہ ہے اور نہ بجھنے کا خوف ہے۔ مولانا روم صاحبؒ اس مضمون کو مثنوی میں یوں ادا فرماتے ہیں:۔

باد تنداست و چراغ ابترے — زو بگیرانم چراغ دیگرے
تابود کز ہر دویک وانی شود — گر بباد آں چراغ از جارود
ہمچو عارف کز تن ناقص چراغ — شمع دل افروخت از بہرِ فراغ
تاکہ روزے ایں بمیرد ناگہاں — پیش روئے خود نہد او شمع جاں

(رومی)

ترجمہ: ہوا تیز ہے اور چراغِ زندگی بجھنے والا ہے۔ اس چراغ سے میں دوسرا چراغ جلالوں۔ ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے ایک باقی رہ جائے اگر ہوا کی وجہ سے وہ پہلا چراغ بجھ جائے۔ جیسے عارف اس ناقص جسمانی چراغ سے دل کی شمع روشن کر لیتا ہے تاکہ وہ اطمینان لے۔ تاکہ اگر کسی دن یہ جسمانی چراغ اچانک بجھ جائے تو وہ اس روحانی چراغ کو اپنے سامنے رکھے۔

یا اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اس دنیوی مادی بری زندگی کے سفر میں ہمیں چلنے پھرنے اور سواری کے لیے مادی مرکب یعنی جسدِ عنصری ملا ہے۔ لیکن عارف کامل کے نوحِ روح کو اللہ تعالیٰ کی تائیدِ غیبی سے الہام اور اعلام ہو گیا کہ عنقریب مادی دنیا میں موت کا بلا

خیز عالم گیر طوفان آنے والا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے روحانی کشتی تیار کر۔ تو نیک بخت دور بین روح اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے نوح نبی اللہ کی طرح ایک لطیف روحانی کشتی تیار کر کے اس پر مع جملہ متعلقین یعنی ہوش وحواس اور قوی سوار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عارف سالک اسم اللہ ذات کے طفیل اللہ تعالیٰ کے لطیفہ لطف کی لطیف کشتی میں سوار بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ (ھود ۱۱: ۴۱) کہتا ہوا نوح نبی اللہ کی طرح فنا کے بلا خیز عالم گیر طوفان سے بچ جاتا ہے لیکن خام ناتمام عنصری آب و گل کے خاکی جثوں والے نفسانی لوگ اس طوفانِ فنا کے تھپیڑوں میں غرق اور فنا ہو جاتے ہیں۔

اے دل ار سیل فنا بنیاد ہستی برکند
چوں ترا نوح است کشتیباں زطوفانِ غم مخور

(حافظ)

ترجمہ:۔ اے دل اگر فنا کی موج ہستی کی بنیاد کو اکھیڑ دے تو جب تک تیرا نوح کشتی چلانے والا ہے طوفان کا غم نہ کر۔

نیز یہ باطنی لطیف جثہ ہمارے اس جسدِ عنصری کے ذرّے ذرّے میں سے اس طرح زندہ ہو کر نکلتا ہے جس طرح انڈے سے بچہ یا دودھ سے مکھن اور ہر لطیفے سے دوسرا لطف زیادہ لطیف لطیفہ اس طرح نمودار ہوتا ہے جس طرح مکھن سے گھی۔ اور علیٰ ہذا القیاس دل کا یہ نوری لطیفہ شہبازِ لامکانی اور عنقائے قاف قدس ہوتا ہے۔ جب یہ مادے کے بیضہ ناسوتی کو توڑ پھوڑ کر نکلتا ہے تو مادی دنیا کے تنگ و تاریک گھونسلے میں نہیں سماتا اور اپنے روحانی ملکوتی پروں کی خفیف جنبش سے کون و مکان اور شش جہات سے پار ہو جاتا ہے۔ شجرِ طوبیٰ اس کا ادنیٰ نشیمن بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کنگرہ عرش میں اپنا نوری آشیانہ بنا لیتا ہے۔ انسان اسی بلند مقصد کے لیے دنیا میں آیا ہے اور یہی اس کی زندگی کی غرض و غایت ہے۔ اے طالب! ہمت کر کہ موت سے پہلے تو اس اصلی نصب العین اور حقیقی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔

اے بدل از گوہر پاک آمدہ — گوہر تو زیورِ خاک آمدہ
چنبر نہ چرخ لبے بیخت خاک — تا تو بروں آمدی اے دُرِ پاک

جانِ جہاں و ہمہ عالم توئی | وانکہ نہ گنجد بجہاں ہم توئی
گنجِ خدا را تو کلید آمدی | نزپئے بازیچہ پدید آمدی
چرخ کہ از گوہرا حسانت ساخت | آئینۂ صورت رحمانت ساخت
آئینۂ زیں گونہ کہ داری بچنگ | آہ ہزار آہ کہ ندہی بزنگ
آنکہ بملک و ملکی قابل است | آئینۂ صافی اہلِ دل است

(نظامؔ قی)

آج کل اہلِ یورپ اور اہلِ فرنگ بھی روح اور روحانی دنیا کے قائل اور روحانی علم کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اگر چہ یہ لوگ ہمارے علما سلف صالحین اور اولیا کاملین کے مقابلے میں ابھی محض طفلِ مکتب اور ابجد خواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے نئی روشنی کے دلدادہ اور مغرب زدہ نوجوان طبقہ کے لیے ہمارا یہ بیان ایک زبردست حجت اور قوی برہان ثابت ہوگا جو یورپین محققین کے ہر قول کو وحی آسمانی سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ ہمارے روشن خیال دوستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یورپ میں مذہب اور روحانیت کی نسبت سائنس اور فلسفہ جدیدنے کچھ عرصہ پہلے جو غلط عقیدہ اور باطل نظریہ قائم کیا تھا اب وہ بالکل بدل گیا ہے۔ اب وہ وحی آسمانی، روح کی باطنی شخصیت اور اس کے عجیب مافوق الفطرت ادراکات اور روحانی کمالات کے بالکل قائل ہو گئے ہیں۔ ہم یہاں آج کل کے علمائے مغرب کی تحقیق و تفتیش اور ان کے نتائج واستنباطات پیش کر کے اپنے نادان نوجوان دوستوں کو بتائے دیتے ہیں کہ جو لوگ وحیِ آسمانی اور الہاماتِ روحانی کو محض ہذیان اور وہم گمان سمجھتے تھے آخر کار ان کو بھی اس کی صداقت کا اقرار کرنا پڑا۔ ہم ان لوگوں کے مذہبی افکار اور روحانی ذہنیت میں اس قدر انقلاب اور تغیر و تبدل پیدا ہونے کے ثبوت میں علمائے مغرب کے موجودہ افکار و نظریات مختصراً قلم بند کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے ہمارے منکرینِ مذہب و روحانیت کو کچھ تنبیہ ہو اور وہ اپنے الحاد کے اصرار اور مذہب کے انکار پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کریں۔ اور ان سچے حقائق کی مخالفت سے باز آجائیں جو اَب یورپین محققین اور ان کے اربابِ علم ورائے کے نزدیک بھی مسلم ہو گئے ہیں۔

''اہلِ مغرب تمام مذہبی قوموں کی طرح سولہویں صدی تک تو وحی آسمانی کے تقلیدی

طور پر قائل رہے کیونکہ ان کی مذہبی کتابیں انبیا کے حالات اور واقعات سے پر تھیں لیکن بعد میں جب سائنس کا دور شروع ہوا اور روحانیت سے ہٹ کر لوگوں کی توجہ مادیات کی طرف زیادہ ہو گئی تو اس وقت سائنس اور فلسفۂ مغرب نے اعلان کیا کہ وحی کا سلسلہ بھی ان پرانے خرافات میں سے ہے جو جہالت، نادانی اور توہم پرستی کے باعث انسانوں کے قلب و دماغ پر اب تک مسلط رہا ہے۔ اس جدید فلسفے نے مابعد الطبیعی حقائق کے انکار میں اس درجہ غلو کیا کہ سرے سے خدا اور روح کا ہی انکار کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں وحی کی نسبت یہ کہا گیا کہ یہ یا تو نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کی اپنی اختراع ہے جو انہوں نے لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اختیار کر لی ہے یا کسی قسم کا ہذیان ہے جو بعض عصبی امراض والوں کو لاحق ہو جاتا ہے۔ اور اس مرض کے دوروں میں ان کو بعض چیزوں کی صورتیں متمثل ہو کر نظر آتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں ان کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ فلسفۂ یورپ نے وحی اور دوسرے مابعد الطبیعی چیزوں کی نسبت اپنے اس نظریے کا اس زور و شور سے پراپیگنڈا کیا کہ یہ نظریہ فلسفے کا ایک مستقل عقیدہ بن گیا۔ اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو عالم یا تعلیم یافتہ کہلانا چاہتا، اس کے لیے اس نظریے کا قائل ہونا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ ایک کثیر نادان طبقہ اس سیلابِ جہالت کی رو میں بہہ کر غافل دنیا سے گذر گیا۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں امریکہ کے اندر وجودِ روح کے ایسے آثار نمودار ہوئے جنہوں نے امریکہ سے گذر کر تمام یورپ کے خیالات کے اندر ایک تموج اور ہیجان پیدا کر دیا اور لوگوں کو ایسی باطنی دنیا اور عالمِ روحانی کے وجود کا اقرار کرنا پڑا جس میں بڑی بڑی عقلیں اور روشن افکار کار فرما ہیں۔ تمام یورپ کے اندر اب مسائلِ روحانیہ میں بحث و فکر کا نقطہ نظر بالکل بدل گیا۔ اور وحی اور روح کا مسئلہ از سر نو زندہ ہو گیا۔ علمائے مغرب نے اس مسئلے پر از سرِ نو بحث شروع کر دی اور اس کی تحقیق و تفتیش میں لگ گئے۔ چند سال کے بعد جب انہوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے نتائج شائع کیے تو یورپ کی تمام فضا میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ۱۸۸۲ء میں بمقام لنڈن ایک کمیٹی بنی جس کا مقصد روح اور اس کے متعلقات پر بحث کرنا اور ان کی تحقیق و تفتیش کرنا تھا۔ اس کمیٹی میں جو علما شریک تھے ان میں قابلِ ذکر اور نمایاں تر یہ حضرات تھے: (۱) پروفیسر جیک، کیمبرج یونیورسٹی، صدر کمیٹی اور انگلستان کا مشہور عالم طبیعیات

(۲) پروفیسر اولیور لاج، علم طبیعیات کا ماہر خصوصی (۳) سر ولیم کروکس، انگلستان کا مشہور عالم کیمسٹری (۴) پرفیسر فریڈرلک مایرس، کیمرج یونیورسٹی (۵) پروفیسر ہڈسن (۶) پروفیسر ولیم جیمس ہر فورڈ یونیورسٹی امریکہ (۷) پروفیسر بلریوب، کولمبیا یونیورسٹی (۸) کامل فلامریون، فرانس کا مشہور ماہر فلکیات و ریاضیات۔ ان کے علاوہ یورپ کے دیگر مشہور علماء بھی اس کمیٹی میں شامل رہے۔ یہ کمیٹی تیس سال تک قائم رہی۔ اس مدت میں اس نے ہزاروں روحانی واقعات وحوادث کی تحقیق کی اور روح انسانی اس کے قویٰ اور قوت ادراک کے متعلق بار بار تجربے کیے۔ جو چالیس ضخیم اور موٹی جلدوں میں مدون و محفوظ ہیں۔ اس کمیٹی نے اپنے نتائج فکر و تجربہ کی متواتر اشاعت کی اور انہوں نے ثابت کیا کہ انسان کے لیے ایک اور باطنی شخصیت بھی ہے۔ یعنی ہم اپنی موجودہ زندگی میں اگرچہ زندہ ہیں اور ادراک کرتے ہیں لیکن ہمارا یہ ادراک ان تمام روحانی قوتوں کی توجہ سے نہیں ہوتا جو ہمارے جسم کے اندر موجود ہیں بلکہ ان روحانی قوتوں کے ایک جز سے ہوتا ہے۔ جس کا اثر جسم کے حواسِ خمسہ کے افعال کے ذریعہ سے ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ زندگی جو حواس خمسہ نے ہم کو بخشی ہے اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ایک اور زندگی ہے۔ جس کی عظمت وجلال کی کوئی نشانی اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ ہماری یہ ظاہری شخصیت نیند یا کسی اور ذریعے سے زائل نہ ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے ان لوگوں پر جن کو ہپناٹزم یا مقناطیسی نیند کے ذریعے سلا دیا گیا تھا دیکھا کہ سونے والے کو روحانی زندگی کی فراواں دولت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اس عالم روحانی میں اپنے حواسِ ظاہری کے علاوہ کسی اور باطنی حاسہ کے ذریعے دیکھتا اور سنتا ہے۔ آنکھوں سے اوجھل اور بعید چیزوں کی خبریں دیتا ہے اور اس وقت اس کی قوت تعقل و طاقتِ ادراک پورے طور پر بیدار ہو کر اپنا کام کرتی ہے۔ کمیٹی کے نزدیک یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انسان کی اس ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور شخصیت ہے جو پہلی مادی اور جسمانی شخصیت سے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔ اور وہ شخصیت موت کے بعد زندہ رہتی ہے اور فنا پذیر نہیں ہوتی ان علما نے یہ بھی معلوم کیا کہ یہی وہ اعلیٰ شخصیت ہے۔ جس کے ذریعے ماں کے رحم کے اندر بچے کے جسم کا تکوّن ہوتا ہے اور اسی کے اثر اور پرتو سے جسمِ انسانی تیار ہوتا ہے اور معدہ وغیرہ اعضا جن پر انسان کے ارادہ کو کوئی دسترس حاصل نہیں ہے

ان کے افعال اور حرکات بھی اسی اعلیٰ شخصیت کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ انسان کا انسان ہونا اسی باطنی شخصیت پر موقوف اور منحصر ہے۔ اس مادی شخصیت پر ہرگز نہیں جس کا تعلق حواسِ خمسہ ظاہرہ کے ساتھ ہے۔ اور یہی وہ شخصیت ہے جو جسم کے کثیف حجابوں کے درمیان بھی عمدہ عمدہ خیالات اور اعلیٰ ادراکات پیدا کرتی ہے۔ الہاماتِ غیبی کا تعلق بھی اسی شخصیت سے ہے اور یہی وہ قوت ہے جو انبیا کے قلوب میں ان چیزوں کی القا کرتی رہتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کہتے ہیں۔ پھر گاہے گاہے یہی وحی مجسم ہو کر نظر آتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا فرشتہ کہتے ہیں جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ ان علما محققین کی رائے ہے کہ انسان کی یہ دوسری شخصیت حواسِ باطن کے ذریعے مدرک ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہپناٹزم کے ذریعے جو لوگ مقناطیسی نیند سوتے ہیں ان میں بھی پسندیدہ عقلِ روشن، نظر دور رس، نفوس کے پوشیدہ اسرار میں اثر ونفوذ، مخفی باتوں کے معلوم کرنے کی صلاحیت اور اپنی حالتِ حاضرہ کے اعتبار سے جاہل غبی ہونے کے باوجود دنیا کے وسیع اقطار و اکناف میں سیر و سفر، یہ تمام چیزیں اور ان کے علاوہ دوسری فوق العادت قابلیتیں اس بات کی قوی دلیل ہیں کہ انسان کے اندر ایسی باطنی شخصیت پائی جاتی ہے جو جسمانی حیات کے پردوں میں مستور ہے اور وہ اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ اس کا جسمِ عنصری طبعی یا صناعی نیند میں مصروف ہو جاتا ہے۔

پھر رویائے صادقہ یعنی سچے خواب بھی جو صبح صادق کی طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں اور جن کے ذریعے انسان غیبی امور اور آئندہ واقعات کو دریافت کر لیتا ہے یا جن میں بعض اوقات ایسے مشکل مسائل حل کر لیتا ہے جنہیں وہ بیداری میں ہرگز حل نہیں کر سکتا تھا یا جن میں وہ بعض اوقات ایسے اعمال کر گذرتا ہے جن کی وہ بحالتِ بیداری کبھی ہمت اور جرأت نہیں کر سکتا تھا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے لیے اس کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور باطنی شخصیت ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ قوی، بلند، اور ترقی یافتہ ہے۔ اس استدلال کے علاوہ اور بھی متعدد امور ہیں جن کا اس تحقیقاتی انجمن نے نہایت دقیقہ رسی کے ساتھ عمیق مطالعہ کیا۔ پھر ساتھ ہی ان تجربوں کا جائزہ لیا جو ان سے پہلے کیے جا چکے تھے اور آخر کار انہوں نے علمِ ارواح اور ان کے لطائف و کوائف کا کھلے دل سے اقرار کیا اور یہ علم

ایک روحانی سائنس کی طرح یورپ کے تمام ملکوں میں مروّج اور مدوّن ہو گیا ہے۔ یورپ کے ہر بڑے شہر میں اس کی روحانی سوسائٹیاں اور با قاعدہ کمیٹیاں مقرر ہو گئی ہیں اور اس روحانی علم یعنی سپر چولزم (SPIRITUALISM) کے باقاعدہ کالج اور اس کے بیشمار مدرسے کھل گئے ہیں اور بیشمار کتابیں اس فن میں لکھی جا چکی ہیں۔ اس سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ماہر علم النفس پروفیسر ڈاکٹر مائیرس نے جو اس انجمن کے بھی رکنِ خصوصی تھے انسانی شخصیت ہیومن پرسنیلٹی (HUMAN PERSONALITY) پر ایک نہایت قابلِ قدر کتاب لکھی ہے۔ جس کے مختلف ابواب میں مقناطیسی نیند، عبقریت، وحی اور شخصیتِ باطنہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہم ذیل میں چند اقتباسات کتاب مذکور کے صفحہ ۷۷ اور اس کے بعد کے صفحات سے نقل کرتے ہیں۔ پروفیسر مائیرس نے سب سے پہلے ان ریاضی دانوں کا ذکر کیا ہے جو مشکل سے مشکل مسائلِ ریاضی کا درست حل مقناطیسی نیند کے اندر فوراً بغیر کسی غور و فکر کے معلوم کر کے بتا دیتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہیں یہ جواب کیونکر معلوم ہوا تو وہ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے حل کر دیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کس طرح حل کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر موصوف نے بیدلر نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بڑے سے بڑے عدد کے متعلق یہ فوراً بتا دیتا تھا کہ وہ کن اعداد کی ضرب سے حاصل ہوتا ہے مثلاً ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کیا اعداد ہیں کہ جن کو ضرب دے دی جائے تو ۱۷۸۶۱ کا عدد حاصل ہو تو اس نے غور و تامل کے بغیر فوراً کہہ دیا کہ ۳۳۷ کو ۵۳ میں ضرب دینے سے یہ عدد پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب اس سے پوچھا گیا کہ کس قاعدے اور حساب سے تو اس نے کہا کہ میں یہ نہیں بتا سکتا۔ گویا اس کا یہ جواب ایک طرح کا طبعی تقاضا تھا جس میں انسان کے ارادے اور فہم کو قطعی دخل نہیں ہوتا۔ پروفیسر مذکور کہتے ہیں کہ میں یقین کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات دنیا میں پہلی مرتبہ ظاہر نہیں ہوئے بلکہ اس سے پہلے بھی اس قسم کے اعلیٰ حالات اور واقعات اگلے لوگوں کے علم میں آ چکے ہیں۔ یہ سب ہمارے وجودِ باطنی اور جسمِ روحانی کے کرشمے اور کارنامے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔

پروفیسر مذکور لکھتے ہیں کہ "اب میں پورے وثوق اور جزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ انسان

میں ایک روح کا وجود یقینی ہے جو اپنے لیے قوت و جمال کا اکتساب عالمِ روحانی سے کرتی ہے اور ساتھ ہی میں اس بات کا بھی یقین کرتا ہوں کہ تمام عالم میں ایک روحِ اعظم اور نورِ محیط سرایت کیے ہوئے ہے جس کے ساتھ انسانی روح کو اتصال حاصل ہو سکتا ہے۔"

اپنی اس تحقیق کے ساتھ پروفیسر مائیرس نے فرانس کے ایک مشہور پروفیسر ابو سے بھی نقل کیا ہے کہ "انسان کی باطنی شخصیت ہی وہ چیز ہے جس کو عام لوگ وحی کہتے ہیں۔ اس حالت کے لیے طبعی صفات و خصائص ہیں جو اس کے ساتھ ہی مختص ہیں۔"

آخر میں ہم رسل ویلز کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں جو طبیعات میں ڈارون کا ہم پلہ اور اس کا شریک خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے عجائبات روح پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ ان الفاظ میں برملا اعتراف کرتا ہے "میں کھلا ہوا مادہ پرست اور دہریہ تھا۔ میرے ذہن میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ میں کسی وقت روحانی زندگی کا اظہار کروں گا جو دنیا میں کارفرما ہے مگر میں کیا کروں میں نے پے بہ پے ایسے مشاہدات محسوس کیے جن کو ہرگز نہیں جھٹلایا جا سکتا۔ انہوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں ان چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کروں۔ اگرچہ مدت تک میں انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ یہ آثار روح سے سرزد ہوتے ہیں لیکن ان مشاہدات نے رفتہ رفتہ میری عقل کو متاثر کر دیا ہے نہ بطریق استدلال و حجت بلکہ یہ مشاہدات کے پیہم تواتر کا اثر تھا جس سے میں بجز روح کے وجود کے اعتراف کے اور طریقہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا۔"

یورپ کے اساتذۂ علمِ جدید نے روح کے متعلق جو تحقیقات کی ہیں اس سے وہ ان نتائج پر پہنچے ہیں جو کیمل فلامریان کے نزدیک حسب ذیل ہیں:

(۱) روح جسم سے جداگانہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ (۲) روح میں اس قسم کی خاصیتیں ہیں جو اب تک علمِ جدید کی رو سے غیر معلوم تھیں۔ (۳) روح حواسِ خمسہ کی وساطت کے بغیر متاثر ہو سکتی ہے یا دوسری چیز پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے۔ (۴) روح آئندہ واقعات سے واقف ہو سکتی ہے۔

پھر اس روشنی میں وحی کی نسبت ان علما کا خیال ہے کہ وحی دراصل روحِ انسانی پر ایک خاص قسم کی تجلی کا نام ہے جو اس پر اس کی شخصیتِ باطنہ کے ذریعے ضو فگن ہوتی ہے اور اس کو

وہ باتیں سکھاتی ہے جنہیں وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ وحی کے باب میں علمائے اسلام اور علمائے یورپ میں اتنی بات مشترک ہے کہ وحی کا تعلق جسم یا کسی جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ روح سے ہے۔ البتہ یہ امر مختلف فیہ رہ گیا ہے کہ اسلام میں وحی فرشتے کے ذریعے نبی کے قلب پر اترتی ہے اور ان لوگوں کے نزدیک فرشتہ شخصیتِ باطنہ کا نام ہے۔ فرق صرف نام کا ہے کام کا نہیں۔

یورپ میں یہ روحانی مذہب گھر گھر رائج ہے اور دن رات روحوں کو حاضر کر کے اُن سے کھلم کھلا بات چیت کی جاتی ہے۔ گھر گھر حاضراتِ ارواح کے حلقے قائم ہیں جنہیں یہ لوگ خانگی حلقے (HOME CIRCLES) کہتے ہیں۔ ہر ایک حلقے میں ایک وسیط یعنی میڈیم (MEDIUM) کا وجود لازمی ہوتا ہے۔ میڈیم ایسا شخص ہوتا ہے جس پر فطرتی طور پر کوئی روح مسلط ہوتی ہے۔ گویا ایسا شخص عالمِ ارواح اور عالمِ اجسام کے درمیان بطور واسطہ اور وسیلہ کے ہوتا ہے۔ ارواح میڈیم کے وجود میں سے ہو کر حلقے میں آتی ہیں، بات چیت کرتی ہیں، کمروں کی چیزوں کو الٹ پلٹ کرتی ہیں، بغیر کسی کے ہاتھ لگائے باجے بجاتی ہیں، باہر کی چیزیں مقفل بند کمروں میں لا کر ڈال دیتی ہیں اور بند کمروں میں سے چیزیں باہر لے جاتی ہیں۔ روحیں اعلانیہ لیکچر دیتی ہیں، ان کے ریکارڈ بھرے جاتے ہیں اور ان کی تصویریں لی جاتی ہیں۔ غرض اس قسم کے بے شمار عجیب و غریب کرشمے دکھاتی ہیں کہ سائنس اور مادی عقل سے ان کی کوئی توجیہہ نہیں بن آتی۔ ان لوگوں میں علمِ روحانی کے بے شمار کالج ہیں اور ان علوم کے مختلف شعبے اور مضامین ہیں۔ دن رات یہ لوگ اس علم کی ترقی میں محو اور مصروف ہیں۔ ہم انشاء اللہ اسی کتاب کے اگلے صفحوں میں بابِ حاضرات کے اندر اس پر سیر حاصل بحث کریں گے اور اسے مفصل طور پر اور کھول کر بتائیں گے کہ ان ارواح کی نوعیت، اصلیت اور حقیقت اور ان کی حاضرات کی کیفیت کیا ہے۔ یورپ کے علماء مادیین اور مغرب کے اہلِ سائنس و اہلِ فلسفہ محققین نے سالہا سال کی تلاش و تحقیق اور عرصۂ دراز کے غور و فکر کے بعد جس ادنیٰ قریب کی ناسوتی باطنی شخصیت کا ابھی صرف پتہ لگایا ہے اور اسے معلوم اور محسوس کیا ہے ہمارے سلف صالحین اور فقرا کاملین نے ان لطیف معنوی شخصیتوں کا ایک باقاعدہ سلسلہ قائم کیا ہوا ہے اور ایک سے ایک اعلیٰ اور ارفع سات

شخصیتوں کو اپنے وجود میں زندہ اور بیدار کرکے ان کے ذریعے وہ حیرت انگیز روحانی کشف وکرامات ظاہر کیے ہیں کہ اگر اہلِ سائنس اور اہلِ فلسفہ جدید کو اس کا شمہ بھی معلوم ہو جائے تو وہ مادے کی تمام خاکرانی کو خیرباد کہہ کر روحانیت کی طرف دوڑ پڑیں اور دنیا کے تمام کام کاج چھوڑ کر اسی ضروری، نوری اور حضوری علم میں دن رات محو اور منہمک ہو جائیں۔ یہ ادنےٰ باطنی شخصیت جس کا ابھی حال ہی میں اہلِ یورپ کو پتہ لگا ہے تصوف اور اہلِ سلوک کی اصطلاح میں اسے لطیفۂ نفس کہتے ہیں۔ یہ لطیفہ ہر انسان کے اندر خام ناتمام حالت میں موجود ہے۔ اسی ابتدائی باطنی جثّے کے ذریعے انسان خواب کی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ نفس کا یہ لطیفہ جسدِ عنصری کو لباس کی طرح اوڑھے ہوئے ہے۔ اس جثّے کا عالم ناسوت ہے۔ جنّ، شیاطین اور سفلی ارواح اس مقام میں رہتی ہیں۔ پرانے زمانے کے جادوگر اور کاہن اسی ادنےٰ شخصیتِ نفس کے طفیل جادو اور کہانت کے کرشمے دکھایا کرتے تھے اور لوگوں کو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ یورپ میں آج کل کے مسمریزم، ہپناٹزم، اور سپرچولزم کے تمام حیرت انگیز کرشموں اور عجیب کارناموں کا سرچشمہ بھی یہی لطیفۂ نفس ہے۔ غرض جو کچھ بھی ہو یہ بات اب سب علما متقدمین اور متاخرین اور اہلِ سلف اور اہلِ خلف محققین کے نزدیک یکساں طور پر مسلّم ہے کہ روح موت کے بعد زندہ اور باقی رہتی ہے اور زندگی سے پہلے بھی ارواح ازل کے مقام میں موجود تھیں۔ انسانی وجود میں نفس کا لطیفہ وہ ابتدائی باطنی شخصیت ہے جس کے زندہ اور بیدار ہونے سے انسان جنات کے باطنی لطیف عالم میں قدم رکھتا ہے۔ اس لطیفے کے زندہ اور بیدار ہونے کے دو مختلف طریقے ہیں: ایک نوری اور دوم ناری۔ نیک عمل، اللہ تعالیٰ کا ذکر فکر، عبادت، نماز، روزہ اور تصوّر اسم اللہ ذات وغیرہ اشغال نوری طریقہ ہے اور خالی نفس کی مخالفت، ریاضت اور یکسوئی سے ناری صورت میں یہ لطیفہ زندہ اور بیدار ہو جاتا ہے اور یہ نوری یا ناری صورت میں لطافت اختیار کرتا ہے۔ اور وہ زندہ اور بیدار ہو کر نفس کے لطیف عالمِ ناسوت میں داخل ہو جاتا ہے۔ ناری نفس کے ہمراہ جنّ اور شیاطین اور سفلی ارواح باطن میں ملاقی اور رفیق بن جاتے ہیں۔ یورپ کے سپرچولسٹس (SPIRITUALISTS) اس مقام میں جنّ، شیاطین اور سفلی ارواح کی حاضرات کرتے ہیں۔ اسی مقام میں کاہنوں کی کہانت اور ساحروں کے سحر کا عمل ہوتا ہے اور اسی مقام میں

ہپناٹسٹ (HYPNOTIST) اپنے معمول کو مقناطیسی نیند سُلا کر اس سے کام لیتا ہے۔ یہ لطیفہ خام اور خوابیدہ حالت میں ہر شخص کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے انسان خواب دیکھتا ہے۔ اسی کو نفسِ تحت الشعوری (UNCONSCIOUS MIND) بھی کہتے ہیں جس کے ذریعے مسمرائیزر مسمرزم کے عمل کرتا ہے۔ اس لطیفے کے عجائبات بے شمار ہیں۔ اگر سب کو تفصیل کے ساتھ لکھا جائے تو ایک الگ کتاب بن جائے۔ اسی کی بدولت طالبوں کو کشفِ جنونی حاصل ہوتا ہے۔ ماضی و مستقبل کے حالات کو بتاتا ہے اور لوگوں کے نزدیک صاحبِ کشف و کرامات مشہور ہو جاتا ہے۔ اس مقام میں عالمِ غیب کے جن مسخر ہو جاتے ہیں اور عامل ان سے ہر طرح کی خدمت اور کام لیتا ہے۔ اپنے مخالفوں کو جنات کے ذریعے نقصان اور دکھ پہنچاتا ہے۔ زمین پر طیر سیر کرتا ہے۔ جنات کے ذریعے لوگوں میں محبت اور عداوت پیدا کرتا ہے۔ جنات سے آسیب دور کرتا ہے اور سلبِ امراض کرتا ہے۔ غرض اس لطیفے کے ذریعے عوام لوگوں کے سامنے بے شمار سفلی شعبدے اور ناسوتی کرشمے دکھائے جا سکتے ہیں۔ خام جہلا کو ایک ہی نظر سے توجہ جنونیت کے ذریعے دیوانہ اور پاگل بنایا جا سکتا ہے۔ غرض اسی ایک ادنےٰ لطیفے کے عجائب و غرائب بے شمار ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے شخص کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی ہے۔ اس قسم کا ابتدائی عامل اگر اس مقام پر ساکن اور راضی ہو جائے تو خواص کاملین عارفین کے نزدیک مکھی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے سفلی کرشمے ایک بے دین جوگی، سنیاسی، تارک الصلوٰۃ اور غیر شرع آدمی سے بھی صادر ہو سکتے ہیں۔ غرض اس مقام میں جن، شیاطین اور سفلی ارواح سے اتحاد پیدا کر کے وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو ایک جن، شیطان، اور سفلی روح کر سکتی ہے۔ ہوا میں پرندوں کی طرح اڑتا ہے، آگ میں داخل ہوتا ہے اور اسے کچھ ضرر نہیں پہنچتا، دریا پر چلتا ہے، ایک جگہ غوطہ لگاتا ہے اور دوسری جگہ نمودار ہو جاتا ہے، ایک دم میں اور ایک قدم پر مشرق سے مغرب تک جا پہنچتا ہے۔ اس لیے جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اِذَا رَأَیْتَ رَجُلًا یَطِیْرُ فِی الْھَوَآءِ وَیَمْشِیْ عَلَی الْمَاءِ وَتَرَکَ سُنَّۃً مِنْ سُنَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاضْرِبْہُ بِالنَّعْلَیْنِ فَاِنَّہٗ شَیْطَان" وَمَا صَدَرَ مِنْہُ فَھُوَ مَکْر" وَ اِسْتِدْرَاج"۔ ترجمہ: "جب تو کسی شخص کو دیکھے کہ ہوا میں اڑتا ہے اور پانی پر چلتا ہے

درآں حالیکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کا تارک ہو تو بلا تامل اسے جوتوں سے مار کیونکہ وہ شیطان ہے اور جو کچھ اس سے صادر اور ظاہر ہو رہا ہے وہ مکر اور استدراج ہے۔"

مردِ درویش بے شریعت اگر پرد بر ہوا مگس باشد
درچوں کشتی رواں شود بر آب اِعتمادش مکن کہ خس باشد

(ذکر یہ رازی)

یورپ کے جملہ روحانیین اور علمِ نفسیات کے ماہرین خصوصاً اہلِ سپر چولزم (SPIRITUALISM) جو اپنے روحانی حلقوں اور نشستوں میں ارواح کی حاضرات کر کے ان سے بات چیت کرتے ہیں اور اہلِ ہپناٹزم (HYPNOTISM) جس کے ذریعے عامل معمول کو مقناطیسی نیند سلا کر اس کی باطنی شخصیت یعنی اسی لطیفہ نفس سے مختلف کام لیتا ہے۔ اور اہلِ مسمرزم (MYSMERISM) جو مختلف سفلی شعبدے دکھاتا ہے، دنیا کے تمام ساحر و جادوگر اور جملہ سفلی عاملین کی دوڑ دھوپ اسی ادنیٰ لطیفہ نفس تک محدود ہوتی ہے۔ اس سے آگے ذرّہ بھر تجاوز نہیں کرتے۔ اگرچہ نفسانی مادی عقل والوں کے نزدیک یہ ناسوتی کرشمے بڑے کمالات سمجھے جاتے ہیں لیکن کامل عارفوں کے نزدیک پرکاہ کے برابر وقعت بھی نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سب ناسوتی نفسانی کمال والے اپنے ان شعبدوں اور کرشموں کے ذریعے کمینی دنیا کی تجارت کرتے پھرتے ہیں۔ اگر انہیں اپنے خالق خدا کی کچھ خبر ہوتی تو وہ چند روزہ فانی اور ہیچ دنیا کے بدلے اپنے عمل کو فروخت نہ کرتے پھرتے۔ سچ پوچھو تو یورپ کی سپر چولزم، ہپناٹزم اور مسمرزم یہ سب اسلامی باغ تصوف کے ابتدائی خام میوے کے خوشہ چین ہیں۔ ہپناٹزم کا پیشرو مسمرزم ہے۔ یورپ کے اندر اس علم کو فروغ سب سے زیادہ ہنگری اور اس کے بعد آسٹریا میں ہوا۔ مسمرزم کا داعیِ اوّل ڈاکٹر مسمر آسٹریا کے پایۂ تخت ویانہ کا رہنے والا تھا۔ یورپ میں ہنگری ہی وہ ملک ہے جسے ترکی کے مشہور بکتاشی صوفیوں نے اپنا سب سے بڑا روحانی مرکز

---

[1] اگر مردِ درویش شریعتِ مطہرہ کی پیروی کے بغیر ہوا پر بھی اڑے تو وہ ایک مکھی ہے۔ اگر کشتی کی طرح پانی پر چلنا شروع کرے تو اس کا اعتماد نہ کر۔ یہ عمل ایک تنکے کے برابر ہے۔

بنایا تھا۔ بوڈاپسٹ میں حضرت بابا گلشن بکتاشیؒ کا مزار آج بھی مرجع انام ہے۔ یہاں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ عیسائی بھی اپنی مرادیں مانگنے کے لیے بکثرت جاتے ہیں۔ حضرت بابا گلشنؒ کے متعلق مشہور ہے کہ یہ بزرگ مریضوں پر ہاتھ پھیر کر ان کے مرض دور کر دیتے تھے۔ ان کے مزار کے قریب ایک چھوٹا سا چشمہ ہے جس کے پانی کو آج تک دفع امراض کے لیے اکسیر سمجھا جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں حاجی قندش بکتاشی ہنگری کے مشہور ترین صاحب کرامت بزرگ ہوگذرے ہیں۔ ان کی خانقاہ ہنگری کے قصبہ ناغی کنیزسا (NAGHI KANIZSA) میں تھی۔ ابی سینیا وغیرہ کے ہزاروں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے عیسائی بھی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ یورپ کے مشہور مستشرق ڈاکٹر زویمر نے حاجی قندش بکتاشی کے حالات قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب حاجی صاحب کے سامنے کوئی مریض لایا جاتا تھا تو آپ چند دعائیں پڑھ کر اس پر دم کرتے تھے اور اسے چت لٹا کر دونوں ہاتھ اس پر پھیرتے تھے تو مریض چند ہی منٹوں میں صحت یاب ہو جاتا تھا۔ ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ ان کا عطا کردہ تعویذ جس شخص کے بازو سے بندھا ہوتا اس پر تلوار، سنگین اور بندوق کی گولی اثر نہیں کرتی تھی اور حاجی صاحب تلواروں، سنگینوں اور گولیوں کے گہرے زخموں کو ہاتھ پھیر کر اور اپنا لعابِ دہن لگا کر اچھا کرتے تھے۔ اور یہ بات آپ کی نسبت مشہور تھی کہ آپ جس شخص کی طرف گھور کر دیکھتے تھے وہ شخص بے ہوش اور بے خود ہو جاتا تھا۔ اس لیے حاجی صاحب اکثر اپنے چہرے پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔

ڈاکٹر مسمر کی شہرت کا آغاز اٹھارھویں صدی کے آخری حصے میں ہوا۔ جس طرح سے اور بہت سے عیسائی حضرت حاجی صاحب کے سلسلۂ بکتاشی میں داخل تھے اسی طرح ڈاکٹر مسمر کو بھی حضرت حاجی صاحب یا ان کے کسی خلیفہ سے ارادت تھی۔ ڈاکٹر مسمر نے ان سے اسلامی تصوف کا طریقۂ توجہ معلوم کیا اور سیکھا اور بعدہٗ اسے مادیت کا رنگ دے کر حیوانی مقناطیسیت کے نام سے اُسے موسوم کر کے سلب امراض میں اسے استعمال کیا۔ عملِ تنویم یا مسمرزم اور ہپناٹزم کے دامن میں جو کچھ بھی ہے وہ صوفیوں کے ابتدائی لطیفۂ نفس کے اشغال کا دھویا ہوا خاکہ اور چربہ ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ تصوف کامل ہے اور مسمرزم

ناقص۔ تصوف نور ہے اور مسمرزم نار ہے۔ تصوف کا رخ دین کی طرف ہے اور مسمرزم کا رخ دنیا کی جانب ہے۔ تصوف کا مرجع خدا ہے اور مسمرزم کا مرجع دنیا و مافیہا ہے۔

جن شیاطین اور ارواحِ خبیثہ بعض دفعہ کسی گھر یا مکان کے اندر سکونت اور رہائش اختیار کر لیتے ہیں اور وہاں کے رہنے والوں کو خواب اور بیداری میں ڈراتے اور دکھ پہنچاتے ہیں۔ دنیا میں تقریباً کوئی شہر ایسا نہ ہوگا جس کے کسی گھر یا مکان میں یہ غیبی لطیف مخلوق نہ رہتی ہو۔ ایسے مکانوں کو عُرف عام میں آسیب زدہ یا بھارے مکان کہتے ہیں۔ یورپ میں ایسے مکانوں کو ہانٹیڈ ہاؤسز (HAUNTED HOUSES) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض وجن بے آزار ہوتے ہیں اور گھر والوں کو کوئی دکھ اور آزار نہیں پہنچاتے بلکہ ان کی دیگر موذی جنات سے حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے بذاتِ خود اس قسم کے آسیب زدہ گھر دیکھے ہیں اور انہیں جن شیاطین کی آماجگاہ پایا ہے۔ بعض جن شیاطین اور ارواحِ خبیثہ انسانوں پر مسلط ہو جاتے ہیں جس سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور وہ لاعلاج امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن شیطان اور بد روح کے انسانی جسم میں داخل ہونے سے علاوہ اور امراضِ بدنی کے ان کے اخلاق اور اعتقادات پر بھی برا اثر پڑتا ہے اور جب ان کے ناری اور خبیث اثر سے کسی انسان کا دل اور دماغ متاثر ہو جاتا ہے تو وہ پاگل، دیوانہ اور مجنون ہو جاتا ہے۔ ان کے مختلف فرقے اور اقسام ہیں اور ان کے علیحدہ وصف اور الگ الگ کام ہیں۔ ان کی ایک قسم وہ ہے جو پہاڑوں کے چشموں اور غاروں میں رہتی ہے۔ ان میں ایک دوسرا گروہ ہے جو شہروں کے گھروں اور مکانوں میں رہائش رکھتا ہے۔ تیسرا ایک فرقہ ہے جو قبرستانوں اور مرگھٹوں کے اندر رہتا ہے۔ یہ انسانوں کے ہمراہ رہنے والے طبعی جن اور شیاطین ہوتے ہیں جو موت کے بعد انسان سے مفارقت اختیار کر کے کچھ عرصہ ان کی قبروں اور مرگھٹوں پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ جن شیاطین اکثر مردوں کے خویش و اقارب پر بھی مسلط ہو جایا کرتے ہیں۔ ہندو لوگوں میں یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ مرنے کے بعد مردہ کی روح بھوت بن کر اس کے خویش و اقارب میں سے کسی پر مسلط ہو جاتی ہے۔ اسی لیے یہ لوگ مردہ جلاتے وقت اپنا حلیہ اور لباس تبدیل کر لیا کرتے ہیں اور بعض ہندو قبیلے تو تبدیلی ہیئت میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ اپنے سر، داڑھی اور مونچھوں کے بال تک منڈھوا

ڈالتے ہیں تا کہ مردہ کی روح بھوت بن جانے کے بعد انہیں پہچان نہ سکے اور اس طرح وہ اس کے تسلط سے محفوظ ہو جائیں۔

..........................O..........................

# مقصدِ حیات اور ضرورت اسم اللہ ذات

واضح ہو کہ ازل کے روز جب اللہ تعالیٰ نے کُل ارواح کو جوہر نورِ اسم اللہ ذات سے لفظ کُن کہہ کر پیدا کیا اور تمام ارواح کو اپنے سامنے لا کر حاضر کیا اور ان پر اپنی ربوبیت کا اظہار کیا تو اس وقت سوال کیا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ط (الاعراف ۷: ۱۷۲) ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں'' اس وقت چونکہ تمام ارواح کی آنکھیں نورِ اسم اللہ ذات سے منوّر اور سُرمۂ معرفت سے سُرمگیں تھیں اور ہر کدورت اور آلائش سے پاک تھیں سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا ''بَلٰی'' یعنی ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے۔ اس کے بعد صرافِ حقیقی نے ان کے نقدِ قال اور متاعِ اقرار کو اعمال اور احوال کی کٹھالیوں یعنی عنصری جثوں میں ڈال کر دارالامتحان دنیا کی بھٹی میں گلا کر دیکھنا اور پرکھنا چاہا۔ لہٰذا اسے احسن تقویم سے اتار کر اسفل السافلین میں اتارا اور اس کی فطرتِ نورانی میں نارِ شیطانی اور دودِ ظلمتِ نفسانی اور کدورت و آلائشِ دنیائے فانی ملادی اور ارواح کی طاقتِ ایفا اور اخلاصِ وعدۂ بلیٰ اور قوتِ اقرارِ عبودیت کی پوری پوری پرکھ اور آزمائش فرمائی۔ چنانچہ ان کو بہشتِ قرب و وصال اور جنتِ حضور سے نکال کر غیب اور بُعد کے بیابانِ دنیا میں لا اتارا اور ارواح کے آزاد روحانی طیور کو باغِ پاک سے نکال کر اجسامِ خاک کے پنجروں میں ڈال دیا اور نفس و شیطان جیسے زبردست صیّادوں کے ہاتھ ان کی ڈوریں دے دیں۔ جس وقت انسان ضعیف البنیان دنیا کے کمرۂ امتحان (اپریشن روم) میں اتارا گیا تو اس کے ازلی دل و دماغ کو جیفۂ دنیا کے کلوروفارم نے اپنے ازلی ہوش سے مدہوش کر دیا اور اس معبود و محبوبِ حقیقی کے وعدۂ الست اور اس کی یاد کو اس سے یک دم فراموش کر دیا۔ حدیث: رَوٰی جُوَیْبَر '' عَنِ الضَّحَاکِ قَالَ اَھْبَطَ اللّٰہُ اٰدَمَ وَحَوَّاءَ اِلَی الْاَرْضِ وَوَجَدَا رِیْحَ الدُّنْیَا وَفَقَدَا رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ فَغَشِیَ عَلَیْھِمَا اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا مِّنْ نَّتَنِ الدُّنْیَا۔ ترجمہ: ''جویبرؒ نے ضحاکؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام اور حوا کو جب اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا تو ان کے دماغ اور مشام میں دنیا کی بدبو گھس گئی اور جنت کی ہوا جاتی رہی تو چالیس روز تک وہ دنیا کی بدبو سے بے ہوش پڑے رہے۔'' اس واسطے انسان کا ازلی فطرتی نوری چراغ اسم

اللہ ذات دنیا کے کثیف حجابوں اور نفسانی تاریکیوں اور شیطانی ظلمتوں میں چھپ گیا۔ گویا روح کا یونس مادے کی مچھلی کے پیٹ میں پڑ گیا جس سے بغیر ذکرِ اسم اللہ ذات کے نکلنا محال ہے۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ o لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖٓ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ o (والصّٰفّٰت ۳۷: ۱۴۳ - ۱۴۴)۔ یعنی "اگر یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں اسم اللہ کی تسبیح نہ پڑھتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔" اب انسان بچارا اغلال وسلاسل عوائق دنیا میں جکڑا ہوا قرب ومعرفت کی نوری بارگاہ سے دور پڑا ہوا ہے۔ دنیا کے بحرِ ظلمات میں اس ازلی آبِ حیات کے سرچشمے کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے جو اس کے خاکی وجود کی مٹی میں دبا پڑا ہوا ہے۔ اب سوائے ذکر اسم اللہ ذات کے بیلچے کے اس چشمے کا نکالنا محال ہے اور سوائے ذکر کے عروۃالوثقیٰ (مضبوط رسی) کے یوسفِ روح کا چاہِ غفلتِ دنیا سے باہر آنا بہت دشوار ہے۔ اس دنیا کے ظلمت کدہ اور اندھیری رات میں انسان کا انیس، غم گسار اور مشعلِ راہ صرف چراغ تصور اِسم اللہ اور قندیلِ خیالِ اسم اللہ ہی ہے اور بس۔ اب اللہ تعالیٰ کی معرفت اور شناخت کے لیے سوائے ذکر اللہ کے اور کوئی ذریعہ اور وسیلہ نہیں ہے کیونکہ خالق ومخلوق، رازق ومرزوق، واجب وممکن، قدیم وحادث اور رب وعبد کے درمیان سوائے ذکر اللہ کے اور کوئی رشتہ اور واسطہ ہی نہیں ہے۔ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ o (الغاشیۃ ۸۸: ۲۱)۔ یہی باطنی ٹیلیفون اور روحانی تارِ برقی ہے جس نے عبد اور معبود کو آپس میں ملایا ہے۔ بندہ اپنے رب کے ساتھ محض ذکر ہی کے رشتے سے وابستہ ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (اٰل عمرٰن ۳: ۱۰۳) سے یہی رسی مراد ہے جس کا ایک سرا خالق کے ساتھ آسمان میں اور دوسرا مخلوق کے اندر دنیا میں لگا ہوا ہے۔ جس نے اس رسی کو مضبوط پکڑ لیا وہ اپنے خالق کی نوری بارگاہ تک چڑھ گیا اور جس نے اس سے اعراض اور کنارا کیا وہ دنیا کے ظلمت کدہ میں ابدالآباد تک اندھا رہا۔

یاں آ کے ہم اپنے مدعا کو بھولے ۔۔۔ مِل مِل کے غیروں سے آشنا کو بھولے
دنیا کی تلاش میں گنوائی سب عمر ۔۔۔ اِس مِس کی طلب میں کیمیا کو بھولے

(اکبرالہ آبادی)

نہیں دیکھتے کہ جب کسی شخص کا دوست یا آشنا طویل عرصہ کے لیے جدا ہو جاتا ہے تو

اس کے دل و دماغ سے اس کی یاد کافور ہو جاتی ہے اور اگر مدت کے بعد وہ دوست آ ملے تب بھی اس کو پہچان نہیں سکتا۔ ہاں البتہ آپس میں گفت وشنید، ذکر اذکار اور پتہ ونشان بتانے سے پہچان تازہ اور معرفت واضح ہو جاتی ہے۔ یا وہ دوست سے جدا ہونے کے عرصے میں اگر نامہ و پیام اور خط و کتابت جاری رکھے تب بھی اس دوست و آشنا سے جان پہچان قائم رہتی ہے اور وہ اس سے فراموش نہیں ہوتا۔ یہی حال اس ازلی بچھڑی ہوئی انسانی روح کا ہے جو بہشتِ قرب وحضور سے نکل کر دور دراز بیابانوں میں اپنے محبوبِ حقیقی سے دور جا پڑی ہے۔ اب اس جدائی کے عرصے میں اگر انسان اپنے محبوب ومطلوب کے ساتھ فَاذْكُرُونِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲ : ۱۵۲) کے مطابق ذکر کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھے گا تو البتہ وہ اپنے محبوبِ حقیقی کو نہیں بھولے گا۔ کیونکہ محبوبِ ازلی بھی جواباً اور ایجاباً بمقتضائے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت ۲۹ : ۶۹) اپنی طرف بلانے اور اپنے ساتھ ملانے کا اہتمام اور انتظام فرمادے گا اور اسم اللہ ذات کے برق براق پر سوار کر کے اپنے محبوب اور مشتاق کو اپنی پاک نوری بارگاہ میں شرفِ باریابی بخشے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ٥ (ابرٰھیم ۱۴ : ۲۰) ۔ اس مادی دنیا میں کچھ عرصہ کے جدا شدہ دوست کی شناخت اور پہچان جس وقت ملنے اور آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد بھی بغیر ذکر اذکار اور گفتگو کے مشکل ہو جاتی ہے تو بھلا ازل کے جدا شدہ مطلوب ومقصود اور مدتِ مدید کے مفقود معبود کی شناخت اور معرفت بغیر ذکر اذکار کیوں مشکل اور دشوار نہ ہو۔ سو معلوم ہو گیا کہ آنکھیں بھی ذکر کی محتاج ہیں اور دید کو قوت شنید سے ہے، عیان کو طاقت بیان سے ہے اور ہوش کو راستہ گوش سے ہے۔ یہاں ذکر کی اہمیت عیاں ہو جاتی ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(جامیؒ)

ترجمہ: عشق صرف دیدار سے ہی پیدا نہیں ہوتا اکثر اوقات یہ دولت گفتگو سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

لہٰذا انسان کو اس دنیا میں اس ازلی یاد کو تازہ کرنے کے لیے اور وعدۂ بَلٰی کے ایفا کرنے اور اپنے محبوبِ حقیقی کی معرفت اور شناخت کے لیے ذکر کی اشد ضرورت ہے اور

اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ جب کسی شخص کو نام سے یاد کیا جاتا ہے تو یاد کرنے والے ذاکر کے دل کی ایک برقی رو شخص مذکور تک جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے ذاکر کے دل کی برقی رو بھی مذکور اللہ تعالیٰ تک چلی جاتی ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی ہی بے مثل و بے مثال ہے اور اس کا کوئی مکان و نشان معلوم نہیں لیکن اس نے اپنے مقبول مقرب بندوں یعنی پیغمبروں اور اولیاء کرام کے ذریعے اپنا پتہ نشان اور اپنے ملنے ملانے کا ذریعہ، وسیلہ اور سامان یوں بتایا ہے کہ میں انسان کے بہت قریب ہوں۔ بلکہ اس کی شہ رگ اور اس کی ذات سے بھی اس کے بہت قریب ہوں۔ اور کوئی شخص مجھے ملنا چاہے تو وہ میرے ذکر کے ذریعے مجھے مل سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم عنقریب بیان کریں گے۔ پس جس وقت ذاکر اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اس کے ذکر کی برقی رو اللہ تعالیٰ تک دوڑ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ایجاباً اس ذکر کا جواب دیتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔ فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲ : ۱۵۲) یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ سو یہ تو معلوم ہو گیا کہ ذاکر و مذکور یعنی عبد اور معبود کے درمیان ذکر کی تار برقی جاری ہو جاتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس ذکر کی تار برقی سے کیا اور کیوں کر فائدہ ہوتا ہے۔ سو یاد رہے کہ ذکر کی یہ برقی رو چونکہ انسان کے دل و دماغ کے دو تاروں سے نکلتی ہے سو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو سانس ذاکر کا باہر جاتا ہے وہ ذاکر کے دل کی صفت مذکور کے دل تک پہنچاتا ہے اور جب واپس آتا ہے تو مذکور کے دل کی صفت اور باطنی بو ذاکر کے دل تک لاتا ہے۔ اسی طرح باطن میں ذاکر اور مذکور کے دل اور دماغ کی صفات اور باطنی حالات اور خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ پس ناقص خام ذاکر کامل مذکور کی اعلیٰ اور پاک صفات سے متصف ہوتا اور اس کے حمیدہ اور منزہ اخلاق سے متخلق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عبد اور معبود کے درمیان جس وقت فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲ : ۱۵۲) کی ٹیلیفون یا رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (المائدہ ۵ : ۱۱۹) کی تار برقی اور يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدہ ۵ : ۵۴) کی لاسلکی رو جاری ہو جاتی ہے تو بندہ ناتوان انسان جو کہ دنیوی علائق و عوائق کی زنجیروں میں جکڑا ہوا اور نفسانی شہوات اور خواہشات کے سلاسل اور اغلال اور شیطانی ظلمتوں اور تاریکیوں میں گرفتار ہے ذکر کے اس پاک رشتے اور تعلق سے اس کو تائید غیبی پہنچتی رہتی ہے اور اس کی

باطنی بیڑیاں اور روحانی زنجیریں ٹوٹنے لگ جاتی ہیں۔ اور اگر وہ کثرتِ ذکر پر استقامت اور مداومت کرے تو اسے کُلّی طور پر چھٹکارا حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o (الجمعة ۶۲ : ۱۰)۔ ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو، تا کہ تم چھٹکارا اور خلاصی پالو۔'' اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ذاکر کے اوصافِ ذمیمہ اور اخلاقِ قبیحہ رفتہ رفتہ اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ سے بدل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ملکوتی اوصاف سے موصوف ہو کر اللہ تعالیٰ کے قرب، وصال اور مشاہدے کے قابل ہو جاتا ہے اور آخر اللہ تعالیٰ اسے اپنے انوارِ دیدار میں جذب کر کے باطن میں اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی معرفت، قرب اور وصال کا ذریعہ اور وسیلہ محض ذکر ہے اور تمام اذکار میں افضل الاذکار اور تمام ذکروں کا خلاصہ اور جامع اذکار ذکر اسم اللہ ذات ہے۔ ذکر اور اسم اللہ ذات کی فضیلت اور اہمیت سے قرآنِ کریم بھرا ہوا ہے اور احادیثِ نبویؐ میں بھی جا بجا ذکر اللہ کی کمال تاکید موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (اٰلِ عمرٰن ۳ : ۱۹۱) یعنی ''اللہ تعالیٰ کے خاص الخاص بندے ہیں جو اسے کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہر حالت میں یاد کرتے ہیں۔'' اور نیز ارشاد ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط (العنکبوت ۲۹ : ۴۵) وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ o (طٰهٰ ۲۰ : ۱۴)۔ ترجمہ: ''تحقیق نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے انسان کو روک دیتی ہے۔ واقعی ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے۔ اور میری یاد اور ذکر کی خاطر نماز ادا کر۔'' قولہٗ تعالیٰ: وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ لا اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا o (الاحزاب ۳۳ : ۳۵)۔ ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والے مردوں اور عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی مغفرت اور عظیم اجر اور انعام تیار کر رکھے ہیں۔'' قولہٗ تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا لا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا o (الاحزاب ۳۳ : ۴۱ - ۴۲)۔ ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو اور صبح و شام اس کے نام کی تسبیح پڑھا کرو۔'' حدیث: عَنْ اَبِى الدَّرْدَاءِؓ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ اَعْمَالِكُمْ وَاَزْكٰهَا عِنْدَ مَلِيْكِكُمْ وَاَرْفَعِهَا فِىْ دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ اِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ

وَخَیْرٍ لَّکُمْ مِنْ اَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّکُمْ فَتَضْرِبُوْا اَعْنَاقَھُمْ وَیَضْرِبُوْا اَعْنَاقَکُمْ قَالُوْا بَلٰی قَالَ ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی (مشکوٰۃ)۔ ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ آیا میں تم کو ایسا عمل نہ بتاؤں جو تمام اعمال سے بہتر ہو اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہو اور تمہارے تمام درجات سے بلند تر ہو اور تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی راہ میں سونا چاندی خرچ کرنے سے بھی بہتر ہو۔ اور اس بات سے بھی افضل ہو کہ تم اللہ کی راہ میں دشمنوں سے لڑو ایسی حالت میں کہ تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں یارسول اللہ ﷺ ہمیں وہ بہتر عمل ضرور بتایئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے۔'' بعض لوگ اس حدیث سے تعجب کرتے ہوں گے کہ بھلا ذکر اللہ جیسا زبانی عمل جہاد جیسے کٹھن اور جانبازانہ عمل سے کیونکر افضل اور بہتر ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہم اس حدیث کی تصدیق اور تائید میں خود قرآن مجید کی آیت پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ط (الحج ۲۲: ۴۰)۔ ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ اگر بعض (مسلمان) لوگوں کو بعض (کافر) لوگوں سے لڑا کر ان کے دفعیے اور روک تھام کا اہتمام اور انتظام نہ کرلیتا تو البتہ عابدوں کے عبادت خانے، منڈیاں، نمازگاہیں اور مساجد سب کافروں کے ہاتھوں ویران اور برباد ہوجاتے جن میں کثرت سے ذکر اللہ کیا جاتا ہے۔'' سو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافروں کے ساتھ جہاد کی غرض اور غایتِ محض مساجد اور عبادت گاہوں اور مذہبی و روحانی جلسوں اور تقریبات کی حفاظت اور نگرانی ہے اور ان سب کا آخری اور حقیقی مقصد جو آخر میں بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ط (الحج ۲۲: ۴۰)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر ان میں کثرت سے کیا جائے۔ سو اسباب اور ذرائع غرض اور مقصدِ اصلی سے کسی صورت میں بہتر نہیں ہوسکتے۔ اور ایک دوسری حدیث ہے: قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ مَامِنْ شَیْءٍ اَنْجٰی مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ قَالُوْا وَلَا الْجِھَادُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ وَلَا الْجِھَادُ وَلَوْ یُضْرَبُ بِالسَّیْفِ حَتّٰی یَنْقَطِعَ۔ ''رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ذکر اللہ سے بہتر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دینے والی چیز اور کوئی نہیں ہے۔ صحابہؓ نے

عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا جہاد بھی ذکر اللہ سے بہتر نجات دہندہ نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جہاد بھی نہیں اگرچہ تم اس میں تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جاؤ۔'' قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ یَتَحَسَّرُ اَھْلُ الْجَنَّۃِ اِلَّا عَلٰی سَاعَۃٍ مَرَّتْ بِھِمْ وَلَمْ یَذْکُرُوا اللّٰہَ تَعَالٰی فِیْھَا۔ ترجمہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہشتی لوگ دنیا کی کسی چیز کے فوت ہو جانے کی حسرت اور ارمان نہیں کریں گے سوائے اس گھڑی اور دم کے جو اُن پر دنیا میں یادِ الٰہی کے بغیر گذرا ہوگا۔'' حدیث: اِذَا ذَکَرْتَنِیْ شَکَرْتَنِیْ وَاِذَا نَسِیْتَنِیْ کَفَرْتَنِیْ۔

ترجمہ: ''جس دم میں اے بندے تو نے مجھے یاد کیا تو تُو نے میرا شکر یہ ادا کیا اور جس دم میں تُو مجھ سے غافل ہوا تو تُو نے کفرانِ نعمت کیا۔''

کسے[1] کو غافل از وے یک زمان است

در آں دم کافر است لٰکن نہان است

(رومی)

حدیث: قَالَ مُوْسٰی یَارَبِّ اَقَرِیْبٌ'' اَنْتَ فَاُنَاجِیْکَ اَمْ بَعِیْدٌ'' فَاُنَادِیْکَ فَاِنِّیْ اَحِسُّ صَوْتَکَ وَلَا اُرِیْکَ فَاَیْنَ اَنْتَ قَالَ اللّٰہُ اَنَا اَمَامَکَ وَاَنَا خَلْفَکَ وَعَنْ یَمِیْنِکَ وَعَنْ شِمَالِکَ یَامُوْسٰی وَاَنَا جَلِیْسُ'' عَبْدِیْ حِیْنَ یَذْکُرُنِیْ وَاَنَا مَعَہٗ اِذَا دَعَانِیْ۔ ترجمہ: ''موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اے میرے رب! اگر تو میرے قریب رہتا ہے تو میں تجھ سے آہستہ اپنی عرض معروض گذاروں۔ اور اگر تو کہیں دور ہے تو تجھے زور سے پکارا کروں۔ کیونکہ اے میرے مولے میں تیری خوبصورت آواز کو سنتا تو ہوں لیکن تو نظر نہیں آتا۔ پس تُو مجھے بتا کہ تُو کہاں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ اے موسیٰ میں تیرے آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر طرف سے قریب ہوں۔ جس وقت کوئی بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے پاس بیٹھا ہوا ہوتا ہوں اور جب وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ وَاَوْحَی اللّٰہُ تَعَالٰی اِلٰی مُوْسٰی اَتُحِبُّ اَنْ اَسْکُنَ مَعَکَ فِیْ بَیْتِکَ یَامُوْسٰی۔ فَخَرَّ لِلّٰہِ سَاجِدًا وَّقَالَ یَارَبِّ کَیْفَ تَسْکُنُ

---

[1] وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے ایک لمحہ بھی غافل ہے اس لمحے وہ کافر ہے۔ البتہ اس کا یہ کفر چھپا ہوا ہے۔

مَعِیُ فِیُ بَیۡتِیُ، قَالَ یَامُوۡسٰی اَنَا جَلِیۡس " مَعَ مَنۡ ذَکَرَنِیۡ وَحَیۡثُ مَاالۡتَمَسَنِیۡ عَبۡدِیۡ وَجَدَنِیۡ ۔ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اے موسیٰ آیا تو چاہتا ہے کہ میں تیرے ساتھ تیرے گھر میں رہوں۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام خوشی سے سجدے میں گر پڑے اور عرض کی کہ اے اللہ تو کیونکر میرے ساتھ میرے گھر میں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: اے موسیٰ کیا تو نہیں جانتا کہ میں اپنے یاد کرنے والے کے پاس بیٹھا رہتا ہوں اور جب کبھی میرا بندہ مجھے ڈھونڈتا ہے وہ مجھے پالیتا ہے۔'' دیگر بے شمار آیاتِ قرآنی اور احادیثِ کثیرہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمام اعمال سے افضل عمل محض ذکر اللہ ہے۔ دیگر سب اعمال اس سے کم تر اور ادنےٰ درجے کے ہیں۔ اور تمام آسمانی کتابوں خصوصاً قرآنِ کریم اور احادیث کا خاصہ خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ انسانی زندگی کی اصلی غرض اور حقیقی مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت، معرفت، قرب اور وصال ہے اور اس کا واحد ذریعہ ذکر اللہ اور اسم اللہ ہے۔ اور تمام مذاہب اور خاص کر اسلام انسان کو اللہ تعالیٰ کے اسم کے ذریعے مسمّٰی تک یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ اور اسلام کے جس قدر ارکان مثلاً فرائض، واجبات، سنن اور مستحب ہیں سب اسی ایک عمل یعنی ذکر اللہ کے مختلف مظاہرے ہیں۔ یا اسی غرض کے امدادی، معاون اور اسی ایک ہی عمل کی تکمیل کے ذرائع اور اسباب ہیں۔ تمام قرآن اور جملہ سورتیں اسم اللہ یعنی بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ سے شروع ہوتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ تمام قرآن سورۃ فاتحہ میں مندرج ہے اور تمام سورۃ فاتحہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں اس طرح مندرج ہے جس طرح کہ تخم اور پھل کے اندر درخت یا پودا ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا ذکرِ مفصل اور اسم اللہ ذکرِ مجمل ہے۔

جب پرانے عیسائی مذہب کے پادریوں سے ابتدائے آفرینش کی بابت سوال کیا جاتا ہے تو تمام یہی ایک مقولہ زبان پر دہراتے نظر آتے ہیں کہ

IN THE BEGINNING WAS WORD AND WORD WAS WITH GOD AND GOD WAS WORD.

یعنی ابتداء میں کلمہ تھا اور کلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا اور اللہ تعالیٰ خود وہ کلمہ تھا۔ گو اس

مقولے کی توجیہہ اور تفسیر سے پادری لوگ ناواقف ہیں۔ صرف طوطے کی طرح اسے زبان سے رٹ لیتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی پرانی کتاب کا مقولہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کلمہ اسم اللہ ذات ہے جو کہ ابتدا میں تخلیق کائنات سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ موجود تھا اور وہ کلمہ خود اللہ تعالیٰ تھا۔ یعنی اسم کے ساتھ مسمّٰے کا اتصال اور اتحاد تھا اور یہی اسم اور مسمّٰی کا معمّہ ہے۔ جس سے مادی عقل والے ناواقف ہیں۔ جو کہ ذکر اللہ کو محض جمود بیکاری اور اعضائے انسانی کا انعطال سمجھتے ہیں۔ لفظ انگریزی WORD اور WORLD یعنی کلمہ اور کائنات کی تشبیہ اور تجنیس سے بھی ایک دانا آدمی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ لفظ ورڈ (WORD) یعنی کلمہ کُن یا اسم اللہ ذات اور WORLD یعنی تمام جہان کی اصل ایک ہے۔ اور اسم اللہ ذات کے نور سے تمام کائنات خصوصاً انسانی وجود کی بنیاد پڑی ہے۔ انسان کی باطنی فطرت اور سرشت میں اسم اللہ ذات کا نور بطور ودیعت اور امانت روزِ ازل سے اللہ تعالیٰ نے پوشیدہ رکھ دیا ہے اور اسم اللہ ذات ہی وہ نوری رشتہ ہے جس سے انسان اپنے خالق کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی وسیلے اور ذریعے سے انسان کے اندر عالمِ غیب اور باطنی دنیا کی طرف نوری روزن اور باطنی راستہ کھل جاتا ہے۔ یہی اسم اللہ ذات تمام ظاہری و باطنی علوم و معارف و اسرار اور جملہ ذاتی، صفاتی، افعالی و اسمائی انوار اور کُل عالمِ ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت اور سارے مقامات شریعت، طریقت اور معرفت اور جمیع اذکار و لطائفِ نفسی، قلبی، روحی، سری، خفی، اخفیٰ و انا اور کل درجات اسلام، ایمان، ایقان، عرفان، قرب، محبت، مشاہدہ اور وصال تک پہنچنے کا واحد ذریعہ اور ان باطنی خزائن کے کھولنے کی واحد کنجی ہے۔

ذکر اللہ تعالیٰ اور اسم اللہ ذات اور مذہبی اعمال کی قدر و قیمت تو موت کے بعد معلوم ہوگی۔ دنیا کے اس بحرِ ظلمات میں بھٹکنے والے دل کے اندھے نفسانی لوگ ان باطنی جواہرات کی قدر کیا جانیں جو کہتے ہیں کہ مذہب انسان کو محض لفظ اللہ کے مطالعے کی طرف لاتا ہے جو محض جمود، بیکاری اور بے ہمہ زندگی ہے۔ اس دنیائے دارالامتحان میں ذکر اللہ اسم اللہ اور مذہبی ارکان کی اصلی اور حقیقی قدر معلوم کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ جیسا کہ ایک نقل مشہور ہے: کہتے ہیں کہ سلطان سکندر کو آبِ حیات پی کر عمرِ جاودانی حاصل کرنے کا شوق

دامن گیر ہوا۔ چنانچہ وہ اپنے مصاحبوں کے ہمراہ حضرت خضرؑ کی راہبری میں آبِ حیات کی طلب میں نکل پڑے۔ چلتے چلتے وہ ایسے مقام پر پہنچے جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جس کو بحرِ ظلمات کہتے ہیں۔ جہاں گھپ اندھیرا رہتا ہے۔ سکندر اور اس کے مصاحب بدقسمتی سے اس تاریکی کے اندر راستہ بھول گئے اور خضرؑ کی راہبری سے محروم ہو کر ان سے جدا ہو گئے۔ کچھ عرصہ اس تاریکی کے اندر اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر کر انہیں دوبارہ خضر علیہ السلام کی ملاقات نصیب ہو گئی جو آبِ حیات کے چشمے پر پہنچ کر وہاں کا پانی پی آئے تھے۔ اس وقت ان کے پاس چونکہ خرچ، خوراک اور سامانِ خورونوش ختم ہو چکا تھا مجبوراً سب کی بحرِ ظلمات سے باہر نکلنے اور اپنے وطن کی طرف لوٹنے کی صلاح ٹھہری۔ خضرؑ خیر اندیش کو اس وقت ان کی محرومی پر ترس آیا۔ تب آپؑ نے ان کو ایک نیک صلاح دی اور فرمایا کہ تمہاری قسمت میں شاید آبِ حیات مقدر نہیں تھا۔ اب میں تمہیں ایک اور فائدے کی بات بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہاں تاریکی میں تمہارے پاؤں کے نیچے جس قدر پتھر اور سنگریزے پڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں سب کے سب لعل، ہیرے اور قیمتی جواہرات ہیں۔ انہیں اپنے توشہ دانوں میں بھر لو اور اپنے ساتھ لے چلو۔ ان سے تم اپنے وطن میں بڑے مال دار ہو جاؤ گے۔ اس پر بعض اصحاب نے خضرؑ کو سچا جان کر اپنی خورجنیں ان پتھروں سے بھر لیں۔ بعض کچھ کمزور یقین والے تھے۔ انہوں نے تھوڑے سے پتھر اٹھا لیے اور باقیوں نے کہا کہ خضرؑ نے ہمیں پہلے بھی تاریکی میں اِدھر اُدھر پھرا کر پریشان کیا۔ اب یہ پتھر اٹھانے کی بے سود تکلیف بھی رائیگاں ثابت ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے کچھ نہ اٹھایا۔ جب وہاں سے روانہ ہو کر انہوں نے بحرِ ظلمات کو طے کر لیا اور روشن جہان میں پہنچ کر انہوں نے جس وقت اپنی خورجینوں کو کھول کر دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ کیونکہ انہیں معلوم ہوا کہ وہ بھاری بیکار پتھر اور سنگ ریزے گراں بہا اور قیمتی لعل، ہیرے اور جواہرات ہیں۔ اس وقت جنہوں نے پتھر مطلق نہیں اٹھائے تھے انہوں نے سخت افسوس اور غم کیا اور جنہوں نے تھوڑے پتھر اٹھائے تھے انہوں نے بھی افسوس کیا۔ غرض جو لوگ پتھر اٹھا کر لائے تھے وہ دنیا میں بڑے امیر اور مالدار ہو گئے۔ یہ ایک مثل ہے جو کہ دنیا کی مادی زندگی پر نہایت موزوں اور منطبق ہوتی ہے۔ یہ دنیا بحرِ ظلمات ہے اور اسم اللہ ذات کا نور آبِ حیات ہے جو

کہ صخرۂ دل یعنی دل کے نیچے عالمِ غیب سے پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ اس آبِ حیات سے جو سعادت مند اشخاص یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص برگزیدہ اشخاص سیراب ہوئے وہ زندۂ جاوید ہو کر خضر مثال اولیا اور انبیا بن گئے۔ جس نے اس آبِ حیات نورِ اسم اللہ ذات کو پیا اس نے ابدی سرمدی زندگی کو حاصل کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نورِ حیات سے ابدالآباد تک جیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا و آخرت میں اپنی مخلوق کا راہبر اور راہنما کیا۔

فرق است ز آبِ خضر کہ ظلمات جائے اوست
با آبِ ما کہ منبعش اللہ اکبر است

(حافظؔ)

ترجمہ: آبِ خضرؑ جس کا مقام ظلمات ہے اور ہمارے پانی میں بہت فرق ہے۔ یہاں "ہمارے پانی" سے مُراد اِسم اللہ ہے جس کا منبع خود اللہ تعالیٰ ہے اور یہ آبِ حیات سے بہتر ہے۔

اور جو اس آبِ حیات سے محروم ہیں انہیں یہ راہبر ہدایت اور نصیحت کرتے ہیں کہ اَے لوگو! یہ جو دنیا کے بحرِ ظلمات میں ظاہری دینی ارکان اور مذہبی اعمال بھاری بے کار پتھروں کی طرح تمہیں بارِ گراں معلوم ہوتے ہیں جن کی یہاں تمہیں کچھ قدر و قیمت معلوم نہیں ہوتی انہیں اپنے اصلی وطن دارِ آخرت کے روشن جہان کے لیے اُٹھالو۔ وہاں جا کر تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ لعل اور ہیرے ہیں جن سے تم دارِ آخرت میں بڑے امیر اور مالدار بن جاؤ گے۔ المختصر یہ حکایت اِس دُنیا کی تاریکی کی کیا عُمدہ مثال ہے مگر مادی نفسانی لوگ جس وقت اِس قسم کے مثالی مذہبی قصے مذہبی کتابوں میں پڑھتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان سے عبرت حاصل کر کے ہدایت پر آئیں اُلٹا تمسخر اور اِستہزا کے درپے ہو جاتے ہیں۔ سچ پُوچھو تو مادیت کی مالیخولیا اور سیاست کے سرسام نے آج کل نئی روشنی والوں کے دماغ کو بگاڑ دیا ہے۔ کنوئیں کے اندھے مینڈک کی طرح اُنہوں نے اس مادی دُنیا کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے اور اپنی مادی عقل اور ظاہری علم کے غرور اور گھمنڈ میں وہ قرآنی حقائق اور رُوحانی اسرار کا متکبرانہ مگر جاہلانہ انکار کرتے ہیں۔ لیکن جس دن یہ راستے کا گرد و غبار اُٹھ جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی بطشِ شدید اور زبردست گرفت اُنہیں جکڑ لے گی اُس دن اِن

لوگوں کی ساری اکڑ پھونک نکل جائے گی اور مادی نشے ہرن ہو جائیں گے۔

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ

اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِکَ اَمْ حِمَارٌ

یعنی "جب راستے کا غبار اٹھ جائے گا اس وقت تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو گھوڑے پر سوار ہے یا گدھے پر۔"

بروزِ حشر ترا ایں ہمہ شود معلوم

کہ باکہ باختہ عشق در شبِ دیجور

ترجمہ: قیامت کے دن تجھے یہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا کہ تو اس دنیا کی تاریک رات میں کس چیز کے ساتھ عشق لگائے بیٹھا ہے۔

ذکر اللہ اور اسم اللہ کی حقیقت اور اہمیت کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ شارعِ اسلام اور بزرگانِ دین نے ذکر اللہ اور اسم اللہ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، قرب، مشاہدے اور وصال کا واحد ذریعہ اور وسیلہ بتایا ہے۔ کیونکہ اسم عین مسمّٰے ہے۔ حدیثِ قدسی میں آیا ہے کہ میں اپنے ذکر کرنے والے کے پاس بیٹھا ہوا ہوتا ہوں۔ اور ایک دُوسری حدیث میں آیا ہے اَنَا بَیْنَ شَفَتَیْہِ اِذَا ذَکَرَنِیْ۔ یعنی جب کوئی مجھے یاد کرتا ہے تو میں اُس کے دو ہونٹوں کے درمیان ہوتا ہوں۔ سو یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اِنسان کے ہونٹوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان غیر محدود ذات کبھی نہیں آسکتی۔ ذاکر کے ہونٹوں کے درمیان تو صرف اللہ تعالیٰ کا اِسم ہی آسکتا ہے۔ سو یہاں اِسم اور مسمّٰے کے اِتصال اور اِتحاد کی طرف اشارہ ہے کہ اِسم اور مسمّٰے کے درمیان نہ صرف اِتصال ہے بلکہ اِسم مسمّٰے کی عین مثال اور عین العین ہے۔ اور یہی اصل باعث مبداء و معاد و ذریعہ پیدائشِ خلق و ایجادِ کونین ہے۔

اَب ہم لفظ اِسم اللہ ذات کی حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ واضح ہو کہ جب کسی شخص کو یاد کیا جاتا ہے تو اس کی نسبت ہر قسم کے اذکار اور باتیں اُس کی ذات یا اُس کے نام کی طرف راجع ہوتی ہیں۔ اَور سب کا مدلُول پہلے نام اور پھر اُس کی ذات ہوتی ہے۔ اور جب وہ مذکور غائب ہوتا ہے تو محض اُس کا نام اور اِسم ہی اُس کی نسبت تمام ذکر اذکار کا مرجع اَور مدلول ہوتا ہے۔ اَور سب باتیں اُس کے نام پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ نام دو قسم کے ہوتے ہیں:

ایک ذاتی، دوم صفاتی۔ ذاتی وہ نام ہوتا ہے جو کسی واحد ذات موصوف مجمع صفات پر دلالت کرے۔ مثلاً ایک شخص کا نام زید ہے تو یہ اُسکا ذاتی نام ہے اور اگر اس شخص نے علم حاصل کیا تو اُس کا نام عالم ہو گیا اور اگر علمِ طِب پڑھ لیا تو طبیب اور حکیم ہو گیا اور اگر حج ادا کیا تو حاجی بھی اُس کا نام ٹھہرا۔ اور اگر قرآن یاد کیا تو حافظ بن گیا۔ علیٰ ہٰذ القیاس یہی واحد شخص زید جس قدر صفات سے موصوف ہوتا جائے گا اُسی قدر اُس کے اِسم کے ساتھ دیگر صفاتی نام مثلاً عالم، حکیم حافظ اور حاجی وغیرہ بڑھتے جائیں گے۔ سو جتنے کام اتنے نام۔ مگر جب ہم زید کا نام لیں گے تو اس سے ہماری مراد عالم، حکیم، حافظ اور حاجی وغیرہ اِن تمام صفات سے متصف شخص ہو گا۔ سو زید اُس کا ذاتی نام ہے اور یہ دیگر عالم، حکیم، حاجی اور حافظ وغیرہ صفاتی نام ٹھہرے۔ کیونکہ بعد میں اِس کے ساتھ لگ گئے جب وہ شخص اِن صفات سے موصوف ہو گیا۔ اب اگر ہم زید کی علمی لیاقت اَور ذہانت کا ذِکر کرتے ہیں اور اس کی ذہانت اور لیاقت کے مختلف واقعات اور حالات بیان کرتے ہیں تو ہماری یہ تمام قیل وقال اور زید کے علمی تبحّر تمام داستانیں ایک صفاتی نام عالم سے ادا ہو جاتی ہیں۔ اِسی طرح اس کی حکمت اور طب میں مہارت کے تمام کارنامے ایک ہی لفظ حکیم میں آجاتے ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ صفاتی نام تمام صفاتی داستانوں اور ذِکر اذکار کا جامع ہوتا ہے۔ اور ذاتی نام تمام صفاتی ناموں کا خلاصہ اور مجموعہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام اَللّٰہُ ہے۔ اَور رحمٰن، رحیم، مالک، قدوس، جبّار، قہار اَور غفار وغیرہ جس قدر بھی ننانوے 99 یا ان کے علاوہ دیگر نام اللہ تعالیٰ کے ہیں وُہ سب صفاتی نام ہیں۔ قرآن مجید میں جس قدر سورتیں اَور آیتیں موجود ہیں وُہ اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت پر دال ہیں۔ پس قرآن مجید کے تمام بیانات، ذِکر واذکار اور علوم ومعارف واسرار اللہ تعالیٰ کی کسی خاص صفت کو ظاہر کرتے ہیں۔ غرض اگر وُہ آیات وعدہ ہیں تو اللہ تعالیٰ کے اسمائے جمالی رحمٰن، رحیم، کریم، غفار میں سے کسی ایک کو ظاہر کرتے ہوں گے اَور اگر آیاتِ وعید ہیں تو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلالی مثلاً جبار، قہار، اَور منتقم وغیرہ پر دلالت کرتے ہوں گے۔ اِسی طرح قصصِ انبیا وغیرہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی کسی خاص صفت کا اظہار مقصود ہو گا۔ یا دیگر جس قدر حمد وثنا تہلیل وتکبیر اَور تقدیس وتمجید اللہ تعالیٰ کی قرآن کریم میں آئی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات سبُّوح، قدّوس، سُبحان،

حمید وغیر اسما کی تفصیلات ہیں۔ مختصراً یہ کہ قرآن مجید مثل ایک شجرِ طیبہ کے ہے جس کے حروف مثل باریک ریشوں اور الفاظ بمنزلہ پتوں کے اور آیات چھوٹی چھوٹی کونپلوں کی مانند ہیں اور قرآن کی سورتیں شاخوں کی مانند ہیں۔ اور اسمائے صفات بڑی بڑی شاخیں ہیں۔ اور اِسم اللہ ذات بالفعل ان سب کا موٹا تنا اور بالقوی اِس شجرِ طیبہ کے تخم اور پھل کی طرح ہے۔ درخت اگرچہ اپنی ٹہنیوں پر بے شمار پھل لاتا ہے۔ لیکن اس کی پیدائش اور اصل ایک ہی پھل سے ہوتی ہے۔ اسی طرح گو قرآنی سُورتوں میں اِسم اللہ ذات بے شمار جگہ مذکور ہوا ہے لیکن تمام قرآن اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسمِ اعظم اللہ کی صفت اور ثنا ہے اور سب کی اصل اور تخم اِسم اللہ ذات ہے۔

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَ حُسْنُکَ وَاحِدٌ
وَکُلٌّ اِلٰی ذَاتِ الْجَمَالِ یُشِیْرُ

(حسان بن ثابتؓ)

ترجمہ: ''ہماری عبارتیں گو تیری تعریف میں مختلف ہیں لیکن تیرا حُسن واحد ہے اور ہماری سب عبارتیں تیری ذاتِ جمال کی طرف اشارہ کرنے والی ہیں۔''

لہٰذا جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اس کے ذاتی اِسم اَللّٰہُ سے یاد کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کو اُس کی تمام صفات یا بالفاظِ دیگر جُملہ قرآنی آیات کے ساتھ یاد کر رہا ہے۔ جس وقت اِسم اللہ ذات کا تخم کسی کامل عارف اِنسان کے وجود میں سر سبز ہو جاتا ہے تو تمام قرآن مع جُملہ علوم ومعارف وانوار واسرار ایک شجرۃ النور کی شکل میں اُس کے دِل کے اندر قائم اور نمودار ہو جاتا ہے۔ اُس پر جُملہ قرآنی حقائق اور علوم ظاہری وباطنی اِسم اللہ ذات کی برکت سے واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ پاک درخت ہے جو اُس نبی اُمّی فداہ اُمّی وابی کے وجودِ مسعود میں غارِ حرا کے اندر لگایا گیا۔ جس کی شاخیں شجرِ طوبیٰ سے بھی آگے عرشِ بریں کے کنگروں سے جا ٹکرائیں۔ قولہٗ تعالیٰ: کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ۝ (ابرٰھیم ۱۴: ۲۴) ۔ اسی طرح اسم اللہ ذات کا ذِکر اصل کار ہے اور تمام اِسلامی ارکان کا ذِکر اللہ اور اسم اللہ پر دار و مدار ہے۔ یہی کلیدِ معرفت وتوحیدِ ذاتِ پروردگار ہے۔ جُملہ اِسلامی ارکان اور دینی اعمال کو اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو سب میں صرف ایک اِسم اللہ ذات

کا ذکر ہی اصل غرض یا اسی کا تصور اصل مدعا و مقصود معلوم ہوتا ہے۔ تمام نیک اعمال اور حمیدہ اخلاق خصوصاً جملہ ارکان گویا ذکر اللہ کے مختلف مظاہر ہیں یا ذکر اللہ کی تکمیل کے معاون اور مددگار ہیں۔ اسلام کے پانچوں ارکان کو ہی لیجیے جن پر اسلام کی عمارت کا قیام ہے یعنی نماز، کلمہ طیبہ، حج روزہ اور زکوۃ۔ اِن سب کی اصل غرض و غایت کو اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو اِن سب کا اصل مدعا ذکر اسم اللہ ذات ہی ہے اور بس۔ چنانچہ اول رُکن اسلام کا نماز پنجگانہ ہے۔ سو یہ صاف ظاہر ہے کہ نماز میں محض اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ٥ (طٰہٰ ۲۰: ۱۴)۔ یعنی نماز میری یاد اور ذکر کیلیے قائم کرو۔ دُوسری جگہ ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ (الاعلیٰ ۸۷: ۱۴۔۱۵)۔ ترجمہ: ”تحقیق وہ شخص چھٹکارا پا گیا جس نے اپنے وجود کو پاک کیا اور اپنے رب کے نام کو یاد کر کے نماز ادا کی۔“ اور ایک دُوسری آیت میں آیا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (العنکبوت ۲۹: ۴۵)۔ ترجمہ: ”تحقیق نماز انسان کو بے حیائیوں اور بُرائیوں سے روکتی ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ کا ذکر بڑی چیز ہے۔“ اور نماز کے ارکان یعنی قیام، رکوع، قعود اور سجود وغیرہ ذکر اللہ کے آداب اور ذکر اللہ سے روحانی سُرور اور باطنی لذات کی قدرتی تحریکات ہیں۔ جیسا کہ ناچ اور رقص نفسانی خوشی اور انبساط کی فطرتی حرکات ہیں۔ دوم رُکن اسلام کا کلمہ پڑھنا ہے، جس کے بغیر اِنسان مسلمان ہی نہیں ہو سکتا خواہ تمام جہان کے نیک اعمال اکیلا ہی ادا کیوں نہ کرے۔ یہ وہ پاک کلمہ ہے کہ اِس کے ایک دفعہ صدقِ دل سے ادا کرنے والا پاک بہشتی ہو جاتا ہے۔ خواہ پہلے کافر اور اشد مشرک ہی کیوں نہ ہو۔ اِسلام میں اِس کلمے کو افضل الاذکار اور اصلِ کار مانا گیا ہے: اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اور دُوسری جگہ آیا ہے: مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ بِلَا حِسَابٍ وَّبِلَا عَذَابٍ۔

یعنی: ”جس شخص نے صدقِ دل سے کلمہ پڑھا وہ بغیر حساب اور بغیر عذاب کے بہشت میں داخل ہوا۔“ بزرگانِ دین نے تحقیق کی ہے کہ بے حساب اور بے عذاب بہشت میں داخل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ وہ کلمہ ہے جو اِنسان کا موت اور نزع کے آخری اِمتحان کے وقت جاری ہو جائے۔ کیونکہ یہ کلمہ تمام عُمر کے اعمال کا خاص خلاصہ یا تعلیم اسلام و ایمان کا نتیجہ

ہوتا ہے۔ جو آخر وقت ظاہر ہو جاتا ہے۔ اگر کلمہ زبان پر یا دل میں جاری ہو گیا تو سمجھو کہ مقصدِ زندگی کے حقیقی امتحان میں پاس ہو گیا ورنہ فیل ہے۔ غرض کلمہ کا آخری وقت جاری ہو جانا تمام عمر کے اسلامی ارکان کے دودھ کا گویا مکھن ہوتا ہے، جو وجود کے برتن میں نمودار ہو جاتا ہے۔

کلیدِ قفلِ جناں لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه — نجاتِ مردمِ جاں لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه

ڈرا کہ کردیباں لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه — چہ خوف آتشِ دوزخ چہ خوف دیو لعیں

کہ بود دوراماں لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه — نہ بود ملک دو عالم نہ دورِ چرخِ کبود

سو یہ صاف ظاہر ہے کہ دوم رکنِ اسلام یعنی کلمہ طیب ذکر اللہ ہے۔ سوم رکنِ اسلام حج بیت اللہ ہے۔ حج بھی آل و عیال، وطنِ مالوف اور جملہ دُنیوی علائق و عوائق سے قطع تعلق کر کے ذکر اللہ کے لیے یکسوئی پیدا کرنے کی خاطر قائم کیا گیا ہے۔ حج کے تمام ارکان اور جملہ مناسک میں یہی ایک پاک شغل ذکر اللہ ہی کیا جاتا ہے۔ اور حج بیت اللہ کی بابت قرآن میں جس قدر آیات مذکور ہیں سب میں اِسی ذِکر کی تاکید ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ (البقرۃ ۲: ۱۹۸)۔ قولہٗ تعالیٰ: فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (البقرۃ ۲: ۲۰۰)۔ ترجمہ: ”جب عرفات پر پہنچو مشعر الحرام کے نزدیک ذکر اللہ کرو۔“ اور ”جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ تعالیٰ کا ذِکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباؤ اجداد کا ذِکر کیا کرتے تھے۔“ اور آخر میں صریح طور پر ارشاد ہے: وَاذْكُرُوا اللّٰـهَ فِیْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ (البقرۃ ۲: ۲۰۳)۔ یعنی صرف اللہ تعالیٰ کو حج کے ان معدود دنوں میں یاد کیا کرو۔ سو حج میں محض اللہ تعالیٰ کا ذِکر ہی کیا جاتا ہے۔ مزید برآں یہ بات علاوہ ہے کہ وہاں خاص خاص متبرک مقامات کو دیکھنے سے توجہ قلبی اور ذِکر میں محویّت بڑھ جاتی ہے اور اِن متبرک مقامات کی تقدیسِ مکانی اور وہاں کی پاک روحوں کی تاثیر رُوحانی سے اور رُوئے زمین کے مسلمانوں اور ان میں برگزیدہ ہستیوں کے باطنی پرتو سے دل سے غفلت اور کدورت دور ہو جاتی ہے اور ذِکر میں لذت بڑھ جاتی ہے اور اس کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ چہارم رُکن اِسلام کا روزہ ماہِ رمضان ہے۔ اس میں بھی تلاوتِ قرآن مجید اور نفل نوافل، تراویح اور ذِکر اذکار ہی ادا ہوا کرتے ہیں۔ تاکہ اس میں کھانے پینے اور جماع وغیرہ نفسانی اور دُنیوی

مصروفیتوں سے علیحدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کمال فراخدلی اور یکسوئی کیساتھ کرے۔ کیونکہ دِل جب کھانے پینے کی نفسانی خواہشات اور دُنیوی خطرات میں اُلجھا رہے تو ذکر کی اصل غرض اور عبادت کی حقیقی مراد مفقود ہو جاتی ہے۔ لیکن جس وقت انسان یکسو اور یک جہت ہو کر اللہ تعالیٰ کا ذکر مع فکر و حضورِ قلب کرتا ہے تو ذکر کا تیر اپنے نشانے پر ٹھیک جا لگتا ہے اور ذکر کی تار برقی مذکور تک جا پہنچتی ہے۔ دیگر رمضان کے آخری عشرے میں مسجد میں اِعتکاف صرف ذکر کے لیے تام یکسوئی اور مکمل یک جہتی کے واسطے مسنون رکھا گیا ہے۔ پنجم رُکن اسلام کا زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ کی فرضیت میں بھی یہی راز مضمر ہے کہ مساکین اور غرباء جن کو رزق کی تنگی کے باعث تشویش اور پریشانی خاطر لاحق رہتی ہے اور اِس دُنیوی فِکر اور روزی کے غم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور عبادت اطمینانِ خاطر سے ادا نہیں کر سکتے اور ہمیشہ پراگندہ روزی پراگندہ دل ہوا کرتا ہے۔ اس واسطے اِسلام نے دُنیاداروں پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ ایسے نادار اور محتاج مسلمانوں کی امداد کی جائے تاکہ یہ لوگ بھی دِل جمعی اور فراغتِ قلبی سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر سکیں۔ اِنسان اگرچہ خود کتنا ہی متوکل علی اللہ اور تارکِ دنیا کیوں نہ ہو اہل و عیال اور بال بچوں کے ہوتے ہوئے اُس کے صبر اور تحمل کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں اور کمزور صنفِ نازک اور معصوم بال بچوں پر یہ بے محل بوجھ ڈالنا راہِ سلوک میں بھی چنداں مفید نہیں پڑتا۔

شب[1] چو عقدِ نماز بر بندم — چہ خورد بامداد فرزندم

سعدیؒ

شیخ سعدیؒ نے سچ کہا ہے کہ بال بچوں کی روزی کا غم اور رزق کا فِکر عالمِ بالا میں پرواز کرنے والے سالک کو بھی اپنی منزل سے نیچے گرا دیتا ہے۔

اے گرفتار پائے بندِ عیال — دگر آزادگی مبند خیال

غمِ فرزند و نان و جامہ و قوت — باز دارد ز سَیر در ملکوت

سعدیؒ

ترجمہ: اے وہ شخص کہ تُو اہل و عیال میں گرفتار ہے۔ اب تو ذہن کی آزادی کا خیال نہ

[1] رات کو جب میں نماز پڑھنے کا ارادہ کرتا ہوں (تو دل میں یہ خیال آتا ہے) صبح اہل و عیال کیا کھائیں گے۔

کر۔ اہل وعیال کے خورد ونوش اور لباس کا غم انسان کو عالم ملکوت کی سیر سے روک دیتا ہے۔
اور نیز زکوٰۃ کی دُوسری حکمت یہ بھی ہے کہ ہر چیز کی افراط اور تفریط مُضر ہوا کرتی ہے اور ہر چیز کے اِعتدال اور اَوسط میں خیر ہے۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُهَا وَ شَرُّالْاُمُوْرِ تَفْرِیْطُهَا وَ اِفْرَاطُهَا۔ اِسی دُنیوی دولت کی کثرت اور مالِ دُنیا کی فراوانی بھی اِیمان اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذِکر اللہ کے لیے نقصان دہ ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ (الشوریٰ ۴۲: ۲۷)۔ ترجمہ: ''اگر ہم اپنے بندوں پر روزی فراخ کر دیں تو وہ ضرور رُوئے زمین پر بغاوت کھڑی کر دیں گے۔'' اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ مُوسیٰ علیہ السلام کی زبانی قرآن میں یوں اِرشاد فرماتے ہیں کہ مُوسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اَے اللہ تو نے فرعون اور اس کی قوم کو دولتِ دُنیا اور زیب وزینت کے سامان دے رکھے ہیں جس کی وجہ سے وہ تیرے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ اے اللہ ان کا مال اور دولت ان سے چھین لے اور ان کے دلوں کو فقر وفاقے کی زنجیر میں جکڑ لے تا کہ وہ ایمان لے آئیں۔ سو اِس سے ثابت ہو گیا کہ دولتِ دُنیا اور عیش وعشرت کے سامان کی فراوانی انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے: حُبُّ الدُّنْيَا رَاسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ ۔ یعنی دُنیا کی محبت تمام برائیوں کا سر ہے۔ غرض دُنیا ایک ایسی پُر آشوب بلا ہے اور یہ ایک ایسا دردِ لا دوا ہے کہ اس سے انسان بڑی مشکل سے نجات پاتا ہے۔ سعدیؒ نے اِس بیت میں دُنیا کی حقیقت کھول کر رکھ دی ہے۔

اگر دنیا نہ باشد درد مندیم　　وگر باشد بمہرش پائے بندیم
بلائے زیں جہاں آشوب تر نیست　　کہ رنج خاطر است، ار ہست ور نیست
(سعدیؒ)

واقعی جب دنیا زیادہ ہو جائے تو اِس کی محبت دامن گیر ہو کر انسان کو اللہ تعالیٰ سے روک دیتی ہے اور فقر فاقے کی شدت بھی کفر میں گرا دیتی ہے۔ كَادَ اَنْ يَّكُوْنَ الْفَقْرُ كُفْرًا۔ اس واسطے اِسلام نے لوگوں میں مساوات قائم رکھنے اور دنیا کی افراط کو حدِ اعتدال پر لانے کے

---

۱؎ اگر دنیا نہ ہو تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں اور اگر دنیا ہو تو اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کوئی مصیبت اس دنیا سے بڑھ کر تکلیف دہ نہیں کہ اس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں صورتوں میں وبالِ جان ہے۔

لیے دُنیا داروں پر زکوٰۃ فرض اور لازم گردانی ہے تاکہ دُنیا دار بھی ذکر اللہ میں یکسوئی اور حضورِ قلب سے محروم نہ ہوں۔ غرض اسلام کیا ہے: ظاہر زبان سے ذکر اللہ کرنا اور جسمانی اعضاء و جوارح سے ذکر کے آداب بجالانا اور حواسِ خمسہ کے ذریعے ذکر اللہ کو اپنے اصلی مقام قلب تک پہنچانے کا نام ہے۔ اور جب ذکر اللہ ظاہری وجود سے مقام قلب میں منتقل ہو جاتا ہے تو اُس وقت اِیمان کی باطنی صُورت اندر میں نمودار ہو جاتی ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ط (الحجرٰت ۴۹: ۱۴)۔ ترجمہ: "اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اللہ نے جواب میں فرمایا کے اے محمد ﷺ! ان سے کہہ دے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اِسلام لے آئے ہیں۔ ابھی تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔ تب ایماندار کہلانے کے مستحق بنوں گے جس وقت کہ اِیمان تمہارے دلوں کے اندر داخل ہوگا۔ سو معلوم ہو گیا کہ اِیمان کا خاص محل اور اصل مقام مومن کا دِل ہے نہ کہ جسم۔ ایمان فی الحقیقت اسم اللہ ذات کا نوری چراغ ہے۔ جس وقت یہ نوری چراغ مومن کے قلب صنوبری کی چمنی میں روشن ہو جاتا ہے تو اس سے مومن پر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ط اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ (النور ۲۴: ۳۵)۔ ترجمہ: (اِسم) اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اُس کے نور کی مثال یوں ہے کہ گویا ایک طاقچہ ہے جس کے اندر چراغ روشن ہے۔ اور چراغ ایک قندیل اور چمنی میں لگا ہوا ہے۔ (چراغ کی روشنی کی تو بات ہی کیا ہے) اس کی چمنی کا یہ حال ہے کہ وہ ایک روشن ستارے کی طرح نورِ چراغ اسم اللہ ذات سے جگمگا رہی ہے۔ غرض آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (النور ۲۴: ۳۵)۔ میں ترجمہ یوں صحیح نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ کیونکہ یوں تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ظرفیت لازم آتی ہے اور اس کی عظیم الشان لامحدود ذات آسمانوں اور زمین کے اندر محدود ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین اور مافیہا اور ماوریٰ اِن سب کا خالق ہے۔ یہاں اللہ سے مراد اسم اللہ ذات ہے جس کے نور سے آسمان اور زمین روشن اور منور ہیں اور انسانِ کامل کے سینے کے طاق میں قلب صنوبری کی قندیل اور چمنی کے اندر روشن ہے اور

چراغ اسم اللہ ذات سے عارف کامل کا قلب روشن ستارے کی طرح چمک اٹھتا ہے۔ اور یہ قندیل درخت زیتون وجود اور جسمِ عنصریٔ عارف سے لگا ہوا ہے۔ جو لوگ اِسم اور مسمّٰے کے معمّے سے ناواقف ہیں وُہ ہماری اس نئی تاویل سے متعجب اور حیران ضرور ہوں گے لیکن ہم حق بات ظاہر کرنے پر مجبور ہیں۔ خواہ لکیر کے فقیر اپنی غلط تفسیر کی تشہیر پر ناراض کیوں نہ ہوں۔ بعض لوگ اِس بات سے بھی تعجب کریں گے کہ ہم نے نورِ ایمان کو جو کہ نورِ یقین کی شکل میں مومن کے قلب اور دِل کے اندر جاگزیں ہوتا ہے اسم اللہ ذات کہہ دیا ہے۔ سو ناظرین اِس آیتِ قرآنی کے مفہوم پر غور کریں اور اِنصاف کی عینک چڑھا کر دیکھیں کہ ہماری تاویل اور تفسیر کس قدر صداقت اور حقیقت پر مبنی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ (المجادلۃ ۵۸: ۲۲) ۔ ترجمہ: "وہ لوگ ہیں جن کے دِلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لکھ دیا ہے"۔ سو ایمان تب ہی لکھا جاسکتا ہے جب کہ وہ ایک کلمہ اور لفظ کی صورت میں ہو اور وہ لفظ اور کلمہ سوائے اسم اللہ ذات کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

ہزار معجزہ بنمود عشق و عقل جہول
ہنوز امتِ اندیشہ ہائے خویشتن است

ترجمہ:۔ عشق نے ہزاروں معجزے دکھلا دیئے لیکن جاہل عقل ابھی تک اپنے اندیشوں کی پیروی کر رہی ہے۔

ہم پیچھے ثابت کر آئے ہیں کہ اِسلام کے پانچوں ارکان کلمہ، نماز، روزہ، حج، اور زکوٰۃ ذِکر اللہ اور ذِکر اسم اللہ ذات کے مختلف مظاہرے اور طریقے ہیں۔ اور یہی اِسلام یا ذِکر اللہ جب ظاہر اعمال جوارح سے لطیفہ قلب باطن کی طرف منتقل ہو کر دِل کے اندر اسم اللہ ذات کی صورت میں تحریر اور مرقوم ہو جاتا ہے تو اس وقت اس کے نور کو نورِ ایمان کہتے ہیں۔ اور یہ نور یا نورِ اسم اللہ ذات اللہ تعالیٰ نے روزِ اوّل سے مومنوں کے دلوں کے اندر بطور تخم ودیعت کر دیا ہے۔ جو دُنیا میں کسی پاک برگزیدہ اللہ والے بندے کے وعظ، پند، نصیحت، تلقین، اِرشاد، تعلیم، توجہ یا فیض کی آبیاری سے سر سبز ہو کر شجرِ طیبہ بن جاتا ہے۔ سو اِسلام اور اِیمان کے شجر کی سر سبزی اور تکمیل کے لیے تخم ہدایتِ ازلی فضلی اور آبِ ہدایت و تلقین و تعلیم انسان کامل عارف مثل ابر فضلی لازم و ملزوم ہیں۔ تخم اور پھل کے بغیر آبیاری بے سود ہے جیسا کہ

ارشادِ حق معبود ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (المآئدۃ ۵: ۳۵)۔ یعنی ''اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور اُس کی طرف وسیلہ پکڑو۔'' ایک اور جگہ ارشاد ہے: اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ (القصص ۲۸: ۵۶)۔ یعنی اے میرے نبی! تو ہر خاص و عام کو جو چاہے ہدایت پر نہیں لا سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے جن کو ازل کے دن ہدایت کا تخم عطا کیا ہے اُن کو ہدایت ہوگی'' اور پھر ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (التوبۃ ۹: ۱۱۹)۔ ترجمہ: ''اے ایمان والو! صادقین کے ہمراہ رہو۔'' اب ہم ایک دوسری آیت کی تفسیر سے اِس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ کیونکر اسلام اور اِیمان کا درخت اِسم اللہ ذات سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ ؕ فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَۃِ قُلُوْبُھُمْ مِّنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (الزمر ۳۹: ۲۲)۔ ترجمہ: ''جس شخص کا اللہ نے کھول دیا ہے سینہ اِسلام کے لیے پس وہ نور اور روشنی پر ہے اپنے رب کی طرف سے۔ افسوس ہے اُن لوگوں پر جن کے دِل سخت ہیں ذکر اللہ سے۔ سو وہ لوگ صریح گمراہی پر ہیں۔'' یہاں اِس آیتِ کریمہ میں دو جملے ہیں اور ہر ایک جُملے کے دو حصے ہیں۔ ہر ایک حصہ اپنے بالمقابل دُوسرے حصے کے بالکل متضاد اور مخالف مفہوم کا حامل ہے اور ہر جملے کا پہلا حصہ شرط اور دوسرا اس کا نتیجہ اور جزا ہے۔ سو پہلے جملے میں ایسے سعادت مند آدمی کا ذکر ہے جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اِسلام کے لیے کھولا ہے۔ اس کی جزا یہ ہے کہ وہ روشنی اور ہدایت پر ہے اپنے رب کی طرف سے۔ اور دوسرے جملے میں ایسے شقی القلب لوگوں کا ذکر ہے جن کا دل ذکر اللہ سے سخت پتھر کی طرح ہے کہ ذکر اللہ اس میں نفوذ اور سرایت نہیں کر سکتا۔ اور جزا یہ بیان کی گئی ہے کہ ایسے لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اِس آیتِ شریفہ میں ناظرین اِس باریک نکتے کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ پہلے جملے میں ایک شخص ہے جس کا سینہ اللہ نے اِسلام کے لیے کھولا ہے۔ پس وہ نور اور ہدایت پر ہے۔ دوسرے جملے میں چاہیے یوں تھا کہ یوں بیان ہوتا کہ اُن لوگوں پر افسوس ہے جن کے دِل کفر کی وجہ سے سخت ہو گئے ہیں پس وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اسلام کے مقابلے میں کفر کا لفظ کافی اور صحیح ہوتا۔ لیکن یہاں اللہ

تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اِس سرِّ مکنون کو کھول دیا ہے کہ کفر اور گمراہی صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دِل کے سخت ہو جانے اور اس میں اِسم اللہ کے نفوذ اور سرایت نہ کرنے کا نام ہے اور اسلام یہ چیز ہے کہ اِنسان کا دِل ذکر اللہ کے لیے کھل جائے اور اسم اللہ ذات اس میں داخل ہو جائے۔ دوسرا نکتہ اِس آیت میں یہ ہے کہ یہاں اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ (الزمر ۳۹: ۲۲) ۔ میں لفظ اَللّٰہُ مسمّٰی یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کہ معنے میں نہیں آیا بلکہ اِسم کے معنے میں آیا ہے یعنی اِس کے معنے یوں ہیں کہ جس شخص کا سینہ اسم اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے پس وہ اپنے رب کی طرف سے نور اور ہدایت پر ہوگا۔ یعنی جس سعادت مند شخص کے دل کی زمین ایسی نرم ہو کہ اس میں آبِ ہدایت و تلقینِ انبیا و اولیا نفوذ اور سرایت کر جائے اور اس میں تخم اسم اللہ ذات سر سبز ہو کر اور اُس کے سینے کی نرم زمین کو پھاڑ کر شجرِ اسلام کی صورت میں قائم اور نمودار ہو جائے تو ایسا شخص ضرور اپنے رب کی طرف ہدایت پا جائے گا۔ لیکن جس شخص کا دل پتھر کی مانند ہو کہ نہ اُس میں آبِ ہدایت کو داخل ہونے کا راستہ ہے اور نہ تخم اِسم اللہ ذات کو پھوٹ کر سر نکالنے کی کوئی راہ ہے تو ایسے شقی القلب آدمی کے دل کی پتھریلی زمین میں ضرور تخم اسم اللہ ذات ضائع ہو جائے گا اور وہ ضرور گمراہ ہوگا۔ اَب اگر آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ (الزمر ۳۹: ۲۲) میں لفظ اَللّٰہُ کو بجائے اِسم کے مسمّٰی کے معنوں میں استعمال کیا جائے جیسا کہ عام ترجموں میں آتا ہے تو معنی یوں ہوتے ہیں "جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے کھول دیا ہے اسلام کے لیے پس وہ اپنے رب کی طرف سے خاص نورِ ہدایت پر ہے" تو ایک بڑا اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں بھی معاذ اللہ عجیب انصاف ہے کہ کسی خاص شخص کا سینہ تو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور اسے اپنی طرف ہدایت فرماتا ہے اور باقیوں کو خود گمراہ کرتا ہے تو پھر ان گمراہ لوگوں کا کیا قصور ہے۔ سو آیت کا تُہم اور اشکال ہرگز رفع نہیں ہوتا اور نہ معنے درست ہوتے ہیں جب تک لفظ اَللّٰہُ کو اِسم کے معنے میں نہ لیا جائے پس ثابت ہو گیا کہ اِسم اللہ مثل تخم اور پھل کے ہے جسے آبِ ہدایت و دعوت سے جب سینچا جائے تو نرم اور قابل سینے کی زمین کو پھاڑ کر پھوٹ پڑتا ہے اور اس سے شجرِ طیبہ اسلام سر سبز اور سر بلند ہو جاتا ہے۔ پس یہاں اور اکثر قرآن کریم میں لفظ اَللّٰہُ اِسم کے معنے میں اِستعمال ہوتا ہے اور دلالت ذات پر

کرتا ہے۔ کیونکہ اِسم عین مسمّٰی ہے اور یہی اِسم اور مسمّٰی کا معنٰے ہے۔

سبک زجائے نہ گیری کہ بس گراں گہراست
متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی[1]

عرفیؔ

یہی ذکر اسم اللہ اور یادِ الٰہی کا سرِّ مخفی ہے۔ جس کی سمجھ سے مادی عقل والے بالکل بے خبر اور ناواقف ہیں۔ اور یہی ذکر اسم اللہ کی اصلی ضرورت ہے اور انسانی زندگی کا حقیقی مقصد ہے۔ جس کو الحادزدہ فرقہ جمود، بیکاری اور رہبانیت کی مشق بتاتا ہے۔ ہر اِنسان کی سرشت اور فطرت میں اِسم اللہ ذات کا نور اس طرح جاری وساری ہے۔ جس طرح جسم میں خون اور خون میں جان ہے اور اسم اللہ ذات کا نور گویا جانِ جان ہے اور اسی سے انسانی وجود گرم و تاباں تروتازہ اور روشن و درخشاں ہے۔ یہ اسم پاک وہ ذریعہ، واسطہ اور وسیلہ ہے۔ جس کا ایک سرا زمین شہادت و آفاق کے اِنسانی قلب میں لگا ہوا ہے اور دُوسرا سرا آسمانِ غیب و انفس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی وہ عروۃ الوثقیٰ اور جبل المتین (اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی) ہے جو آسمانِ الوہیت سے زمینِ عبُودیت پر لٹک رہی ہے۔ جس کو پکڑ کر اِنسان اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اُس کے پاک بلند وبالا اور غیر مخلوق اعلیٰ قصرِ مقدس تک اِسم اللہ ذات کی برقی لِفٹ کے بغیر رسائی ناممکن اور محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی کو اپنی ہدایت، قرب اور وصال کا ذریعہ بنایا ہے۔ آسمانِ ربوبیت سے زمین عبُودیت پر یہی آفتاب چمکا ہے۔ جس کے نور سے انفس کی آنکھ میں بینائی ہے۔ اور جس نے آفاق کی ساری قندیل میں روشنی پھیلائی ہے۔ اسی لیے تو اس کا نام اِسم اللہ ذات ہے اور یہی آخر ذریعۂ نجاتِ کائنات اور چشمۂ حیات ہے اور سرِّ اسرار اور مغز و مخ تمام کائنات ہے۔

رہُودِ جان و دِلم راجمالِ نامِ خدا نواخت تِشنہ لباں راز لالِ نامِ خدا
یقیں بداں کہ تو باحق نشستۂ شب و روز چوں ہم نشینِ تو باشد خیالِ نامِ خدا
ترا سزد طیراں در فضائے عالمِ قدس بشرطِ آں کہ بہ پری ببالِ نامِ خدا

---

[1] تو میری متاع (شعروسخن) کو کہ خدا کرے اس کی کبھی کساد بازاری نہ ہو حقیر سمجھ کر نہ اٹھانا کہ یہ ایک بہت قیمتی گوہر ہے۔

میانِ اسم و مسمّٰے چوں فرق نیست ببیں　　تو در تجلّیِ اسماءِ کمالِ نامِ خدا

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے نام کے جمال اور حُسن نے میرا دِل اور جان دونوں چھین لیے۔
اور اللہ تعالیٰ کے نام کی مٹھاس نے میرے پیاسے لبوں کو تسکین دی۔''

تو یہ یقین کر کہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کے نام کا تصور اور خیال تیرے ساتھ ہے۔

تجھے عالم قُدس یعنی عالم بالا میں پرواز کرنا آسان ہے بشرطیکہ تو اللہ تعالیٰ کے نام کے پر لگا کر پرواز کرے۔

اِسم اور مسمّٰی میں چونکہ کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا تُو اسما کی تجلّی میں اللہ تعالیٰ کے نام کا کمال دیکھ۔

غرض تمام کائنات اِسم اللہ ذات کی تسخیر اور قید میں ہے۔ جس نے اِس اسم کو حاصل کیا گویا تمام کائنات کی تسخیر کی کلید اُس کو مل گئی ہے اور اس نے تمام کائنات کو مسخر کر لیا۔ اسم اللہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام کائنات کے امرِ ظہور یعنی لفظ کُنْ کا نعم البدل ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے: بِسْمِ اللّٰهِ مِنْ عَارِفٍ بِاللّٰهِ كَكُنْ مِنَ اللّٰهِ۔ یعنی عارف کا اِسم اللہ کہنا اللہ تعالیٰ کے امر کُنْ فرمانے کے برابر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح لفظ کُنْ یعنی ہو جا فرما کر تمام کائنات کو پیدا کیا اسی طرح عارف جس کام کے لیے اسم اللہ کہہ دیتا ہے وہ کام جلدی یا بدیر ظہور پذیر ہو کر رہتا ہے۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کو ذاتی اِسم سے یاد کرتا ہے تو گویا اللہ کو جمیع صفات سے یا تمام قرآنی آیات سے یاد کر رہا ہے جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲: ۱۵۲) یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ سو ہمارا اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا تو صاف ظاہر ہے کہ ہم ظاہر زبان سے یا دل اور خیال سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ہمیں حسبِ وعدہ مقابلتاً اور ایجاباً کس طرح یاد فرماتے ہیں اور ہمارے ذِکر کا کس طرح جواب دیتے ہیں اور اس کی کیا صورت اور کیفیت ہوتی ہے۔ اس رازِ درونِ پردہ کو آج ہم کھول کر بیان کرتے ہیں۔ بندہ اللہ تعالیٰ کو جس اِسم اور صفت سے یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسی صفت اور اُسی اِسم سے اپنے ذاکر بندے کی طرف متجلّی ہوتا ہے۔

قولہٗ تعالیٰ: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (البقرۃ ۲: ۱۸۶)۔ یعنی: ''میں اپنے بلانے والے کی دعا کا جواب دیتا ہوں جس وقت وہ مجھے بلاتا ہے۔'' قولہٗ تعالیٰ: وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ○ (یوسف ۱۲: ۱۸)۔ یعنی ''اللہ تعالیٰ کو اُسی صفت سے جلوہ گر ہونے کی توفیق ہے جس صفت سے تم اُسے یاد کرتے ہو۔'' حدیث: اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ فَلْیَظُنَّ بِیْ کَیْفَ یَشَاءُ۔ ترجمہ: ''میرے بندے کا میرے ساتھ جیسا ظن اور گمان ہوتا ہے میں اُسی کے مطابق اُس کے ساتھ سلوک اور برتاؤ کرتا ہوں۔ سو جس طرح وہ چاہے میرے ساتھ ظن رکھے۔'' اِنسان کے اندر اِسم اللہ ذات اور اللہ تعالیٰ کے جملہ اسمائے صفات کی اِستعداد روزِ ازل سے فطرتی طور پر بالقویٰ موجود ہے۔ پس اِنسان اللہ تعالیٰ کو جس اِسم اور صفت سے یاد کرتا ہے وہ اپنے اندر اسی صِفت کی اِستعداد کو بالفعل جاری کرتا ہے اور اُسی اسم کو نمودار کرتا ہے اور اسی اسم کے نور کا بطور اِنعکاس اپنے دِل کے آئینے میں اِقتباس کرتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب کی روشنی جب آئینے میں متجلّی ہوتی ہے تو اُس آئینے میں آفتاب کی روشنی اور گرمی کی صِفت بطور انعکاس پیدا ہو جاتی ہے۔ آفتاب کی روشنی اور گرمی آئینوں اور آتشی شیشوں یعنی لینز میں ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جس وقت لینز کے محدب شیشے میں آفتاب کی شعاعیں گزرتی ہیں تو اس میں اتنی گرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے کپڑے کو آگ لگ جاتی ہے۔ اسی طرح چاند کی سطح پر جب آفتاب کی روشنی پڑتی ہے تو چونکہ اُس میں بڑی وسعت ہے اس لیے اس کی روشنی چودھویں کے چاند کی رات کو نصف رُوئے زمین کو روشن کر دیتی ہے اور فوٹو گرافی نے تو اور بھی اِس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ بطور انعکاس آئینے کے اندر شے معکوس کی صُورت ہُو بہُو آ جاتی ہے۔ بائیسکوپ اور ٹاکیز نے تو اشیائے معکوس کی صورت اور شکل کے علاوہ ان کی حرکات افعال و اعمال اور آواز تک کو فلم کے فیتوں میں بطور انعکاس اُتار کر پردۂ فلم پر دِکھا دیا ہے۔ اور جو کچھ واقع ہو چکتا ہے اسے بجنسہٖ پردۂ فلم پر لوگ دن رات دیکھتے ہیں۔ اگر ایسی فوٹو گرافی اور فلم سازی ممکن ہوتی کہ وہ بطور انعکاس اِنسانی صورت، حرکات، سکنات اور آواز کے علاوہ اس کی عین ذات اور صفات کا بھی عکس اُتار سکتی تو وہ فوٹو گرافی ہمارے مطلب کو صاف ظاہر کرتی۔ انسانِ کامل اللہ تعالیٰ کا ایسا ہی مظہرِ اتم اور مکمل آئینہ بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انوارِ ذات وصفات واسما وافعال کا

اپنے اندر حسب وسعت واستعداد انعکاس کرتا ہے۔ مردِ عارف کامل کا جس وقت پورے طور پر تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تجلیۂ رُوح اور تخلیۂ سِرّ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا ایسا صاف شفاف اور مکمل آئینہ بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جمیع صفات سے متصف اور اس کے جملہ اخلاق سے متخلق ہو جاتا ہے۔ اور وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (البقرہ ۲: ۳۱) کا سچا مصداق یعنی حقیقی آدم کی اولاد، اصلی معنی میں آدمی کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ورنہ ویسے تو اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ (الاعراف ۷: ۱۷۹) انسان بظاہر صورت انسان اور باطن میں حیوان بہت ہیں۔ آدم علیہ السلام اور اس کی حقیقی اولاد میں اللہ تعالیٰ اپنے جمیع اسما اور صفات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اور یہی وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (البقرہ ۲: ۳۱) کے حقیقی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے جُملہ اسما سکھا دیئے اور ملائکہ اور فرشتوں کا اِن اسما کے جاننے سے عاجز آ جانے سے یہ مُراد ہے کہ فرشتے اور ملائکہ اللہ تعالیٰ کے خاص خاص اسما کے مظہر ہیں۔ اور انہیں چند خاص اسمائے صفات کے ساتھ متصف کیا گیا ہے جن کے وہ کارکن ہیں۔ جیسا کہ عزرائیل علیہ السلام جو اَرواح کے قبض پر مامور ہیں اللہ تعالیٰ کے اسما قادر، قہار، قابض اور ممیت وغیرہ چند اسمائے جلالی کی استعداد رکھنے والے ان ہی اسما کے عامل اور ان کی صفت سے متصف اور کارکن ہیں۔ عزرائیل علیہ السلام میں دیگر اسما اور خصوصاً اسمائے جمالی کی مطلق استعداد نہیں ہے۔ اسی طرح جبرائیل علیہ السلام کو اسماء جمالی کا مظہر اور کارکن بنایا گیا ہے اور علیٰ ہٰذ القیاس دیگر ملائکہ کو سمجھ لیا جائے۔ لیکن انسانِ کامل ہر دو جمالی وجلالی اور کمالی اسمائے صفات کا اپنے اندر حسب وسعتِ ظرف اور حسبِ توفیقِ باطنی اقتباس کرتا ہے۔ یہی وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (البقرہ ۲: ۳۱) کا حقیقی مطلب ہے۔ اور یہ ہرگز مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کوئی لغات کی کتاب یا ڈکشنری پڑھا دی تھی جس میں تمام دنیا کی چیزوں کے نام درج تھے اور اس کو ملائکہ سے چھپا رکھا اور پھر آپس میں ان چند اشیا کا نام بتانے میں امتحان لے لیا تھا۔ اور یوں فرشتوں کا عجز اور آدم علیہ السلام کی برتری اور فضیلت ظاہر ہو گئی تھی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی عادل عظیم مقدس ذات سے بعید ہے۔ اور حدیث خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا) اس بات کی مؤید ہے کہ آدمؑ کے اندر اللہ تعالیٰ کی جمیع صفات سے متصف

ہونے اوراس کے اخلاق سے متخلق ہونے کی صلاحیت موجود ہے ورنہ اللہ تعالیٰ صورت اور شکل وشباہت سے منزہ اور پاک ہے۔ غرض انسانِ کامل اللہ تعالیٰ کا مکمل آئینہ اور مظہرِ اتم ہے۔ اور بمقتضائے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲: ۱۵۲) انسان جس اسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ ایجاباً اسی اسم کے ساتھ اس شخص کی طرف متجلی ہوتا ہے۔ مثلاً بندہ اللہ تعالیٰ کو جب اسم رحمٰن سے یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر رحمٰن کی تجلی فرماتا ہے اور اسم رحمٰن کا نور، ذاکر کے اندر سرایت کر جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جو صفتِ رحمانیت تمام کائنات میں جاری اور نافذ ہے جس کے سبب تمام دنیا کے جن، انسان، حیوان، درند، چرند اور پرند کے درمیان رحم اور شفقت قائم ہے ذاکر اسم رحمٰن اللہ تعالیٰ کی اس عام عالم گیر صفتِ رحمانیت کے عمل اور قدرت میں سے بقدرِ وسعت استعداد حظِ وافر اٹھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت سے متصف ہو جاتا ہے۔ اور انفس و آفاق میں اسم رحمٰن کے عمل کا عامل ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ اسی طرح جب ذاکر اللہ تعالیٰ کو اسم سَمِیْع یا اسم بَصِیْر سے یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت سمیع اور بصیر سے بقدرِ وسعتِ استعداد بہرہ یاب ہوتا ہے اور علاوہ سماعت و بصارت حواسِ ظاہری ذاکر اللہ تعالیٰ کے فضل اور عطا سے سماعت اور بصارتِ باطنی حاصل کر لیتا ہے اور ناشنیدہ باتیں بذریعہ الہام سنتا ہے۔ اور نادیدہ باطنی مقامات اور غیبی روحانی واقعات دیکھتا ہے اسی طرح تمام صفات کو قیاس کر لیا جائے۔ لیکن جب انسان اللہ کو ذاتی اسم سے یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی ذات جامع جمیع صفات و اسما سے اس ذاکر کی طرف متجلی ہوتا ہے اور ذاکر اللہ تعالیٰ کے ذاتی انوار کا اپنے اندر مشاہدہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذاتی جلوے اور مشاہدے سے مشرف اور ممتاز ہو جاتا ہے۔ اور ذاکر کا وجود ذاتی انوار سے منور ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ بندے (ذاکر) کے اندر حلول کر جاتا ہے۔ بلکہ جس طرح آفتاب کی روشنی اور حرارت آئینے یا پانی یا دیگر شفاف اشیا کے اندر منعکس ہو جاتی ہے حالانکہ آفتاب اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ یا جس طرح لوہے میں آگ سرایت کر جاتی ہے اور لوہا لال ہو کر آگ کی صفت اختیار کر لیتا ہے اسی طرح بندہ اللہ تعالیٰ کے انوارِ ذات و صفات و اسما و افعال سے اقتباس کرتا ہے۔ اس وقت بندے کا دیکھنا اللہ تعالیٰ کا دیکھنا، سننا اللہ تعالیٰ کا سننا اور بولنا

اللہ تعالیٰ کا بولنا ہو جاتا ہے۔ غرض بندہ اللہ تعالیٰ کو جس اسم سے یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ بندے کی طرف اسی اسم سے متجلی ہوتا ہے اور ذاکر پر اللہ تعالیٰ کے اسی اسم کی تجلی ہوتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہی اسم ذاکر کے اندر قدرت کے نوری حروف سے مرقوم اور تحریر ہو جاتا ہے اور ذاکر اسے کوکب درّی چمکدار ستارے کی طرح غیبت اور استغراق کے وقت آسمانِ غیب پر تاباں اور درخشاں دیکھتا ہے۔ باطن میں انوارِ اسما کا ظہور کواکب اور ستاروں کی شکل میں ہوتا ہے اور انوارِ صفات چودھویں کے چاند کی طرح نظر آتے ہیں۔ اور نورِ ذات آفتاب کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ غرض جس وقت ذاکر کے اندر اللہ تعالیٰ کا کوئی اسم نوری حروف سے مرقوم ہو جاتا ہے تو ذاکر اسی اسم کے نور اور بجلی کی طاقت سے بھر جاتا ہے اور اسی اسم کے نور، پاور اور طاقت سے انفس و آفاق میں اپنا اثر، فعل اور عمل جاری کرتا ہے۔ ایسی حالت میں کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص فلاں اسم یا کلام کا عامل ہو گیا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب کسی جذامی، کوڑھی یا مجنون بدروح والے کو اچھا کرنا چاہتے تو اللہ تعالیٰ کے اسم قُدُّوس کا دل میں ذکر یا تصور کرتے اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدوسیت کی طرف ملتجی اور متوجہ ہوتے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ حسب وعدہ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲ : ۱۵۲) اپنے اسم قدّوس اور نورِ صفتِ قدّوس کی تجلی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فرماتے اور وہ نوری صورت کبھی کبوتر کی شکل میں آسمان پر سے نازل ہوتی۔ اس وقت آپ اسمِ قدوس کے نور یعنی روح القدس سے بھر جاتے اور چونکہ جذامی، کوڑھی اور مجنون میں بدروح داخل ہوتی ہے جس سے ان کی خلقتِ ظاہری و باطنی بگڑ جاتی ہے اور اسم قدوس چونکہ ضد ہے تمام باطنی خباثتوں کی یعنی ایک نور اور دوم ظلمت ہے، ایک حق اور دوم باطل کا حکم رکھتی ہے۔ لہٰذا جب عیسیٰ علیہ السلام روح القدس کے نور سے بھرپور ہو کر جذامی یا مجنون کو ہاتھ لگاتے تو آپ کے نورِ قدس کی طاقت سے جذامی اور مجنون کے اندر سے بد اور خبیث روح نکل کر بھاگ جاتی۔ اور ہمیشہ نورِ حق کی روشنی سے ظلمتِ باطل بھاگ جایا کرتی ہے:

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ (بنیٓ اسرآئیل ۱۷ : ۸۱)۔

چنانچہ آپ کے آسمان کی طرف دیکھنے یعنی اللہ کی صفتِ قدوسیت کی طرف ملتجی ہونے اور روح القدس کے کبوتر کی شکل میں اترنے اور آپ کے روح القدس سے بھر جانے اور کوڑھی،

مجنون اور اندھوں وغیرہ سے بدروح نکال کر اچھا کرنے کے قصے اناجیل اور دیگر تاریخی کتابوں میں بکثرت مذکور ہیں۔

جب کبھی کسی نبی یا ولی کو مقامِ ازل کے تماشہ گاہ کو دیکھنے اور وہاں کی سیر کا ارادہ ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اسم اوّل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسی اسم کے نور میں سے طے ہو کر مقامِ ازل میں جا پہنچتا ہے اور اسی طرح اسم آخر سے مقامِ ابد اور اسم ظاہر سے مقامِ دنیا اور اسم باطن سے مقام آخرت کی سیر کرتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس تمام اسمائے صفات کے انوار سے اقتباس کر کے باطن میں حظِ وافر اٹھاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اسماء کا عامل بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی پاک صفات سے متصف ہونا آسان کام نہیں ہے کہ چند روز کسی اسم کو زبان سے ورد کر لیا اور بس عامل کامل بن گئے۔ جب تک سالک اپنی حادث ناسوتی صفات سے کلی طور پر فنا حاصل کر کے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تجلیۂ روح اور تخلیۂ سر حاصل نہ کر لے اور اللہ تعالیٰ کی اسمِ ذات کے غیر مخلوق نور سے بقا حاصل نہ کر لے تب تک اللہ تعالیٰ کے کسی اسم کا فیضان حاصل نہیں کر سکتا اور نہ کسی اسم کا عامل ہو سکتا ہے اور یہ عمل بغیر مربی مرشد اور پیر استاد کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور سالک عارف جس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل اور مرشدِ کامل کے فیض سے عامل کامل ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے انوار اسماء وصفات اور ذات میں سے بقدرِ وسعتِ استعداد محض اقتباس کرتا رہتا ہے لیکن اپنی کامل لازوال ذات اور قدیم صفات اور اسماء کی جامعیت، ذاتیت اور کلیت ہمیشہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو حاصل ہے۔ نہ اس سے کچھ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے۔ اَلْآنَ كَمَا كَانَ۔ انسان کے آئینے میں اپنے خاص فضل وکرم سے آفتابِ ذات، اقمار صفات اور نجوم اسماء سے تجلیات فرماتا ہے۔ اور انسان حسب استعداد اس عالم گیر فیضانِ الٰہی سے ظاہری وباطنی فیضان حاصل کرتا ہے۔ قولہٗ تعالیٰ:
وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (الاعراف ۷: ۱۵۶)۔

ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ ذکر سے ذاکر کے باطنی حواس کھل جاتے ہیں۔ ذاکر بندے اور مذکور ربّ معبود کے درمیان حجاب مرتفع ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کے دل اور دماغ کے اہم مقامات کے اندر شیطان اور اس کے جنود ابلیس نے ڈیرے لگائے ہوئے ہیں اور وہاں ظلمت کے قلعے بنا رکھے ہیں اور ان پر غفلت کے قفل لگا دیئے ہیں۔ ذاکر اسم

اللہ ذات کی نوری کلید سے غفلت کے تالے کھول لیتا ہے اور ذکر اللہ کی نوری تلوار سے ابلیس اور اس کے باطل جنود کو مار کر بھگا دیتا ہے اور اس میں انوار اسمائے الٰہی کے نوری قلعے بنا کر نوری مخلوق اور جنود اللہ اور حزب اللہ کے لطیف لشکر بسا دیتا ہے۔ ایسے ذاکر کا دل کعبۂ اعظم اور قبلۂ اقدس بن کر ارواحِ مقدسہ اور ملائکہ و نوری مخلوق کی عبادت گاہ اور سجدہ گاہ ہو جاتا ہے۔ اور ذکر، فکر، تلاوت، تسبیح، تقدیس، تکبیر، تحمید، تہلیل اور عملِ صالح، معرفت، قرب، وصال اور اللہ تعالیٰ کے اسرار و انوار کی منزل اور مقام بن جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| دل بدست آور کہ حج اکبر است | از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است |
| کعبہ بُنِ گاہِ خلیل آذر است | دل گذر گاہِ جلیل اکبر است |

(رومی)

ترجمہ: اپنے دل کو حاصل کر کیونکہ یہی حج اکبر ہے۔ اور ہزاروں کعبوں سے ایک دل بہتر ہے کیونکہ کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے رکھی ہے اور دل خود اللہ تعالیٰ کی گذرگاہ ہے۔

جس وقت انسان ذکر اللہ سے اعراض کرتا ہے تو اس کے وجود پر نفس شیطان اپنا غلبہ جما لیتا ہے اور دل و دماغ کو اپنے قبضے اور تصرف میں لے لیتا ہے اور بعدہٗ سارے وجود کو اس طرح گھیر لیتا ہے جس طرح عشق پیچہ درخت پر چھا جاتا ہے۔ انسان کے رگ و ریشے اور نس نس میں شیطان دھنس جاتا ہے اور دل، دماغ، کان، ناک، زبان، آنکھوں تمام مقاماتِ خمسہ حتیٰ کہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے میں خون اور جان کی طرح سما جاتا ہے۔ جسم کے ہر مسام میں وہ اپنا راستہ بنا لیتا ہے اور انسان کے ہر سانس اور دم کے ساتھ انسان کے اندر آتا جاتا ہے۔ ایسے آدمی کے دل و دماغ اور حواسِ خمسہ کے مقامات آنکھ، ناک، کان، زبان، اور جسم کے تمام اعضا پر باطن میں شیطانی ظلمت اور تاریکی کے بادل چھا جاتے ہیں۔ ایسے آدمی کے دل اور دماغ سے حق اور باطل کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ اس ظلمت اور غفلت کے باعث انسان موت، یومِ آخرت اور حساب کتاب کو بھول جاتا ہے۔ اور ثواب و گناہ، نیکی و بدی اور حلال و حرام یکساں نظر آتے ہیں۔ خوفِ خدا دل سے اٹھ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدہ وعید دل سے یک دم فراموش ہو جاتے ہیں اور جو کچھ سوچتا ہے برا ہی سوچتا ہے۔ کیونکہ اس کے دل و دماغ شیطان کے تابع ہو جاتے ہیں۔ ایسے بدبخت آدمی

کو الٹا برے اعمال اور شیطانی ارادے اچھے معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (العنکبوت ۲۹ : ۳۸)۔ ایسے شخص کو نیک اور بزرگ لوگ اور ان کے طرز و اطوار برے معلوم ہوتے ہیں اور برے، فاسق، فاجر، کافر، مشرک اور منافق لوگ اور ان کے برے طور طریقے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا آدمی حیوانِ ناطق بن جاتا ہے بلکہ نفسانی اور شہوانی اعمال کی بے اعتدالیوں اور برائیوں میں حیوان سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ اگرچہ ظاہری جسمانی لحاظ سے جالینوسِ زماں اور افلاطونِ وقت ہی کیوں نہ ہو دارِ آخرت میں حیوانوں کی شکل میں یا ابدی اندھے، لولے لنگڑے، اپاہج، بیمار اور مفلس کنگال کی صورت میں اس کا حشر ہوگا۔ اور طرح طرح کے دائمی عذابوں میں مبتلا ہوگا یہ سب ذکر اللہ اور اسم اللہ تعالیٰ سے اعراض اور غفلت کے نتائج ہیں۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ (طٰهٰ ۲۰ : ۱۲۴)۔ ترجمہ ”جس شخص نے میرے ذکر سے اعراض کیا پس اس کی باطنی روزی تنگ ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا کر کے کھڑا کریں گے۔“ پس انسان کو چاہیے کہ اپنے وجود کے تمام مقامات خصوصاً دل اور دماغ میں اسم اللہ کا نوری چراغ روشن کرے تا کہ اسم اللہ کے نورِ حق سے ظلمتِ باطل بھاگ کر کافور ہو جائے۔ اسلام میں ذکر اللہ کے مختلف مظاہروں یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمہ وغیرہ کے لزوم اور فرضیت کی حکمت اور فلاسفی یہی ہے کہ انسانی جسم کے ہر عضو اور اندام سے غیر اللہ کو نکال دیا جائے اور اس میں اللہ کا ذکر اور نور بسا دیا جائے۔ نہیں دیکھتے کہ نماز میں انسان کا تمام جسم اور ہر عضو ذکر کے ساتھ حرکت اور کام کرتا ہے بلکہ وضو کے وقت ہر عضو کو دھوتے اور پاک کرتے وقت ساتھ ساتھ ذکر اللہ تعالیٰ اور اس کے تصور سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اور پھر نماز میں پیشانی سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک جسم کا ذرہ ذرہ عبادت اور ذکر اللہ میں شامل اور اللہ تعالیٰ کے تصور میں داخل ہو جاتا ہے۔ خاص کر دل و دماغ کو جب تک غیر اللہ سے خالی کر کے اس میں ذکر اللہ اور تصور اللہ کا قائم نہ کیا جائے تب تک نماز صحیح اور مکمل نہیں ہوتی۔ حدیث۔ لَاصَلٰوةَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ۔ لہٰذا نماز میں جسم کے تمام حواس و اعضا خصوصاً دل اور دماغ کی ذکر اور خیال و التفات غیر اللہ سے حفاظت لازمی اور ضروری ہے۔ قولہ تعالیٰ: حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ

الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ○ (البقرۃ: ۲: ۲۳۸)۔ ترجمہ: ’’اپنی نماز پر محافظ اور نگہبان بنے رہو اور خاص کر (اندرونی دل و دماغ کی) نمازِ وسطیٰ کی حفاظت کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے آپ کو پوری محویت میں قائم رکھو۔‘‘ اس لیے تو نماز میں بدن کے تمام اعضا کو ذکر اللہ تعالیٰ کا مقید اور پابند کیا جاتا ہے کہ تھوڑی سی غیر اللہ کی جانب حرکت اور خفیف التفات سے نماز فاسد بلکہ باطل ہو جاتی ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کو جب کبھی نماز میں غیر اللہ کا کوئی خیال آتا تو آپ آخر میں سجدۂ سہو کر لیتے۔ مثلاً از قسم نعمائے دارِ عقبےٰ کا خیال۔ اگر کوئی دنیوی خیال از وجہِ حلال آتا تو سلام پھیر کر نماز توڑ لیتے اور پھر سے نماز شروع کرتے۔ اور اگر کوئی دنیوی خیال از وجہ مشتبہ یا حرام دل میں آتا تو از سرِ نو وضو کرتے اور نماز شروع فرماتے۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ خیالِ غیر کی وجہ سے آپ دوبارہ وضو کیوں کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ خواص کے لیے دنیا کا خطرہ ریح کے خارج ہونے سے بھی بڑھ کر ناقصِ وضو اور مفسدِ نماز ہے۔ غرض نماز کے وقت انسان کو اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرۃ ۲: ۲۰۸) کا مکمل نمونہ اور وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ○ (المزمل ۷۳: ۸) کا پورا مصداق بننا پڑتا ہے تب کہیں نماز کا حق پورا ادا ہوتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جس وقت حضورِ دل سے پورے طور پر نماز ادا نہیں ہو سکتی تو پھر رسمی اور ظاہری طور پر خطراتِ دنیوی اور خیالاتِ غیر سے بھری ہوئی نماز کا کیا فائدہ ہے۔ اس موقع پر شیطان بہت طالبوں کی طریقت میں راہ مار کر انہیں گمراہ کر لیتا ہے اور تارک الصلوٰۃ بنا دیتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس ظاہری نماز کی حفاظت اور تکمیل کا نام حضورِ دل والی نماز ہے اور اسی ظاہری نماز کو کماحقہٗ ادا کرنے سے باطنی نماز کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہری نماز مع جملہ ارکان دودھ کی مانند ہے اور انسانی وجود بمنزلہ ظرف، گلی کے ہے۔ اور انسانی دل مدھانی کی طرح ہے جس سے دودھ بلویا جاتا ہے۔ اب جس نے خالص دودھ حاصل کر لیا اسے ٹھیک طور پر جما لیا اور پھر اسے اپنے جسم کے برتن میں ڈال کر دل کی مدھانی کو ذکرِ قلبی اور حضورِ دل کی حرکت سے ہلانا اور چلانا جاری رکھا اور اسی طرح دودھ بلوتا رہا تو ایسا شخص ضرور باطنی نماز اور حضورِ دل والی مقبول نماز کے مکھن کو حاصل کر لے گا۔ اور جس شخص کے پاس سرے سے دودھ ہی نہیں ہے وہ خاک بلوئے گا اور مکھن کہاں سے لائے گا۔ ظاہری اور شرعی نماز ادا

کرنے والے کو اتنا فائدہ تو ضرور رہتا ہے کہ اگر خالص دودھ نہیں ملایا اس میں کوئی مخالف چیز پڑ گئی یا دہی ٹھیک نہیں جمی تو اگر مکھن حاصل نہ ہوا اور چھاچھ عمدہ نہ بنے پھر بھی سادہ اور معمولی سی لسی اور چھاچھ تو بن جاتی ہے۔ اور بہ نسبت اس کاہل حیلہ جو آدمی سے فائدے میں رہتا ہے جو کہتا ہے کہ ہم بغیر دودھ کے مکھن حاصل کرتے ہیں۔ نماز میں خطرات اور خیالات غیر کا پیش آنا ایک مجبوری امر ہے۔ اور جس چیز کی محبت غالب ہوتی ہے اسی کے خیالات اکثر دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ حتی الوسع نماز کو غیر خیالات سے بچانا چاہیے۔ اسی لیے نماز کے شروع میں تکبیرِ تحریمہ لازمی اور فرض ٹھہرائی گئی ہے کہ جس وقت کہا اَللّٰہُ اَکْبَرُ یعنی اللہ سب سے بڑا ہے تو باقی تمام کائنات کی اشیاء اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اصغر اور چھوٹی ٹھہریں۔ پس سب غیر خیالات کو تکبیرِ تحریمہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کی تلوار سے قطع اور دور کر دینا چاہیے۔ تب تکبیرِ تحریمہ بھی صحیح ہے۔ نماز اگر صحیح طور پر ادا کی جائے تو سچ مچ اس کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے اور باطن میں عروج کرتا اور چڑھتا جاتا ہے۔ اسی واسطے تو نمازی اوجِ نماز سے اترتے وقت باطنی پرواز اور روحانی سفر سے واپس ہوتے وقت اپنے دائیں بائیں ساتھیوں پر آ کر سلام کہتا ہے۔ ہمارے آقائے نامدار احمدِ مختار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات اپنے پروردگار کی طرف روانہ ہوئے اور راستے میں آپ نے ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی و لوح و قلم کے مختلف ملائکہ اور اگلے پیغمبروں کی مقدس روحوں کو اپنی اپنی منزل اور مقام پر دیکھا کہ قسم قسم کی عبادتوں میں مشغول ہیں اور طرح طرح کے ذکر اذکار و تلاوتِ کلام اللہ میں مصروف ہیں۔ بعض قیام میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے گیت گا رہے ہیں، بعض بیٹھ کر حق سُبحانہٗ و تعالیٰ کی تحمید و تقدیس میں مصروف ہیں اور بعض سجدے میں پڑے ہوئے اس کے بے مثال جمال کی تحمید و توصیف اور اس کے لازوال جلال کی تمجید و تکبیر میں مشغول ہیں۔ تو آپ ﷺ کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش مجھے اور میری امت کو کوئی ایسا جامع اور مکمل طریقۂ عبادت عطا کیا جائے کہ جس میں تمام انبیاء و مرسلین اور جملہ ملائکہ مقربین اور تمام مخلوقاتِ اولین و آخرین کی عبادات اور ان کے طور طریقے جمع ہوں۔ جس وقت آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی تمام آیاتِ کُبریٰ کا مشاہدہ کر کے مقام "قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ○ (النجم ۵۳ : ۹)" میں پہنچے اور اللہ تعالیٰ کے بیمثل بے مثال دیدار پر انوار سے

مشرف ہوئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خلعتِ اصطفائیت پہنائی اور تاجِ لولاک آپ ﷺ کے سر پر رکھا اور دولتِ دارین کے خزانے اور سعادتِ کونین کے کنوز آپ ﷺ کے سپرد فرما کر فرمایا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ (المآئدة ۵: ۳)۔ تو اس وقت آنحضرت ﷺ کو حسب تمنائے قلبی و آرزوئے دِلی منجملہ ان نعما فیض فضلی کے ایک بڑی بھاری نعمت یہ بھی ملی کہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو یہ موجودہ نماز ایسا جامع اور مکمل طریقۂ عبادت بارگاہِ کبریا سے عطا ہوا کہ جس میں ساتوں آسمانوں عرش و کرسی، لوح و قلم کے جملہ ملائکہ کی عبادات کی مختلف ادائیں اور طرح طرح کی اطاعتوں کی طرزیں مثلاً قیام، رکوع، قعود اور سجود وغیرہ اور حمد و ثنائے الٰہی کے جملہ طریقے مثلاً تسبیح و تقدیس، تحمید و تمجید اور تہلیل وغیرہ شامل و مندرج ہیں۔ کائناتِ عالم کی جملہ مخلوقات مثلاً جمادات، نباتات اور حیوانات جن کو قادرِ قیوم نے بمقتضائے یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ (الجمعة ۶۲: ۱) اپنی تسبیح و تقدیس میں مشغول کر ڈالا ہے۔ ان سب کی تسبیح کی فطرتی طاعت اور قدرتی عبادت اسی نمازِ پنج گانہ میں شامل ہے۔

جس طرح ہمارے آقائے نامدار افضل المرسلین ﷺ اور آپ ﷺ کی امت خیر الامم ہے اسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے طریقۂ عبادت بھی وہ مرحمت فرمایا ہے جو جملہ طریقہ ہائے عبادات اور طرزِ طاعات سے بہتر اور عمدہ ہے۔ نماز کے چہارگانہ ارکان قیام، رکوع اور قعود و سجود کے اندر نمازی اللہ تعالیٰ کے اسمِ ذات یعنی لفظ اَللّٰہُ کے چاروں حروف کی یوں صورت بناتا ہے: اَلّٰلہُ [1] اور سجدے میں اپنے پہلوؤں میں دو طرفہ مُحَمَّد ﷺ کے یوں قاب قوسین بنا کر وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ (العلق ۹۶: ۱۹) کا حق ادا کرتا ہے۔

غرض نماز کیا ہے۔ اپنے دل و دماغ اور جسم کے تمام حواس اور کل اعضاء سے پروردگارِ عالم کے سامنے اپنی بندگی و عبودیت اور عجز و انکسار کا اظہار ہے۔ اس خالق مالک کی ازلی یاد اور اس محسنِ حقیقی کے بے شمار احسانات کا شکریہ، اس کے جمالِ بے مثال کی حمد و ثنا اور اس کے جلالِ لایزال کی یکتائی اور عظمت کا اقرار اور اس محبوبِ ازلی سے مہجور روح کی پکار ہے۔ یہ اپنے آقا اور ولی نعمت شاہنشاہِ دو عالم کی بارگاہِ قدس میں جسم و جاں کی بندگی اور اپنے

---

[1] (الف قیام، ل رکوع، دوسرا الف پھر قیام، اور ہ سجود)

اندرونی احسانات کا عرض نیاز ہے۔ یہ ہماری روح کے ساز کی ازلی پُر سوز آواز ہے۔ یہ واجب وممکن، قدیم وحادث اور خالق ومخلوق کے درمیان معرفت کا رابطہ اور محبت کا رشتہ ہے۔ اس میں ازل کی بے قرار روح کی تسکین، دنیا میں مضطرب اور پریشان جان کی تشفی، قبر میں تنہا مایوس دل کا سکون اور میدانِ حشر میں خائف اور محزون نفس کے لیے پروانہ نجات ہے۔ یہ انسان کی روزانہ زندگی کا حاصل اور اس کی عزیز ہستی کا پھل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی پوشیدہ ساز ہے جو غیبی انگلیوں سے بجتا رہتا ہے۔ جس کی مستی اور جوشِ مسرت میں انسانی روح سے عبودیت کا یہ فطرتی رقص پیدا ہوتا ہے۔ یہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ط (الاعراف ۷: ۱۷۲) کے مشکل سوال کا بہترین حل اور مکمل جواب ہے۔ اسلام کے پنجگانہ ارکان اسی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر کے مکمل اور جامع مظاہرے ہیں۔ اور ان میں اس قدر بے شمار حکمت کے گوہر آبدار اور معرفت کے دُرِ شہوار پوشیدہ اور پنہاں ہیں کہ اگر ہر ایک کو کھول کھول کر مفصل اور واضح بیان کیا جائے تو ہر ایک کے لیے ایک علیحدہ دفتر چاہیے۔ لہٰذا ہم مختصر طور پر مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتے ہیں۔ اسلام کے دوسرے چھوٹے رکن کلمۂ طیب کو لے لیجیے۔ گو بظاہر ایک چھوٹا سا کلمہ اور معمولی جملہ معلوم ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی بر سرِ زبان بہت آسان ہے لیکن اس کی حقیقت اور عظمت بہت بھاری اور گراں ہے۔ اور اس کا عمل اور حکم باقی چاروں ارکان میں نافذ اور رواں ہے۔ نماز کے اندر تو اس کے حکم نفی اور اثبات کا مظاہرہ دیکھ لیا کہ جب تک خیال اور تصور سے غیر اللہ کی نفی نہ کی جائے اور تصور میں اللہ تعالیٰ کو ثابت اور قائم نہ کیا جائے، نماز درست نہیں ہوتی۔ یعنی تمام نماز میں کلمۂ طیب کے نفی اثبات کے حکم پر مکمل عمل درکار ہے اور اسی پر ساری نماز کا دارومدار ہے۔ اب دوسرے رُکن روزۂ رمضان کو لے لیجیے۔ روزہ میں تمام نفسانی لذات اور جسمانی قوت کی نفی کر کے اس کی جگہ دل اور روح کی باطنی لذات اور روحانی غذاؤں اور قوتوں یعنی ذکر فکر، تلاوت کلام اللہ تسبیح وتقدیس اور نیک اعمال کا اثبات کیا جاتا ہے۔ جب رمضان کے روزے کی فلاسفی اور حکمت میں ہم غور کرتے ہیں تو وہاں بھی اسی کلمۂ طیب کے نفی اثبات یعنی لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کا عمل جاری نظر آتا ہے۔ اور علاوہ اس کے کھانے پینے اور جماع وغیرہ نفسانی لذات کے غیر اشغال سے رکاوٹ بھی اسی واسطے رکھی گئی ہے کہ عنصری جثّہ کی مادی قوت کو لَآ اِلٰـهَ کی تلوار

سے قطع کر کے روح کا تعلق تمام لذاتِ ماسویٰ اللہ سے توڑا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ابدی دائمی لذات سے اس کا رشتہ جوڑا جائے۔ رمضان کے صیام النہار اور قائم اللیل کے چوبیس گھنٹوں میں اس کلمۂ طیّب کی نفی و اثبات کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ انسان کے جسم و جان اور قالب و قلب سے غیر کے نفسانی تعلقات اور اللہ تعالیٰ کی جانب خیر کے روحانی فیوضات اور برکات کی نفی اور اثبات کا عمل اسلام کے دو ارکان نماز اور روزہ ماہِ رمضان میں دیکھ لیا۔ اب انسان کے لیے اس مادی دنیا میں غیر اور ماسویٰ اللہ کی صرف دو قسم کی پابندیاں اور گرفتاریاں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک تو وطن اور آل و عیال اور خویش و اقارب کی محبت کی پابندی اور قید ہے۔ سو اسلام کے تیسرے رکن حج بیت اللہ شریف سے اس کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بجائے وطنِ اصلی مقام ازل اور خانہ ابدی بیت المعمور اور محبوبِ ازلی کے قرب و وصال اور مشاہدے و دیدار کی محبت و اشتیاق کی اثبات کی جاتی ہے۔ اور دوسری پابندی صرف مال و دولتِ دنیوی کی ہے۔ سو اس کی نفی اسلام کے چوتھے رکن زکوٰۃ سے ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دولت و ثروتِ آخرت و توشۂ عقبیٰ کی فراہمی کے فکر اور خیال کو ثابت کیا جاتا ہے۔ سو اسلام کے اس چھوٹے اور مختصر رکن کلمۂ طیب کا عمل اور حکم اسلام کے چاروں بڑے عملی ارکان میں نافذ اور جاری ثابت ہوا۔ اس لیے انسان کو اسلام میں داخل کرتے وقت پہلے پہل صرف کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ پڑھایا جاتا ہے کیوں کہ اسی مختصر گوہرِ آبدار کے اندر تمام دنیائے اسلام کے بحرِ ذخار جمع ہیں۔ اور توحید و رسالت کے اس چھوٹے اور مختصر زبانی اقرار میں آخرت کے تمام مذہبی اور روحانی جوابات جمع ہیں۔ چونکہ تمام اسلامی ارکان اور دینی اعمال کا ماڈل اور نمونہ اس دنیا میں ہمارے پاس محض حضرت سرورِ کائنات ﷺ کا وجودِ باجود اور آپ ﷺ کی حیاتِ بابرکات اور آپ ﷺ کی زندگی کے حالات اور آپ ﷺ کی زندگی کے پسندیدہ اخلاق اور نیک اعمال و افعال اور آپ ﷺ کی جملہ حرکات و سکنات ہیں اور آپ ﷺ کی متابعت کے بغیر اسلام کے جملہ ارکان اور ان میں نفی و اثبات کے حکم پر عملدرآمد ناممکن ہے اس لیے کلمۂ طیب کے دونوں جملوں اور حصوں یعنی اقرارِ توحید یا نفی اثبات لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اقرارِ رسالت یا متابعتِ نبوی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ کی شان ایک ہے۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳: ۳۱)۔

ترجمہ: ''اے میرے نبی! اپنی امت سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ کی محبت کا دم بھرتے ہو تو میری متابعت کرو۔ اس سے تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔'' زہد و تقویٰ کا ایمان الگ ہے اور محبت کا ایمان الگ ہے۔ اَلَا لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا مُحَبَّۃَ لَہٗ اور حدیث لَا یُؤْمِنُ اَحَدُ کُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبُّ اِلَیْہِ مِنْ مَّا لِہٖ وَاَوْلَادِہٖ وَاَقَارِبِہٖ وَمِنْ نَّفْسِہٖ بعض خشک مزاج لوگ اسلام میں محض نفی اثبات اور خالی توحید کے اقرار کو کافی سمجھتے ہیں اور کلمے کے دوسرے حصے مُحَمَّد'' رَّسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کی اہمیت اور ضرورت کو نظر انداز کرتے ہیں اور اصلی ایمان محبت و ہدایت کے قائل نہیں ہیں۔ یہ لوگ کس قدر نادان ہیں کہ راستے کو راہبر اور راہنما سے خالی اور دستور العمل کو ٹھوس ماڈل اور نمونہ سے زیادہ ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ کیونکہ راستے بہت ہیں اور غولِ بیابانی بے شمار۔ میرے خیال میں کلمۂ طیب کے پہلے حصے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی اقرارِ توحید اور نفی اثبات سے بھی کلمے کے دوسرے حصے مُحَمَّد'' رَّسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ وجہ یہ ہے کسی مذہب والے سے جا کر پوچھو کہ تم خدا کو مانتے ہو۔ سب کہیں گے ہاں ہم خدا کو مانتے ہیں۔ اور اگر کہو کہ اس کو ایک مانتے ہو تو وہ خدا کو ایک ماننے کے لیے بھی تیار ہو جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات خالق، مالک، رازق وغیرہ گنتے جاؤ۔ سب کا اقرار کر دیں گے۔ لیکن اگر کہو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہو تو ان کو سانپ سونگھ جائے گا۔ کسی کافر، منافق، مُشرک، بے دین کے سامنے توحید اور نیک اعمال کی باتیں کرو وہ تسلیم کرتا جائے گا۔ لیکن تم جس وقت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا نام مبارک لو گے تو ان پر بجلی گر جائے گی۔ اگر صرف خالی توحید اور نیک عمل کا اقرار اصلی چیز ہے تو سب مذاہب سچے ہیں۔ سو معلوم ہو گیا کہ ایمان کی اصلی کسوٹی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار، آپ ﷺ کی متابعت اور درحقیقت آپ ﷺ کی محبت ہے۔ جسے آپ ﷺ کی محبت نہیں ہے اس کا ایمان ہی نہیں۔ جسے آپ ﷺ کی رہنمائی حاصل نہیں وہ گمراہ ہے۔ جس کے دل میں آپ ﷺ سے حسد اور بغض و عناد ہے وہ راندۂ درگاہ ہے۔ خواہ شیطان کی طرح تمام جہان کا عالم اور زاہد و عابد کیوں نہ ہو۔ مسلم کا سرمایۂ اسلام آپ ﷺ ہیں۔ مومن کی متاعِ ایمان آپ ﷺ ہیں۔ دیندار کے دین کی دولت آپ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کے بغیر دین و ایمان کچھ نہیں۔

بمُصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است
(اقبالؔ)

کسی عارف نے آپ ﷺ کے حق میں کیا اچھا کہا ہے۔

اے صبحِ صادقاں رُخِ زیبائے مصطفیٰؐ — وے سروِ راستاں قدِ رعنائے مصطفیٰؐ
آئینۂ سکندر و آبِ حیاتِ خضرؑ — نورِ جبیں و لعلِ شکرخائے مصطفیٰؐ
معراجِ انبیاء و شبِ قدرِ اصفیاء — گیسوئے روئے پوش و کمر سائے مصطفیٰؐ
ادریس کو مدرسِ درسِ معارف است — لب بستہ پیشِ منطق گویائے مصطفیٰؐ
عیسیٰؑ کہ دیرِ دائرِ علوی مقامِ اوست — شد دارِ ذروۂ علیائے مصطفیٰؐ
بر ذُروۂ دنیٰ فتدلّٰے کشیدہ سر — ایوانِ بارگاہِ معلائے مصطفیٰؐ
از جامِ روح پرورِ مازاغ گشتہ مست — آہوئے چشمِ دل کش شہلائے مصطفیٰؐ
خیاطِ کار خانہ لولاک دو ختہ — پیراہن لُبیک ببالائے مصطفیٰؐ
شمس و قمر کہ لُو لُوءِ دریائے اخضر اند — از روئے مہر آمدہ لالائے مصطفیٰؐ
قرصِ قمر شکست بریں خوانِ لاجورد — وقتِ صلائے معجزہ ایمائے مصطفیٰؐ
کحل الجواہر ملک و توتیائے روح — دانی کہ چیست خاکِ کفِ پائے مصطفیٰؐ
روح القدس کہ آیتِ قربت نشانِ اوست — قاصر ز درکِ پایۂ ادنائے مصطفیٰؐ

خواجہ گدائے درگہِ او شد کہ جبرئیلؑ
شد باکمال مرتبہ مولائے مصطفیٰؐ

اب کلمۂ طیب کا ایک آخری مختصر سا نکتہ بیان کر کے ہم موجودہ مضمون کو ختم کرتے ہیں اور پھر اسم اللہ ذات کے سابق موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کلمۂ طیب کا یہ باریک نکتہ بہت اہم اور ضروری ہے اور اسے آج تک کسی نے بیان نہیں کیا۔ کلمۂ طیب کے نفی اثبات کے بارے میں گو بزرگانِ دین نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن تمام بیانات میں اصلی اشکال

ترجمہ: تو خود کو حضرت رسالت مآب ﷺ سے وابستہ کرلے کہ وہی مرکزِ دینی ہیں۔ اگر تو ان تک نہ پہنچ سکا تو سراسر کافری ہوگی۔

باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ کلمۂ طیب میں کس چیز کی نفی کی جائے اور کس کو ثابت کیا جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جملہ معبودوں کی نفی کر کے ایک معبودِ برحق کو ثابت کرنا ہے تو یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ ہر مذہب والے اپنی دانست اور زعم میں اپنے مقرر کردہ معبود کو برحق ثابت کرتے ہیں اور باقی جملہ ادیان کے معبودوں کو باطل قرار دے کر ان کی نفی کرتے ہیں۔ سو نفی اثبات کا عمل ہر دین اور ہر مذہب میں جاری ہے تو کیا ہر مذہب کا خدا برحق ٹھہرا۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ ہم نے اس معبودِ برحق کو ثابت کرنا ہے جس کا پتہ اس کے سچے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ہم کو دیا ہے۔ جس کا حال قرآن اور احادیث کے ذریعے آپ ﷺ کی زبانِ حق ترجمان سے ہم کو معلوم ہوا ہے۔ جیسا کہ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

آں[1] ذاتِ خداوند کی مخفی است بعالم
پیدا و عیاں است بہ چشمانِ محمدؐ

(سعدیؒ)

سو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کے توسط اور توسل کے بغیر ہمارا خدا مشکوک رہ جاتا ہے اور ہمارا معبود اس کے بغیر صحیح اور درست نہیں ہوتا جیسا کہ فرعون نے غرق ہوتے وقت اعلان کیا تھا: اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ۔ کہ میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خدا پر ایمان لایا ہوں۔ فرعون کو معلوم ہو گیا کہ میرے مقرر کردہ خدا باطل ثابت ہوئے۔ سو کلمے کے اندر ہم نے ربِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت کرنا ہے اور باقی سب ادیان کے مقرر کردہ معبودوں کو باطل سمجھ کر ان کی نفی کرنی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک باریک اشکال اسی نفی اثبات کی بابت باقی رہ جاتا ہے کہ ہم نے باقی باطل ادیان کے معبودوں کی نفی کر ڈالی اور ایک شارعِ اسلام علیہ السلام کے مقرر کردہ معبود کو کلمۂ طیب سے ثابت کر لیا۔ لیکن ہم جس معبود کو بھی ثابت کریں گے وہ پھر بھی ہمارے خیال کا مقرر کردہ معبود ہو گا۔ سو ہمارے خیال میں مخلوق آ سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ شکل و شباہت سے منزہ اور جسم و صورت سے پاک، خدوخال سے مبرّا غیر مخلوق ذات ہے۔ حالانکہ ہم مخلوق اور ہمارا خیال مخلوق ہے۔ سو ہم میں ہر ایک کا ایک خیالی خدا ہو گا اور پھر ہر ایک کا خیال الگ ہے تو ہر شخص کا ایک الگ

---

[1] ذاتِ حق جو عالم میں پنہاں ہے وہ حضور ﷺ کی نگاہوں میں ظاہر اور نمایاں ہے۔

خدا ہو گیا۔ اور جس قدر لوگ ہیں اسی قدر خدا ثابت ہوں گے۔ پس یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا یا اگر اس طرح سمجھا جائے جس طرح بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ "ہر چہ دیدہ یا شنیدہ یا بعلم آوردہ شدہ است ہمہ را در تحتِ لا باید آورد" اور سعدیؒ نے بھی اسی کے مطابق فرمایا ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ دیدہ ایم وشنیدیم و خواندہ ایم

(سعدیؒ)

یعنی جو کچھ ہم نے دیکھا یا سنا یا پڑھا ہے سب کی نفی کی جائے۔ سو اس طرح تو سنے ہوئے دیکھے ہوئے اور پڑھے ہوئے معبودوں کی نفی ہم نے اپنے خیال میں کر لی۔ لیکن اثبات کا معاملہ ویسا کھٹائی میں پڑا رہ گیا اور ہم نے ثابت کچھ نہ کیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس معبود کو برحق سمجھ کر ثابت کیا جائے جس کی صفات اور اسما ہمیں اسلام نے بتائے ہیں۔ سو ہمارے دل اور خیال میں بیک وقت ایک صفت اور ایک ہی اسم سما سکتا ہے۔ یا اگر تمام صفتوں کا ایک معجونِ مرکب بنا کر خیال میں لایا جائے تو اول یہ محال ہے اور اگر ممکن ہو تب بھی خیالی معبود ہو گا۔ سو ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی ذات و جملہ صفات اور اسما کے قائم مقام صرف ذاتی اسم ہی ہے جو ہمارے خیال میں آ سکتا ہے۔ اگر چہ اسم بھی حروف وصوت کے مرکب مخلوق بت کی طرح ہے۔ لیکن اسے ذات بے مثل مسمّٰے کی مثال بنائے بغیر چارہ نہیں۔ اور یہ بڑا بت سہی لیکن باقی جملہ ماسوئ مخلوق بتوں اور معبودوں کی نفی اس کے بغیر محال اور ناممکن ہے۔ غرض خیالات کے یہ بے شمار بت ہرگز نہیں ٹوٹتے جب تک موحدِ اعظم حضرت ابراہیمؑ کی طرح نفی لَآ اِلٰـہ کا تیشہ ہاتھ میں نہ لیا جائے اور اسے اسم کے بڑے بت کے کندھے پر نہ رکھا جائے اور اسم کو مسمّٰے کے معنی میں نہ لیا جائے۔ سو یہ طلسم اسم کے ذریعے ہی ٹوٹ سکتا ہے اور یہ معمّٰی اسم اور مسمّٰے کے ملانے سے حل ہو سکتا ہے۔ یعنی جب ہم نے اسم کو قائمقام مسمّٰی کے بغیر خیالات و واہمات اور قیاسات کے ثابت کیا تو شارعِ اسلام کا مقرر کردہ معبودِ برحق موصوف بجمیع صفات و اسما اس میں آ گیا اور اس میں جملہ خیالات کی نفی ہو گئی۔ اور اسی اسم اللہ ذات میں سے جملہ صفات اور اسما کا ظہور جس وقت جس مقام پر اور

جس طرح ہوگا وہ برحق ہوگا اور ہمارے خیالات کو اس میں مداخلت کی ضرورت نہ رہے گی۔
یہ ہے کلمۂ طیب کی درست ادائیگی اور صحیح نفی اثبات بلا مداخلت خیالات و واہمات۔

ہم اسم[1] توئی و ہم مسمّٰی　　عاجز شدہ عقل زیں معمّٰے

یہ دُرِ شہوار ابرِ نیسانِ نبوت سے مترشح ہیں۔ یہ گوہرِ آبدار گنجینۂ نبوت سے ماخوذ ہیں۔
یہ معارف و اسرار کسی کتابی اور درسی علوم کا نتیجہ نہیں ہیں۔ نہ شنیدہ ہیں اور نہ دیدہ بلکہ فضلِ حق کے آفریدہ اور فیضِ رسالت سے رسیدہ ہیں۔ منصف مزاج اور سلیم العقل حضرات اپنے مطالعہ گاہوں میں ان پر ناقدانہ نگاہیں ڈال کر ان کی صداقت کی داد دیں گے اور ان کی قدر جانیں گے۔

کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی　　خاور دمد از شبم بایں تیرہ شبی
اے دوست ادب کہ در حریم دلِ ماست　　شاہنشہِ انبیا رسولِ عربیؐ
(گرامی جالندھری)

اب ہم پھر اپنے اصلی موضوع کی طرف آتے ہیں۔ پس ذاکر کو چاہیے کہ اپنے وجود کے تمام مقامات میں اسم اللہ ذات کا نوری چراغ روشن کرے تاکہ اسم اللہ ذات کے نورِ حق سے ظلمتِ باطل کافور ہو جائے۔ انسان جس عضو سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے یا نیک عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ بمقتضائے فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲: ۱۵۲) اسی مقام پر اسی اسم کے ساتھ متجلی ہوتا ہے اور طالب اسی اسم کو نوری حروف سے لکھا ہوا پاتا ہے اور دیکھتا ہے مثلاً ایک شخص رات کو کئی ہزار دفعہ زبان سے اللہ اللہ کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی گاہ بگاہ دل بھی ذکر اللہ کے خیال میں لگ جاتا ہے۔ اور کان سے اسم اللہ کو سنتا ہے اور دماغ میں اس کا ذکر کرتا ہے اور ہاتھ اسم اللہ ذات کو لکھنے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ غرض انسان کے جسم میں جو عضو اور اندام اس ذکر میں شامل ہوتا ہے تو کثرتِ اذکار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مقام میں نور اسم اللہ ذات متجلی ہو جاتا ہے اور وہاں اسم اللہ ذات نوری حروف سے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے

---

[1] تو اسم بھی ہے اور مسمّٰی بھی ہے عقل اس عقدے کو سلجھانے سے عاجز ہے۔
[2] (اس تشنہ لبی) یعنی باوجود اس کے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں، میرے لبوں سے چشمۂ کوثر ٹپک رہا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ میری رات تاریک ہے میری رات سے آفتاب کا اظہار ہو رہا ہے۔ اے دوست! باادب رہ کہ میرے دل کے حریم (حرم سرائے) میں شاہنشاہِ انبیاء رسولِ عربی جلوہ افروز ہیں۔

مرقوم ہو جاتا ہے۔ گویا ذکر اللہ میں ظاہر کوشش کرنا، حکم فَاذْكُرُوْنِيْٓ (البقرة ۲: ۱۵۲) بجا لانا، دودھ جمانا اور بلونا ہے۔ اور اسم اللہ کا نوری حروف سے باطن میں مرقوم ہو جانا مکھن کی مانند یا ایجاباً وعدہ اَذْكُرْكُمْ (البقرة ۲: ۱۵۲) ہے۔ غرض تمام اشغال ذکر اذکار اور نیک اعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس اسم کا جس عضو سے ذکر کیا جاتا ہے یا نیک عمل کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسی ذکر کے ایجابی ایفا یا اسی نیک عمل کی جزا کی صورت میں اس عضو کو اپنے اس خاص اسم کے نور سے روشن اور منور اور زندہ تابندہ کر دیتا ہے۔ اور جس قدر اسم کا ذکر یا نیک عمل خلوصِ قلب اور حضورِ دل سے کیا جاتا ہے اسی قدر وہ اسم خوشخط اور روشن و تابان ہوتا ہے۔

اگر درود شریف کی کثرت کی جائے تو اسم مُحَمَّدٌ ﷺ متجلی و مرقوم ہو جاتا ہے اور اسی پر ہر اسم، کلام اور عمل کو قیاس کر لینا چاہیے۔ نوری اسم اس مذکور کا گویا باطنی ایجابی پیغام یا نوری پروانہ ہوتا ہے جو ذاکر کے پاس برائے اطمینان و سکونِ خاطر اللہ تعالیٰ سے پیش ہوتا ہے۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدة ۴۱: ۳۰)۔ یہ بات عوام کو تو معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس زمانے کے خواص بھی اس سِرّ سے ناواقف ہیں کیونکہ یہ ایک رازِ سربستہ ہے۔ اور یہ نوری اسم مرقوم محض صاحبِ تصور اسم اللہ ذات کامل عارف ہی کو نظر آ سکتا ہے۔ باقی ذاکر لوگ محض ذکر کی تاثیر گرمی، سردی، لذت، آواز اور روشنی وغیرہ میں سے کوئی چیز محسوس اور معلوم کرتے ہیں تو اسم اللہ تعالیٰ مرقوم کے نوری حروف گویا وہ تار برقی ہے جس پر باطنی لطیف جثہ یعنی لطیفے کا بلب چڑھا ہوا ہوتا ہے جسے عرفِ تصوف میں مقام ذکر کا لطیفہ بولتے ہیں۔ اور جہاں ذکر کی باطنی حرکت آواز، حرارت، طاقت، اور روشنی اپنے ہیڈ کوارٹر سے آ کر پھیلتی ہے۔ اسم اللہ کی نوری تحریر اصل ہے اور ذکر کا ظاہری شغل اور اس کے لوازمات فرع ہیں۔ اسم اللہ مرقوم باطنی مغز اور مکھن ہے اور شغل ذکر ظاہری گویا دودھ ہے۔ ظاہری ذکر منہ کے ذریعے دوا یا غذا کھانے کی طرح ہے اور تصور نقش اسم اللہ مرقوم اس دوا یا غذا کے جوہر کا انجکشن ہے۔ پس بجائے ذکر زبانی اور ظاہری شغل اگر ذاکر اس کے مغز اور اصل کو اختیار کرے اور وجود کے خاص خاص مقامات میں اسم اللہ کو تصور اور تفکر سے تحریر کرے تو گویا اس نے اصل اور مغز کو اختیار کر لیا یعنی مکھن کو حاصل کر لیا اور

دودھ حاصل کرنے اور اسے جمانے اور بلونے کے بکھیڑوں سے چھوٹ گیا۔ کیونکہ جس وقت اسم اللہ ذات تصور اور تفکر سے وجود کے کسی عضو اور مقام میں مرقوم ہو جاتا ہے اور متواتر مشق سے وہاں قائم ہو جاتا ہے تو وہ مقام اور عضو نور اسم اللہ ذات سے زندہ، روشن، اور وسیع ہو جاتا ہے۔ اور اس عضو کی باطنی حس زندہ ہو جاتی ہے۔ اور عالمِ غیب کی طرف اس عضو میں سے ذاکر کے لیے نوری روزن اور لطیف راستہ کھل جاتا ہے۔ اور ذاکر صاحب تصور کا عالمِ غیب اور عالمِ لطیف میں ایک باطنی نوری عضو پیدا ہو جاتا ہے جس طرح ماں کے پیٹ کے اندر ازلی روح کے لیے مادی اعضا اور حواس کے مقامات بتدریج تیار ہوتے رہتے ہیں۔ پس اسی طرح ذاکر صاحب تصور کا باطنی دنیا اور عالمِ غیب میں رفتہ رفتہ مشق تصور اسم اللہ ذات سے باطنی نوری لطیف جثہ تیار ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آنکھ میں تصور اور تفکر سے اسم اللہ مرقوم ہو تو چشم باطن کھل جاتی ہے۔ اور صاحب تصور عالم غیب کی باطنی اشیا کو دیکھنے لگ جاتا ہے اور مقام کشف اور مراقبہ و مشاہدہ کھل جاتا ہے۔ اور اگر مقام گوش یعنی کان میں اسم اللہ فکر کے نوری حروف سے مرقوم ہو جائے تو گوشِ باطن یعنی دل کے کان کھل جاتے ہیں۔ اور صاحب تصور باطنی اور غیبی آوازیں سننے لگ جاتا ہے۔ اور ذاکر صاحب تصور پر مقام الہام کھل جاتا ہے۔ اور اگر زبان پر اسم اللہ نوری حروف سے تحریر ہو تو ذاکر صاحب لفظ ہو جاتا ہے اور اس کی زبان سیف الرحمٰن ہو جاتی ہے۔ اور کُن کی سیاہی سے سیاہ ہو جاتی ہے۔ اس زبان سے وہ غیبی روحانی مخلوق سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اور جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے امر سے جلدی یا بدیر ہو جاتا ہے اور اگر ہاتھ کہ ہتھیلی پر اسم اللہ مرقوم ہو تو ملائکہ اور ارواح انبیا و اولیا اور ارواح اہل تکوین متصرفین غوث قطب اور اوتاد و ابدال سے مصافحہ کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اس نوری ہاتھ سے باطنی دنیا کے عالم امر میں تصرف اور کام کاج کرتا ہے وعلیٰ ہٰذ القیاس صاحب تصور کا ہر ایک عضو اور اندام جب تصور اسم اللہ ذات کی تحریر سے زندہ اور روشن ہو جاتا ہے تو اسی نوری عضو سے باطن میں کام کرتا ہے۔ آخر میں صاحب تصور کا تمام وجود مشق تصور اسم اللہ ذات سے منقش اور مرقوم ہو جاتا ہے تو ذاکر سالک کا ایک مکمل نوری وجود باطن میں زندہ اور قائم ہو جاتا ہے۔ اسی نوری روحانی وجود کا دیکھنا، سننا، بولنا، چلنا پھرنا، اور پکڑنا وغیرہ نور اسم اللہ ذات سے ہوتا ہے۔ اور بِئ

یُبۡصِرُ وَبِیۡ یَسۡمَعُ اور بِیۡ یَنۡطِقُ وَ بِیۡ یَمۡشِیۡ وَبِیۡ یَبۡطِشُ کا سچا مصداق ہو جاتا ہے ۔ ایسا سالک جس وقت عالمِ غیب کی طرف متوجہ ہو کر مراقبہ کرتا ہے اس کے ظاہری حواس بند ہو جاتے ہیں اور باطنی حواس کھل جاتے ہیں تو سالک اس نوری لطیف جثّے کے ساتھ عالمِ غیب میں جاتا ہے اور نوری لطیف دنیا میں داخل ہو کر لطیف جثّے کے ذریعے عالمِ لطیف اور عالمِ غیب میں چلتا پھرتا، دیکھتا، سنتا اور کلام کرتا، غرض ہر کام کرتا ہے اور اسی روحانی ابدی دنیا کا ایک فردِ کامل بن جاتا ہے۔ لیکن طالب کے وجود میں اسم اللہ کا نوری حروف منقوش اور مرقوم ہونا نہایت مشکل کام ہے۔ اس کام کے لیے شرائط، لوازمات اور قانون وقاعدے ہیں اور اس علم وفن کے استاد اور معلم ہیں۔ اور اس علم کے باطن میں روحانی مدرسے اور کالج ہیں۔ مگر تصور اور تفکر کے شغل کو جاری رکھنا چاہیے اور اس مبارک شغل سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایک تو اس شغل سے جلدی انسان کا وجود پاک ہو جاتا ہے اور اس کی باطنی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ اور جب اس کے دل کی زمین تیار اور قابلِ کاشت ہو جاتی ہے تو اس کے بونے والے کاشتکار خود بخود حاضر ہو جاتے ہیں۔ نالائق شورزمین سے ہر شخص پہلو تہی کرتا ہے۔ اے طالب سعادت مند! اگر تو حلال پرندہ بن جائے تو تیرے شکار کرنے والے صیاد بہت ہیں۔ اور اگر تو مردار خور چیل، کوّے یا گدھ کی طرح ہے تو کسی کو تجھ سے کیا کام۔ غرض تصور اور مشق اسم اللہ ذات سے انسان کی باطنی استعداد بہت جلد ترقی کرتی ہے اور گاہے گاہے جب قلوب اور ارواح کی فضا میں نسیم الانس یعنی اللہ تعالیٰ کے لطف کی ہوا چلتی ہے تو اس وقت خود بخود دل کے آئینے سے غفلت اور ظلمت کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں عالمِ امر یعنی لوحِ محفوظ کے بعض آئندہ واقعات دل پر قبل از وقوع منعکس ہو جاتے ہیں۔ ایسے مقام میں انسان سچے خواب دیکھتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: اِنَّ لِرَبِّکُمۡ فِیۡ اَیَّامِ دَهۡرِکُمۡ نَفَحَاتُ الۡاُنۡسِ اِلَّا فَتَعَرَّضُوۡا لَهَا۔ ترجمہ: ''زمانے میں گاہے گاہے اللہ تعالیٰ کے لطف کی ہوا چلتی ہے پس چاہیے۔ کہ تم اس کے ساتھ موافقت پیدا کرو۔'' اگر تمہارے دل اس ہوا کے چلنے کے وقت ذکر اللہ سے آگاہ اور بیدار ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت تمہیں ڈھانپ لے گی۔ پس انسان کو چاہیے کہ ایسے مواقع کو غنیمت جانے اور ذکر اللہ اور تصور اسم اللہ ذات کی مشق سے غافل نہ رہے کیونکہ فضل مولا ناگاہ رسد و

بے گاہ رسد و بردل آگاہ رسد۔ انسان کو چاہیے کہ اس کے لیے بیدار اور تیار رہے اور دروازے پر سائل کی طرح کھڑا پکارتا رہے۔ غافل اور دور آدمی کا کوئی حق نہیں۔ جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اس کے لیے کھلتا ہے۔ بارش کے وقت سیدھے برتن پانی سے بھر جاتے ہیں اوندھے برتن خالی اور محروم رہتے ہیں۔

چو حسن تربیت گردد قرین با پاکی گوہر ز رشحہ آب خیز دُر ز مشت خاک زاید زر
سرشتِ خاک کاں یا آبِ نیساں گرچہ پاک آمد ولے از فیضِ خورشید است کاں زر گردد ایں گوہر
بے زحمت برد دہقاں کہ در زیرِ زمیں تخمے بریزد بیخ یا بد شاخ و گیرد برگ و آرد بر[1]
(خیام)

جس وقت تصور اسم اللہ ذات سے سالک کا مکمل وجود باطن میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور مرشدِ کامل کی توجہ سے قائم ہو جاتا ہے تو پہلے وہ ایک معنوی لطیف نوری بچے کی مانند ہوتا ہے اور جو کچھ باطنی معاملات دیکھتا ہے انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس نوری طفل نے ابھی عقل و شعور حاصل نہیں کیا ہوتا۔ اس کے بعد جب باطنی پرورش پا کر یہ نوری بچہ ترقی کرتا ہے تو وہ روحانیوں کے معاملات جانتا اور سنتا ہے اور تھوڑا تھوڑا انہیں سمجھتا ہے۔ اسی طرح بتدریج ترقی کرتے کرتے ان روحانی مجالس اور باطنی محافل کی باتیں سمجھتا ہے بعدہٗ اہلِ محافل سے بات چیت کرتا اور وہاں کا ایک رکن اور ممبر بن کر ان میں رائے دہندگی کا حق حاصل کرتا ہے۔ آخر میں بعض مدارس باطنی کا معلم و استاد یا کسی روحانی محکمے کا ملازم اور کسی عہدے پر مامور ہو جاتا ہے۔

اس طفلِ معنوی کا نوری جثہ نوری حروف کے اسمائے الٰہی سے مرقوم ہوتا ہے۔ اور نوری مرقوم اسماء کا ایک مکمل کلمہ ہوتا ہے جیسا کہ ایمان کو اللہ نے ایک مکتوب سے تعبیر کیا ہے: اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط (المجادلۃ ۵۸: ۲۲)۔ یعنی ”اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور انہیں اپنی پوری روح سے تائید فرمائی

---

[1] جب پاکیزگی اصل کے ساتھ حسنِ تربیت شامل ہو جائے تو پانی کی بوند سے موتی پیدا ہوگا۔ اور مشت خاک زر بن جاتی ہے۔ کان کی مٹی اور ابرِ بہاری کے قطروں کی سرشت اگرچہ پاک ہے لیکن یہ آفتاب ہی کا فیضان ہے کہ وہ سونا بنتی ہے اور یہ موتی بن جاتے ہیں۔ دہقان کس قدر زحمت اٹھاتا ہے کہ وہ زمین میں تخم ریزی کرتا ہے پھر کہیں اس تخم کی شاخ نکلتی ہے اور برگ و بار لاتی ہے۔

ہے"۔اور عیسیٰ علیہ السلام کو ایک کلمہ کہا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ ج اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ (النسآء ۴: ۱۷۱) ۔ترجمہ: "بے شک مسیح یعنی عیسیٰ بیٹا مریم کا رسول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ ہے جو اس نے ڈالا ہے مریم کی طرف اور اس سے ایک روح ہے۔" اور حضرت ذکریاؑ کو اللہ تعالیٰ فرزند کی بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ اَنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِکَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰہِ وَسَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ٥ (اٰلِ عمرٰن ۳: ۳۹) ۔ترجمہ: "پھر آواز دی خدا کے فرشتے نے ذکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ خوشخبری دیتا ہے تجھے یحییٰ نام بیٹے کی۔ جو تصدیق کرنے والا ہوگا ساتھ کلمے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ (یعنی عیسیٰؑ) کا تصدیق اور تائید کنندہ ہوگا اور سردار اور گناہوں سے بچا ہوا نیک نبیوں میں سے ہوگا۔" اور ایک اور جگہ بھی اللہ تعالیٰ کا یہی ارشاد ہے: اِذْقَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَةٍ مِّنْهُ ق صلے اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ (اٰلِ عمرٰن ۳: ۴۵) ۔ ترجمہ: اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ تعالیٰ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے اپنے اس کلمے کی جس کا نام مسیح بن مریم ہے۔" سو ایمان کو اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے کلمے سے تعبیر کرنے کی یہی وجہ ہے کہ باطن میں روحانی عالم امر کی مخلوق کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے نوری اسما سے مرکب اور مرقوم ہیں۔ اور اسی طرح تمام کائنات باطنی جسے عالمِ امر اور عالمِ غیب بھی کہتے ہیں اس کا وجود نوری کلمات کی شکل میں قائم اور نمودار ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اس عالمِ امر کے بارے میں فرماتے ہیں: قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ٥ (الکھف ۱۸: ۱۰۹) ۔ ترجمہ: "کہہ دے اے محمد صلعم! کہ اگر سمندر اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھنے کے لیے سیاہی بن جائے تو سمندر لکھتے لکھتے سوکھ جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔"

اللہ تعالیٰ نے جب عالمِ وحدت سے عالمِ کثرت کی طرف ظہور فرمایا تو ذات سے صفات کی طرف تجلی فرمائی اور صفات سے اسما کا ظہور ہوا اور اسما سے افعال کا صدور ہوا اور افعال سے اعیان ظاہر ہوئے۔ سو اللہ تعالیٰ کی صفات کے بعد اسما کا جس عالم میں ظہور ہوا وہ عالم امر کہلاتا ہے۔ اور اس عالم کی اشیا کی صورتیں اسمائے الٰہی سے مرکب ہیں جو نوری

حروف سے مرکب ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو لفظ کُن یعنی ہو جا کہہ کر پیدا کیا اور کُنْ امر کا صیغہ ہے۔ اس واسطے اس کو عالمِ امر کہتے ہیں۔ اور کُنْ چونکہ ایک کلمہ ہے اس واسطے یہ کائنات کلمات کی شکل میں قائم ہے۔ اور جس طرح کلمات جمع ہو کر عبارت بناتے ہیں اور عبارت تر سیاہی سے خشک کاغذ پر تحریر اور مرقوم کی جاتی ہے اس عالم امر کا یہ تر کلماتی جہان عالم خلق کے خشک کاغذ پر قلمِ قدرت سے اللہ تعالیٰ نے تحریر کر دیا ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں عالمِ امر کو بحر یعنی تری سے اور عالمِ خلق کو خشکی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور کہیں عالمِ امر کے کلماتی جہان کو رطب یعنی تر چیز اور عالمِ خلق کو یابس یعنی خشک چیز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور عالم امر اور عالم خلق کو ملا کر ایک کتاب مبین کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ○ (الانعام ۶ : ۵۹) ۔ نہیں کوئی تر یا خشک چیز مگر وہ کتابِ مبین میں موجود ہے اور ہر ایک چیز کو ایک انسان کامل امام مبین کے وجود میں جمع کر کے شمار کر دینے کا بھی یہی مطلب ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ○ (یٰسٓ ۳۶ : ۱۲) یہاں امام مبین اور کتابِ مبین ایک ہی شے مرقوم ثابت ہو رہے ہیں۔ اور نیک روحوں کے مقام علیین کو بھی اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کتاب مرقوم فرمایا ہے: وَمَآ اَدْرٰکَ مَا عِلِّیُّوْنَ ○ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ○ یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ○ (المطففین ۸۳ : ۱۹ ۔ ۲۱) ۔ ترجمہ: ”اور اے میرے نبی ﷺ! تو جانتا ہے کہ مقام علیون کیا ہے ایک کتاب مرقوم ہے جسے مقرب لوگ دیکھیں گے اور پڑھیں گے۔“ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ عالمِ امر کی چیز کو قرآنِ کریم میں رطب یعنی تر چیز سے اور تمام عالمِ امر کو سمندر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس واسطے جس وقت اللہ تعالیٰ نے ابھی عالمِ امر سے عالمِ خلق کو پیدا نہیں کیا تھا اس وقت کا ذکر قرآنِ کریم میں یوں وارد ہے: وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ (ھود ۱۱ : ۷) ۔ ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز کے اندر پیدا کیا اور اس وقت اس کا تخت پانی پر تھا۔“ یہاں بھی پانی سے عالمِ امر کا عالمِ لطیف مراد ہے۔ اور چونکہ عالمِ کثیف یا عالمِ خلق کی ہر شے عالمِ امر کے بحر اور اس کے لطیف مادہ سے زندہ ہے اس واسطے اللہ تعالیٰ نے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (الانبیآء ۲۱ : ۳۰) فرمادیا۔ یعنی ہم نے

پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔ حالانکہ خالی پانی سے ہر شے زندہ نہیں۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں دیگر عناصر بھی ہیں۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ یہ ہماری زمین بیل کی پشت پر ہے اور بیل مچھلی کی پشت پر کھڑا ہے اور مچھلی پانی کے سمندر پر تیر رہی ہے۔ عارف صاحب بصیرت جب اپنے عنصری وجود کی طرف دیکھتا ہے تو اس خاکی وجود کو نفسِ بہیمی اٹھائے نظر آتا ہے جس کی باطنی صورت بیل کی ہے۔ اور نفسِ بہیمی کے بیل کو روح کی مچھلی اٹھائے ہوئے ہے جو عالمِ امر کے بحر پر تیرتی ہے اور جز کا معاملہ کل پر حاوی ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام زمین کا باطنی نفسِ بہیمی ایک بیل کی صورت رکھتا ہے جسے دابتہ الارض کہتے ہیں جو زمین کے خاکی وجود کے فنا ہونے کے بعد روزِ قیامت کو ظاہر ہو جائے گا۔ اور اس نفسِ کل یعنی دابتہ الارض کا قیام روح کی مچھلی پر ہے جو عالمِ امر کے بحر پر تیر رہی ہے۔ سو عالمِ امر اور عالمِ خلق کتابِ کائنات کے اس طرح دو حصے ہوئے کہ عالمِ امر گویا کُــــنْ کی سیاہی سے اس کی تحریر یا عبارت مرقوم ہے۔ اور عالمِ خلق اس کے لیے بمنزلہ کاغذ کے ہے۔ یا یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے امرِ کُنْ کے دو حرف ہیں۔ کاف سے کتابِ کائنات کے کُنْتُ کَنْزًا کا کاغذ یعنی عالمِ خلق تیار ہوا۔ اور نؔ جس کی شکل دوات کی ہے جو امرِ کُنْ کی سیاہی سے لبریز ہے۔ اور قلمِ قدرت سے منشیِ نشاۃ الاولیٰ اس سے کتابِ عالمِ امر تحریر کر رہا ہے۔ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ○ (القلم ۶۸ : ۱)۔ عجیب بات یہ ہے کہ کاغذ، قلم اور سیاہی سب کی اصل ایک ہے۔ یعنی درختوں کے ریشوں سے کاغذ تیار ہوتا ہے اور اکثر قلمیں بھی درختوں کی لکڑیاں ہوا کرتی ہیں اور سیاہی بھی درختوں کے کوئلے اور گوند وغیرہ نباتاتی مادے کی پیداوار ہے۔ سو جس طرح ان سب کی اصل ایک ہے اسی طرح کتابِ کائنات کی نشاۃ الاولیٰ کی تخلیق بھی ایک مادے سے ہوئی اور وہ مادہ ہیولیٰ یا ایتھر یا ہوا کی طرح ایک بادل اور غبار کی صورت میں تھا۔ سو پہلے دنیا کو ایک گرد و غبار کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے نمودار کیا اور اس پر اپنی صفت خالق باری اور مصور کی تجلی فرمائی۔ اور وہ گرد و غبار عالمِ امر اور عالمِ خلق کی صورت میں یا کتابِ کائنات کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے: کَانَتِ الدُّنْیَا فِیْ عَمَآءٍ فَتَرَشَّحَ عَلَیْہِ مِنْ نُوْرِہٖ فَظَھَرَتْ۔ یعنی دنیا ایک غبار یا تاریک بادل کی شکل میں تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر تجلی فرمائی۔ تب وہ ظاہر ہو گئی۔ اور ان ہر دو عالمِ امر یعنی دنیائے

کلمات اللہ اور عالمِ خلق کا ظہور ایک ہی ہوا کی مانند لطیف عنصر سے ہوا۔ چونکہ ہماری یہ کثیف مادی کائنات عالمِ غیب یا عالمِ لطیف کے نشاۃ الاولیٰ کا عکس اور ظل ہے۔ اسی طرح ہماری مادی دنیا کے اندر بھی عالمِ امر اور عالمِ خلق کے ہر دو عوالم اسکے پرتو سے قائم ہو گئے۔ اور ہماری دنیا میں عالمِ امر کی ایک ذہنی اور عالمِ خلق کی خارجی دنیا ایتھر اور ہوا سے نمودار ہو گئی۔ دنیائے سائنس کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ دنیا کی تمام خارجی ٹھوس چیزیں ان عناصر کے مختلف مرکبات اور تنوعات سے بن گئے۔ دوسری طرف ایتھر یا ہوا کے بولتے وقت ہمارے منہ سے مخارج کی مختلف حرکات کی وجہ سے مختلف عناصر یعنی مفرد حروف بن گئے اور ان عناصر حروف کے مرکبات اور جوڑ توڑ سے الفاظ بن کر تمام دنیا کی مختلف زبانیں بن گئیں۔ غرض ہماری مادی دنیا میں ایک عالمِ خلق کی خارجی ٹھوس مادی دنیا قائم ہو گئی اور دوسری عالمِ امر کی ذہنی دنیا نمودار ہو گئی۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ (الروم ۳۰: ۲۲)۔ ترجمہ: "اور اس کی قدرت اور حکمت کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین (خارجی دنیا) کی مختلف پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ ان میں عالموں کے لیے نشانیاں ہیں۔" اور ہر دو کی اصل ایک مادے ایتھر یا ایتھر یا ہوا سے ظہور پذیر ہوئی۔ اب یہ حروف اور الفاظ کی مرکب زبانیں ہمارے ذہنوں میں خارجی ٹھوس اشیا کے نام، ان کے خواص اور حقائق پہچاننے کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ ان زبانوں کے بغیر خارجی دنیا جہل اور ظلمت کے تاریک گرد و غبار کے ماحول میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر زبانوں کے ذریعے ذہنوں میں اشیا کے حقائق نہ پہنچیں تو دنیا کا وجود اور عدم برابر ہیں۔ اب جس طرح خارج میں ایتھر یا ہوا کی مختلف حرکات اور تنوعات سے عناصر تیار ہوئے اور عناصر کے آپس میں میل جول سے دنیا کی مختلف چیزیں وجود میں آ گئیں اور خارج میں ایک مادی دنیا تیار ہو گئی جن میں درخت، پودے، سبزیاں اور پھل پھول، باغ باغیچے اور دیگر کروڑوں اشیاء تیار ہو گئیں۔ اسی طرح ایتھر یا ہوا کی مختلف حرکات سے مختلف حروف کے عناصر ظاہر ہوئے اور ان حروف کے عناصر کے جوڑ توڑ اور ترتیب سے الفاظ اور کلمات بن کر دنیا کی مختلف زبانیں بن گئیں۔ اور زبانوں کے ذریعے دنیا کی مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ منجملہ ان کے آسمانی کتابیں بھی ہیں۔

غرض اس خارجی کثیف دنیا کے مقابلے میں ان کے حقائق وصفات ومعانی کی ایک عالم امر کی مثل ذہنی دنیا قائم ہو گئی۔ اور علوم وفنون کی مختلف کتابیں بن گئیں یوں ذہنی چمن، گلستان بوستان اور کروڑوں کلمات، باتیں اور ان کی کتابیں تیار ہو گئیں۔ ظاہر میں انسان مادی عناصر کا مرکب، گوشت اور ہڈیوں کا خاکی ڈھانچہ ہے اور اس کے اردگرد مادے کی خارجی دنیا آباد ہے اور وقتاً فوقتاً حسب ضرورت اس کا عنصری وجود ان مادی اشیا سے متمتع ہوتا ہے۔ لیکن انسان کا باطنی وجود یعنی روح جو عالم امر کی لطیف مخلوق ہے ذہنی اور امری دنیا کی اشیا سے متمتع اور فیض یاب ہوتی ہے اور ذہنی خوراک حاصل کرتی ہے۔ غرض تمام انبیا مرسلین اور جملہ اولیا کاملین کو باطن میں اسمائے الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے نوری حروف کے کلمات طیبات سے مرقوم لطیف جثے عطا کیے جاتے ہیں اور یہ لطیف جثہ جس وقت روح اور جان کی طرح سالک کے قالب خاکی اور جسد عنصری میں داخل ہو جاتا ہے تو سالک کی روح اصلی کو اپنے رنگ سے رنگ دیتا ہے۔ اور جملہ روحانی علوم وفنون اور باطنی فیوضات و برکات اور روحانی طاقتیں مثلاً کشف وکرامات، الہامات، واردات، تجلیات، طیر وسیر زمین وآسمان، مۂ فلک عرش وکرسی اور طبقات وغیرہ سب کچھ خود بخود اس نوری وجود کے طفیل اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس نوری وجود کو اللہ تعالیٰ نے کلمۂ طیبہ کہا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسمائے الٰہی سے مرقوم نوری لطیف جثہ کیونکر اور کس طرح انسان کے وجود میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے داخل ہونے کے کون سے سامان اور شرائط ہیں۔ اور وہ کون سے ذرائع ہیں جن کے استعمال کرنے سے نوری لطیف جثے حاصل ہو جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ اس نوری لطیف جثے کے حصول اور اختیار کرنے کے بہت راستے ہیں۔ مثلاً جملہ نیک اعمال، زہد، ترک، توکل، تواضع، صبر، شکر، تسلیم، رضا، سخاوت، مروّت، رحم اور شفقت وغیرہ اور تمام عبادات وطاعات، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تلاوت وغیرہ ان سب کی درست اور صحیح ادائیگی سے انسانی وجود میں ان لطیف نوری جثوں کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے اور اسم اللہ ذات کے شجرِ طیبہ کی کاشت کے لیے زمین تیار ہو جاتی ہے۔ اور ان نوری کلمات کی تحریر کے لیے قرطاسِ قلب اور لوحِ روح کا صفحہ صاف ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد زمین میں ذکر اسم اللہ اور اسم اللہ کی تخم ریزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ بغیر تخم کے زمین بیکار

ہے۔ جس وقت زمین لائق زراعت اور قابلِ کاشت ہو جائے تو اس وقت اسے پانی سے سینچنے اور آبپاشی کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ مرشدِ کامل کی صحبت اور توجہ ہے۔ اس کے بغیر تخم اسم اللہ ذات ہرگز سرسبز نہیں ہوتا خواہ زمین کتنی ہی قابل اور لائق کیوں نہ ہو اور سالہا سال تک اس میں تخم ریزی ہوتی رہے۔ اسے سرسبز اور شاداب ہونے کے لیے مرشدِ کامل کی توجہ اور صحبت کی آبیاری اشد ضروری ہے۔ خواہ کتنے ہی نیک اعمال اور عبادات سے طالب کی لوحِ قلب اور اس کے دل کا کاغذ تحریر کے لیے تیار ہو جائے اور ذکر اذکار کے قلم اور دوات بھی مہیا ہو جائیں تب بھی اس پر تحریر کے لیے کاتب کامل اور منشی مرشد سے چارہ نہیں ہے اور اگر دہقان اور کاشتکار کامل ہو تو وہ کلر والی شور اور ناقص زمین میں کھاد ڈال کر اسے قابلِ کاشت بنا لیتا ہے اور اس میں تخم اللہ ذات ڈال کر اسے اپنی توجہ کے پانی سے سیراب کر کے ویران اور غیر آباد زمین کو باغ جنت بنا دیتا ہے۔ اور کامل کاتب کاغذ کو صاف اور مہرہ کر کے اس پر اپنی قلم اور دوات سے کلمات اللہ بہت آسانی سے تحریر کر لیتا ہے۔ لیکن ایسے کامل مرشد کا وجود دنیا میں عنقا مثال ہے۔ مرشدِ کامل کا وجود ایک بے بہا نعمت ہے۔ اس کا وجود گویا جملہ اسمائے الٰہی اور آیاتِ بینات سے دائمی مرقوم اور منقوش پریس کا پتھر یا مکمل بلاک ہے کہ جونہی اس سے ورقِ قلب طالب چسپاں ہوا اسے ایک دم میں کلمات اللہ سے مرقوم کر کے خدا رسیدہ بنا دیتا ہے۔

کتنے خوش قسمت اور سعادت مند ہیں وہ لوگ جو کلمۂ طیب کا نوری پروانہ بن کر اللہ تعالیٰ کی مقدس بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یا شجرِ طوبیٰ بن کر بہشتِ قرب و وصال میں ابدالآباد تک جھومتے اور لہلہاتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِىٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ (ابرٰھیم ۱۴ : ۲۴ - ۲۵) ۔

آناں[1] کہ زیرِ سایۂ مہرت مقامِ شانست — در دل چرا تخیلِ بالِ ہما کنند
شوریدگانِ حسنِ جلال و جمالِ یار — تسکینِ دل بملکِ دو عالم کجا کنند
دیوانگانِ بادیہ پیمائے عشقِ او — ہفت آسماں بچشم زدن زیرِ پا کنند

(حافظ)

[1] وہ لوگ کہ جن کا مقام تیرے آفتاب فیض کے سائے تلے ہے وہ بالِ ہما کا خیال (باقی اگلے صفحہ پر)

بعض نادان لوگ اس معاملے کونہایت آسان اور سرسری خیال کرتے ہیں اور بہشتِ جاودانی اور قربِ ربانی کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ انسان صرف مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے یا محض آباؤ اجداد سے بطور ورثہ اسلام میں داخل ہونے سے اصلی مسلمان اور حقیقی اہلِ ایمان ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نیز تقلیدی طور پر اسلام کے ظاہری ارکان پر اندھوں کی طرح کاربند ہونا اور اسی کوسب کچھ سمجھنا یا صرف اقرار زبانی اور معمولی ورزشِ جسمانی اور خفیف مالی قربانی کو بہشتِ جاودانی اور قربِ ربانی کی کافی قیمت سمجھنا نہایت کوتاہ اندیشی اور نادانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ سودا اتنا سستا نہیں۔

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
(امیر خسرو)

ترجمہ:۔ (اے اللہ) تو نے دونوں جہان اپنی قیمت مقرر کیے ہیں۔ ابھی اپنی قیمت اور بڑھا کیونکہ اب بھی تو بہت سستا ہے۔

یاد رہے کہ صرف قیل وقال یا اندھی تقلید اور ظاہری اشغال سے نہ اللہ تعالیٰ کی پہچان ہو سکتی ہے اور نہ ہی ظاہری کتابی علم سے نبی کی نبوت اور رسالت اور اسکی مخصوص روحانی قوت یا معجزات کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اور نہ ہی نبی کی وحی کی حقیقت اور نہ اس کی روحانی پرواز اور معراج وغیرہ کی کنہ معلوم ہوسکتی ہے۔ اسی واسطے تو ظاہری علما بچارے نبی کے علمِ غیب، دنیا میں دیدارِ الٰہی، معراج کی حقیقت، اور معجزات وغیرہ اور دیگر مسائل کے بارے میں تمام عمر جھگڑتے رہتے ہیں۔ امت پیرو کو کہتے ہیں اور پیرو اپنے پیشوا کے قدم پر چلنے والے کا نام ہے۔ لہٰذا جب تک کوئی شخص پیغمبرِ اسلام کے قدم بقدم چل کر اس کے اخلاق مخصوص نبوت سے کسی قدر متخلق نہ ہولے اور اس کے ظاہری و باطنی اوصاف و کمالاتِ غیر معمولی سے متصف نہ ہو جائے تب تک حقیقی طور پر مسلمان یا اصلی معنوں میں مومن باایمان اور خالص مخلص اہل یقین وصاحب عرفان نہیں ہوسکتا۔

---

اپنے دل میں کیوں لائیں۔ محبوب کے جلال و جمال کے حسن کے متوالے دونوں جہان کی سلطنت لے کر بھی سکونِ قلب کہاں پاسکتے ہیں۔ اس کی محبت میں صحرانوردی کرنے والے دیوانے چشم زدن میں ہفت افلاک کو طے کرلیتے ہیں۔

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

جب تک کوئی شخص صاحب الہام نہ ہو جائے یا کم از کم سچے خواب نہ دیکھ لے جنہیں نبوت کا ایک معمولی جز قرار دیا گیا ہے خالی قیل وقال اور کتابوں میں وحی کے حالات اور واقعات پڑھنے سے نبی کی وحی کی حقیقت ہرگز معلوم نہیں کر سکتا۔ جب تک انسان خود صاحب کرامت اور خوارقِ عادت نہ ہو محض عقلی استدلال اور زبانی براہانات سے پیغمبروں کے معجزات اور آیاتِ بینات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اور جب تک کوئی طالب باطنی طیرسیر اور روحانی پرواز کا مرتبہ حاصل نہ کر لے صرف روایات و حکایات سے معراج کی حقیقت اور کیفیت معلوم نہیں کر سکتا اور نہ ہی معراج کے جسمانی یا روحانی جھگڑے اور خواب و بیداری والے اشکال حل کر سکتا ہے۔ بمشتِ نمونہ خروار ہوتا ہے اور درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔

چراغ مُردہ کُجا زندہ آفتاب کُجا[1]
ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بہ کُجا

سچ پوچھو تو اصلی امتی ہونا اور حقیقی پیرو بننا نہایت مشکل کام ہے۔ خاص امتی تو وہ شخص ہے جو نبی ﷺ کے قدم بقدم چل کر ان کی باطنی منزل اور روحانی مقام تک پہنچ جائے اور نبی علیہ السلام اسے زبانِ حق ترجمان سے امتی کہہ دیں۔ صرف نام کا امتی کسی کام کا نہیں۔

ع شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے

بعض حاسد کور چشم جب اس مرتبے کو حاصل نہیں کر سکتے تو محض ان باطنی مراتب اور روحانی درجات کے انکار سے اپنی تسلی کرتے رہتے ہیں یا ان کی تاویلیں کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اسلام کے ظاہری چھلکے اور کتابی وکسبی علم کے گھمنڈ پر مغرور رہتے ہیں۔

خونابۂ دِل خور کہ شرابے بہ ازیں نیست      دنداں بہ جگر زن کہ کبابے بہ ازیں نیست
در کنز و قدوری نتواں یافت خدا را      بر صفحۂ دِل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

(سرمد)

ترجمہ: دل کا خونابہ یعنی خون پی کیونکہ اس سے بہتر شراب اور کوئی نہیں۔ اپنے جگر کو

[1] کہاں بجھا ہوا چراغ اور کہاں چمکتا دمکتا آفتاب۔ دیکھ کہ (دونوں) کے راستے کا فرق کہاں سے کہاں تک ہے۔

چبا کیوں کہ اس سے بہتر کباب اور کوئی نہیں۔ کنز اور قدوری کی کتابوں میں تو خدا کو نہیں پا سکتا۔ دل کے صفحے کو دیکھ کیونکہ اس سے بہتر کتاب اور کوئی نہیں ہے۔

دنیا سے مذہبی ذہنیت مفقود ہو چکی ہے اور حق و باطل کی تمیز نہیں رہی۔ اس لیے بعض لوگ چند کتابیں لکھ کر اور جھوٹے دعوے باندھ کر نبی بن بیٹھے ہیں اور اندھے احمق لوگ انہیں ماننے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ سبحان اللہ! پیغمبری کس قدر آسان اور ارزاں چیز تھی کہ چند معمولی کتابیں لکھنے سے اچھی خاصی دکان کھل گئی اور ہزاروں پاگل بے قوف اس کی فرضی متاع کے نادیدہ خریدار بن گئے۔

ہر چند زمانہ مجمع جہال است — در جہل نہ حالِ شاں بیک منوال است

کو دن ہمہ لیک از یکے تا دِگرے — فرق خرِ عیسیٰ و خرِ دجال است

(خیام)

ترجمہ: زمانہ بہر حال جاہلوں کا ایک مجمع ہے۔ لیکن جہالت میں ان کی حالت ایک جیسی نہیں ہے۔ سب ہانکے مارے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے میں عیسیٰ اور دجال کے گدھے جتنا فرق ہے۔

ہمیں تو دنیا میں اصل اور حقیقی معنوں میں کوئی اُمتی نہیں ملتا۔ اُمتی بننے کے لیے اللہ تعالیٰ شاہد حال ہے کئی سال جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرنا پڑا۔ خونِ جگر پینا پڑا اور اپنا خون پسینہ ایک کرنا پڑا۔ طریقت کے اس پر خار کٹھن راستے میں کیا کیا روح فرسا اور جاں گداز سفر اختیار کرنے پڑے اگر انہیں بیان کیا جائے تو ان کے سننے سے دل لرز جائیں اور کلیجے کانپ اٹھیں۔ اور طرفہ یہ کہ اس راستے میں ہر دم دولتِ دوام اور ہر قدم پر نئی منزل و مقام۔ لیکن پھر بھی اپنے منہ سے یہ دعویٰ زیب نہیں دیتا۔ افسوس کتنا چھوٹا منہ اور بات کس قدر بڑی ہے کہ محض کتابوں کے مطالعہ سے گھر بیٹھے ولی چھوڑ نبی بن بیٹھے۔ لیکن آج آزادی کا زمانہ ہے۔ پوچھنے والا کون ہے۔ خواہ کوئی خدائی کا دعویٰ بھی کر بیٹھے۔ جب تک دنیا میں بے وقوفوں کی کثرت ہے عیاروں اور مکاروں کی پانچوں گھی میں ہیں۔ جس وقت لوگ شیشوں

---

ل ویسے تو سب ایک طرح جاہل ہیں۔ لیکن کوئی عیسٰیؑ کے گدھے کی طرح ہے۔ اور کوئی دجال کے گدھے کی طرح ہے۔

کے ناکارہ ٹکڑوں کو ہیروں کی قیمت پر خریدنے لگ جائیں تو زمانہ شناس عیار ایسے زرّیں موقع کو غنیمت جان کر کیوں نہ دکان کھول کر جوہری بن جائیں اور اصلی جوہری اپنی دکانیں بند کرلیں۔

اِمروز قدرِ[1] گوہر و خارا برابر است　　　سرگینِ گاوٴ عنبرِ سارا برابر است

کس قدر ظلم اور اندھیر ہے کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں خود فاقوں مر رہے ہیں اور باہر سے ہزاروں لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے اور گھر بلایا جا رہا ہے کہ آیئے سب کچھ تیار ہے۔

آں قوم کہ سجادہ[2] پرستند خراند　　　زیرا کہ بزیرِ خرقۂ سالوس دراند

دیں از ہمہ طرفہ ترکہ در دیدۂ زُہد　　　اِسلام فروشند و ز کافر بتر اند

(خیامؒ)

سو اس زمانے میں پہلے تو مرشدِ کامل کا ملنا بڑا مشکل ہے اور اگر ملے تو اس کی پہچان اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ اصلی مردانِ خُدا حورِوش نازنین اور پری رُو معشوق کی طرح اپنے آپ کو حتی الوسع پردے میں چھپائے رکھتے ہیں۔ اور زنِ فاحشہ بازاری عورتوں کی طرح سرِ بازار عریانیت اور عصمت فروشی کی دکان نہیں کھول بیٹھتے ہیں۔

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

(حافظؒ)

ترجمہ: (اس زمانے میں) پری یعنی نیک لوگ پوشیدہ ہیں اور شیاطین ناز و نخرے کر رہے ہیں۔ حیرت سے عقل جل اٹھی ہے کہ یہ کیسی عجیب و غریب بات ہے۔

اس واسطے طالبِ مولیٰ کو چاہیے کہ ہر وقت ذکر اللہ اور خاص کر تصور اسم اللہ ذات کے بہترین شغل کو رات دن جاری رکھے۔ کیوں کہ آج کل دنیا میں صدق المقال اور اکل الحلال نہیں رہا۔ لوگوں میں سلف صالحین کی طرح نیک اعمال اور سخت محنتوں اور مجاہدوں کی

---

[1] آج موتی اور پتھر دونوں کی قدر و منزلت یکساں ہے۔ گائے کا گوبر اور عنبر سارا دونوں کو برابر تصور کیا جاتا ہے۔
[2] سجادہ فروشی کرنے والی قوم احمق ہے۔ اس لیے کہ وہ مکر و ریا کی عبا اوڑھے ہوئے ہے۔ اور سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ وہ نگاہِ زہد میں اسلام کی نمائش کرتے ہیں اور کافروں سے بدتر ہیں۔

توفیق اور ہمت نہیں رہی۔ پابندئ صوم وصلوٰۃ اور ادائیگئ حج وزکوٰۃ میں بھی بہت کمی اور کوتاہی آ گئی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی محض ایک نمائشی اور رسمی مظاہرے کی صورت میں ادا ہو رہا ہے۔ اس لیے اس قحط الاعمال واحوال کے زمانے میں سب سے بہترین شغل تصور اسم اللہ ذات ہے۔ اس سے طالب بہت جلدی کامیاب ہو جاتا ہے۔ طالب کو چاہیے کہ وجود کے ہر عضو میں چراغ اسم اللہ ذات روشن کرے اور تمام وجود اس کے نور سے منور کر دے۔

صاحب تصور اسم اللہ ذات محبوبِ بے محنت اور معشوق بے مشقت ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو ہمیشہ اسم اللہ ذات میں محو اور مشغول رکھتا ہے اس کو رازِ بے ریاضت اور مشاہدہ بے مجاہدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جملہ انبیا، تمام اولیا، جمیع ائمۂ دین، اصحاب، علما، صلحا، فقرا، درویش، غوث، قطب، اوتاد، ابدال، اخیار، نجبا، نقبا جس قدر باطن میں صاحب مراتب ہو گزرے ہیں، سب اسم اللہ ذات کے ذریعے اور اسی نامِ پاک کی برکت اور وسیلے سے اعلیٰ درجات کو پہنچے ہیں۔ تمام انبیا علیہم السلام اور اولیا کرام کو معجزات اور کشف وکرامات اسم اللہ ذات کی برکت اور طاقت کے طفیل حاصل ہوئے ہیں۔ یہی تصور اسم اللہ ذات وہ نورِ مبین تھا جسے جبرئیلؑ امین نے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ (العلق ۹۶ : ۱) کہہ کر نوری تخم کی شکل میں حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں غارِ حرا کے اندر ڈالا جس نے بعد میں شجرِ قرآن کی شکل میں آپ ﷺ کی زبانِ حق ترجمان سے سر نکالا۔ یہی وہ روحانی رفرف اور باطنی براق تھا جس نے آنحضرتؐ کو معراج کی رات ساتوں آسمانوں اور عرش وکرسی کی سیر کرائی اور مقامِ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ (النجم ۵۳ : ۹) کا اعلیٰ مرتبہ دلایا اور اللہ تعالیٰ کے دیدارِ پر انوار اور لقاء کی آیاتِ کبریٰ سے مشرف فرمایا۔ یہی موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور یدِ بیضا تھا جس کے کرشموں اور معجزات کی برکت کی طاقت سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو فرعونِ بے عون اور ہامانِ بے سامان کے ظلم سے چھڑایا۔ یہی وہ نقشِ خاتمِ سلیمان علیہ السلام تھا۔ اور یہی وہ مبارک نامہ اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (النمل ۲۷ : ۳۰) کی تحریر تھی جس کی زنجیرِ تسخیر نے ملکہ بلقیس اور تمام جنات وانسان اور بہائم وطیور کو باطن میں جکڑ لیا تھا۔ یہی وہ اسمِ پاک تھا جس نے نوح علیہ السلام کی کشتی کو

بِسۡمِ اللّٰہِ مَجۡرٖىہَا وَ مُرۡسٰىہَا ؕ (ھود ۱۱ : ۴۱) کے باطنی چپّو سے بحرِ ذخار میں چلایا اور طوفان سے بچایا۔ غرض تمام انبیا مُرسلین اور جملہ اولیا کاملین کو نور کی باطنی تجلی اسم اللہ ذات کے بجلی گھر اور اسی پاور ہاؤس سے پہنچتی رہی ہے اور اب بھی تمام پاک ہستیاں اسی اسم کے بحرِ برزخ میں نوری مچھلیوں کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ جو شخص انہیں ملنا چاہے اسی اسم کے دریائے نور میں غوطہ لگا کر ان سے ملے اور ان سے ملاقات کرے۔ اسم اللہ ذات جامِ جہاں نما اور آئینۂ سکندری ہے۔ اسی اسم کی دوربین میں صاحبِ تصور لوحِ محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے اور ہژدہ ہزار عالم کا تماشہ انگوٹھے کے ناخن پر دیکھتا ہے اور اٹھارہ ہزار مخلوق کا نظارہ ہاتھ کی ہتھیلی پر کرتا ہے۔ صاحبِ تصور کو خلوتِ بے خلل اپنے سینے میں حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا حجلۂ دِل حجرۂ آب و گِل سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اسے خلوت در انجمن اور نیز انجمن در خلوت یعنی روحانی مجلسیں سینے سے حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

ابیاتِ مصنف رحمۃ اللہ علیہ

اسم میں دیکھ لیا ہم نے مسٹے آخر — کھل گیا مشق و تصور کا معمے آخر
اسم کو جسم بنا جسم کو کر اس میں فنا — پھر اَنَا اَنۡتَ کہو اور سُنو اَنۡتَ اَنَا
اسم اللہ کے تصور سے لقا ہوتا ہے — جامِ جم کی طرح دل سینہ صفا ہوتا ہے
ہر نبی اور ولی غوث و قطب اور اوتاد — شیخ و صوفی و درویش و قلندر وزہاد
سب کو جو معرفت و قرب ہوا ہے حاصل — سب تصور سے ہوئے واصل و عامل کامل
نُہ اسم کے انوار سے سب نور ہوئے — برکتِ اسم سے سب ناظر و منظور ہوئے

گنجِ دارین کی کنجی ہے تصور یارو
بخت یاور ہے تو کرلو اسے باور یارو

یورپ میں مسمریزم، ہپناٹزم اور سپر چولزم والوں نے تصور اسم اللہ ذات کا چربہ اور نقل اتاری ہے۔ وہ لوگ اپنی نگاہ کو کسی خاص نکتے پر مثلاً شیشے کے گولے یا چراغ یا بتی کی لو یا بجلی کے قمقمے غرض کسی خاص روشن چیز پر جمانے کی مشق کرتے ہیں۔ جسے ان کی اصطلاح میں کنسنٹریشن (CONCENTRATION) کہتے ہیں۔ اسی طرح تصور اور خیال کی مشق سے وہ لوگ ایک برقی طاقت حاصل کر لیتے ہیں، جس کے ذریعے عامل اپنے معمول پر توجہ

ڈال کر اسے بے خود اور بے ہوش کر دیتا ہے اور اسے مقناطیسی نیند سلا دیتا ہے اور اس کے ضمیرِ اعلیٰ (UNCONSCIOUS MIND / ان کانشس مائینڈ) میں اپنی قوت اور قوتِ خیال سے کام لیتا ہے اور معمول کو جو امر کرتا ہے وہی امر معمول بجا لاتا ہے۔ مگر یہ طاقت چونکہ وجودِ عنصری کی پیداوار ہوتی ہے اور نفس ناسوتی کی خام ناتمام طاقت ہوتی ہے لہٰذا اس علم کا عامل محض مقامِ ناسوت میں سفلی معاملے اور محض مادی شعبدے اور ظاہری تماشے دکھا کر کم فہم اور نادان لوگوں کو حیران کر دیتا ہے اور اس سے چند دماغی اور عصبی امراض کا ازالہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی پائدار اصلی روحانی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ مسمرائزر اور ہپناٹائزر کا معاملہ محض مقامِ ناسوت تک محدود ہوتا ہے۔ اس سے آگے تجاوز نہیں کرتا۔ مقامِ ملکوت میں اس کو کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا وہ مطابق اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ مادے ہی میں محصور رہتا ہے۔ اس خام ناتمام طاقت کی فلاسفی یہ ہے کہ انسان کے تمام حواس اور قوتِ خیال جب ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتے ہیں تو اس میں ایک برقی قوت کی بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح آفتاب کی شعائیں جب کسی آتشی شیشے یعنی لینز میں سے گذرتے وقت ایک نقطے پر جمع ہو جاتی ہیں تو ان میں ایسی حدت اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ آگ کی طرح دوسری چیز کو جلاتی ہے۔ اسی طرح انسانی خیالات اور حواس کا جب ایک نقطے پر اجتماع ہو جاتا ہے تو اس میں ایک برقی طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس سے ایک کمزور شخص معمول کو بے ہوش بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن اس علم والوں کے مشقِ تصور کا مرکز ایک مادی شے اور فرضی نقطہ ہوتا ہے جس سے محض خیالات کا اجتماع منظور ہوتا ہے۔ اس لیے سمرائزر اور ہپناٹائزر کا سارا معاملہ اس مادی دنیا اور مقامِ ناسوت تک محدود رہ جاتا ہے۔ اس کا روحانی دنیا سے کوئی کنکشن اور تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن خلاف اس کے اگر کوئی شخص بجائے مفروضہ مادی نقطے کے اسم اللہ ذات کے نقشِ مکرم پر اپنے خیالات، حواس اور تصور و تفکر و توجہ مجتمع کرے یعنی اپنے دل اور دماغ میں تصور اسم اللہ ذات کے نقش کی ہر وقت مشق کیا کرے تو وہ اس سے ایک ایسی زبردست غیر مخلوق اور لازوال باطنی برقی قوت حاصل کر لیتا ہے کہ جس کا تعلق اور کنکشن اس ذاتِ بے مثل اور لایزال کے بحرِ انوار کے ساتھ ہو جاتا ہے جو تمام کائنات کا مبدأ و معاد ہے۔ اور جس کا یہ نوری نقطہ باعث و موجب ہر ایجاد ہے۔ اور جس کی

ادنیٰ صفت اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ٥ (یٰسٓ ۳۶: ۸۲) ہے۔اور جس کی معمولی شان اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرۃ ۲: ۲۰)۔پس اسم اللہ ذات کا اس طرح تفکر اور تصور کے ذریعے آنکھوں میں مشق کرنے سے مسٹے کے مشاہدے اور دیدار کا نور آنکھوں میں آ جاتا ہے۔ اور اسم اللہ ذات کی نوری دوربین میں ایک ناسوتی انسان لاہوت لامکان کے جلوے اور نظارے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اسم اللہ ذات کے منشور میں سے مسٹے کا آفتاب مع جملہ الوانِ اسماء وصفات متجلی اور جلوہ گر ہے۔اور اگر اسم اللہ ذات کا تصور کانوں میں کیا جائے تو باطنی کان کھل جاتے ہیں اور غیبی، روحانی اور ملکوتی آوازیں سننے لگ جاتا ہے اور صاحب الہام ہو جاتا ہے۔

جب صاحب تصور اسم اللہ ذات اپنے دل اور دماغ یا جسم کے دیگر خاص خاص مقامات پر نقش اللہ مرقوم کرتا ہے تو صاحب تصور کے اندر نور اسم اللہ ذات کی بجلی پیدا ہو جاتی ہے جس کا تعلق اور کنکشن مسٹے یعنی معدنِ انوار ذاتِ پروردگار کے پاور ہاؤس سے ہوتا ہے۔ اور وہاں سے صاحب تصور کے دل اور دماغ کو باطنی بجلی کی غیر مخلوق طاقت، نور، روشنی، آواز اور دیگر صفات کی برقی لہریں پہنچتی رہتی ہیں۔اور صاحب تصور کا وجود اس غیر مخلوق نور کی بجلی سے پر اور مملو ہو جاتا ہے۔ اور طالب ہر دو انفس اور آفاق میں اس برقِ باطن کی روشنی، طاقت، آواز و دیگر صفات کے انوار کی لہریں پھیلاتا ہے۔آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس مادی بجلی کے ذریعے ہر قسم کی طاقت، روشنی اور آواز وغیرہ ایک جگہ سے طرفۃ العین میں ہزاروں میل کی دوری پر دوسرے مقامات پر پہنچائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ روشنی منتقل ہو کر بولنے والوں کی صورتیں بھی صاف نظر آتی ہیں۔سو جس طرح یہ مادی اور ظاہری بجلی طاقت، آواز اور روشنی وغیرہ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا ذریعہ اور واسطہ بن جاتی ہے اسی طرح اسم اللہ ذات کی یہ باطنی برق اور روحانی بجلی مرشدِ کامل کے سینے کے پاور ہاؤس سے ہزاروں لاکھوں طالبوں کے جسموں اور ارواح میں نور، روشنی، طاقت اور دیگر انوار صفات و اسماء کی لہریں پہنچانے کا ذریعہ اور واسطہ بن جاتی ہیں۔اور اسی باطنی رَو کے ذریعے سالک پر مختلف وارداتِ غیبی اور فتوحاتِ لاریبی نازل ہوتے رہتے ہیں۔اور سالک اپنے اندر الہام کا ریڈیو، کشف کی ٹیلی ویژن، کرامات کی مشین اور تجلیات کا بجلی گھر قائم کر لیتا ہے۔

ہر نبی اور ہر ولی کے اندر اس باطنی رَو کے باطنی تار گھر، ٹیلی فون، ریڈیو اسٹیشن، لاسلکی اور ٹیلی ویژن لگے ہوئے ہیں۔

اِسم اللہ ذات تمام کائنات کا مبدأ، جملہ فیوضات و برکات اور معدنِ کُل انوار و اسرار ہے۔ جب اس کو بجائے ذکر زبانی کے تصور اور تفکر سے وجود کے خاص خاص مقامات میں تحریر کیا جاتا ہے تو انسان کے اندر وہ جملہ نوری اسما جو کہ اس کے مبدأ فیوضات و برکات باطنی ہیں متجلی ہو جاتے ہیں۔ جن سے انسان کا باطن یعنی قلب زندہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ذکر زبانی ذاکر کی صفت فَاذْكُرُونِیٓ (البقرہ ۲: ۱۵۲) ہے۔ اور اسم اللہ ذات کا اپنے اندر تصور و تفکر سے مرقوم کرنا اس کی قدرتی نوری تحریر اور اللہ تعالیٰ مذکور کی تجلی اَذْكُرْكُمْ (البقرہ ۲: ۱۵۲) ہے۔ ذکر کا اصل مقام اور محل انسانی دل ہے اور اس نوری غذا کا حقیقی بطن باطن انسان کا قلب ہے۔ لہٰذا ذکر کو زبان کے ذریعے اپنے اصلی محل قلب اور دل تک پہنچانے میں بہت کچھ خطرات اور رکاوٹوں کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب انسان زبانی طور پر ذکر کرتا ہے تو شیطان اس کا اثر قلب میں نہیں ہونے دیتا۔ اور دل پر دنیوی اور نفسانی غیر خطرات کا ہجوم کر دیتا ہے اور شیطانی وساوس کی دھوم مچا دیتا ہے اور بے شمار بھولی ہوئی باتیں یاد کرا دیتا ہے اور دل کی اصلی توجہ اور باطنی رخ کو اللہ تعالیٰ سے پھیر کر غیر کی طرف کر دیتا ہے اور دل میں ذکر کی تاثیر نہیں ہونے دیتا۔ کیونکہ دل ایک وقت میں ایک ہی چیز کو سوچ سکتا ہے۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِیْ جَوْفِهٖ ۚ (الاحزاب ۳۳: ۴)۔ ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے انسان کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔'' لہٰذا اہلِ فن نے ذکرِ زبانی کو دل تک پہنچنے کے لیے چند شرائط اور لوازمات اور مختلف قاعدے اور قانون مقرر کیے ہیں۔ مثلاً اسمائے الٰہی، آیاتِ کلام اللہ اور قرآنی سورتوں اور دیگر کلاموں کو عمل میں لانے کے لیے پہلی ضروری شرط اکل الحلال اور صدق المقال رکھی ہے۔ دیگر ہر کلام کی زکوٰۃ، نصاب، قفل، بذل، خلوت، تعینِ مقام و تعینِ وقت، ترکِ حیوانات یعنی ترکِ جلالی و جمالی، وقتِ نحس و سعد کی شناخت اور اجازتِ کامل و ریاضتِ عامل اور وجود و جائے اور جامۂ پاک کی مختلف شرائط و لوازمات مقرر کی ہیں۔ اگر ظاہر ذکر کی ان شرائط میں سے کوئی شرط رہ جائے یا کسی کے ادا کرنے

میں کوتاہی ہو جائے تو ذکر کا اثر نہیں رہتا اور معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ اس واسطے بہت لوگ سر کھپا کھپا کر رہ جاتے ہیں اور انہیں ذکر سے کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور آخر کار ذکر اور اسمائے الٰہی اور کلام اللہ کی تاثیر سے بھی منکر اور بد اعتقاد ہو جاتے ہیں۔ لیکن ذاکر اگر بجائے ذکر زبانی کے تصور اور تفکر کی انگلی سے اسی اسم کو اپنے دل اور دماغ میں یا جسم کے کسی دیگر اہم عضو میں تحریر کرتا ہے تو ظاہری اور زبانی ذکر کے تمام بکھیڑوں اور رجعتوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اور تمام شرائط اور پابندیوں سے جان چھوٹ جاتی ہے۔ اور اس طرح ذاکر ذکر کی اصلی منزلِ مقصود یعنی نور حضور مذکور و معبود سے جا واصل ہوتا ہے۔ اے طالب! اگر تو نے ہماری بات کو سمجھ لیا اور اسم و مسمّٰے کے ملنے کو پا لیا تو سمجھ لے کہ تو نے اپنا دامن گوہرِ مقصود سے بھر لیا۔ کیوں کہ ہم تجھے ایسے آبِ حیات کی طرف دلالت کرتے ہیں کہ جس کی طلب میں ہزاروں سکندروں نے عمریں گنوائیں اور جس کی ایک بوند کے لیے طالب سالہا سال ریاضتیں اور مجاہدے کرتے رہے اور ترستے رہے مگر نصیب نہ ہوا۔

ابیاتِ مصنف رحمۃ اللہ علیہ

| | |
|---|---|
| سرِ آب باتو گویم نہ رہِ سراب پویم | بدر از چہ آب جوئی ہبراست آب جویم |
| من ازاں شراب مستم کہ بداد در الستم | نہ بخواب اندراستم کہ حدیثِ خواب گویم |

ترجمہ: میں تجھے پانی کے چشمے کا پتہ دے رہا ہوں۔ صرف سراب نہیں بتا رہا۔ دربدر کس سے پانی کی تلاش کر رہا ہے۔ میرے اپنے پہلو میں وہ پانی موجود ہے۔ میں اس شراب سے مخمور ہوں جو مجھے ازل کے دن ملی تھی۔ میں خوابیدہ نہیں ہوں۔ بالکل ہوش میں ہوں اور خواب کی باتیں نہیں کر رہا۔

ذکر کے دو طریقے ہیں: ایک ذکر باللسان یعنی زبان سے ذکر کرنا، دوم ذکر بالجنان دل سے اور خیال سے ذکر کرنا ہے۔ ایک ذکر زبان اور ہونٹوں کا ہے۔ دوم ذکر تصور اور خیال کا یعنی چشمِ بصیرت کا۔ ان ہر دو طریقوں کو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یوں بیان فرماتے ہیں: اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۙ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ

(البلد ۹۰: ۸ـ۱۰)۔ ترجمہ: "آیا نہیں دیں ہم نے انسان کو دو آنکھیں اور زبان مع دو

ہونٹوں کے اور دکھائے ہم نے اسے دو راستے۔'' سو زبان اور ہونٹوں کا راستہ ظاہری ذکر زبان کا ہے اور آنکھ سے تصور اور تفکر کا راستہ ذکر جنان کا ہے۔ پس جس وقت طالب تصور اسم اللہ ذات کی مشق کرتا ہے اور نقشِ اسم اللہ ذات طالب کے دل پر قائم ہو جاتا ہے تو اسم اللہ ذات سے تجلیٔ انوار کا برقی شعلہ نکلتا ہے جس سے طالب اس شعلہ انوارِ دیدار میں غرق ہو جاتا ہے اور اس ذاتی نور میں طالب کا باطنی وجود طے اور زندہ ہو جاتا ہے اور اس سے طالب کے لیے ہمیشہ دیدار اور مشاہدے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ سو جملہ اذکار سے افضل، اعلیٰ، اکمل، اتم اور جامع ذکر آنکھ کا ہے۔ یعنی تصور اسمِ ذات تمام اذکار کا مغز اور اصل ہے اور باقی ذکر کے طریقے سب فروعات ہیں۔

بعض لوگ کہیں گے کہ اسم اللہ ذات چار حروف اَ، لَ، لَ اور ہ سے مرکب ایک لفظ ہے۔ جب ہم اس لفظ کو ظاہر زبان پر ادا کرتے ہیں یا کاغذ پر لکھتے ہیں یا آنکھ سے دیکھتے ہیں تو دوسرے الفاظ اور کلمات کی طرح ہمیں کچھ ثقالت یا کسی قسم کی گرمی سردی یا دیگر قسم کے اثر یا لذت وقوت وغیرہ معلوم نہیں ہوتی۔ ہم کیونکر جانیں کہ اس میں اس قدر اثر، نور، روشنی یا طاقت موجود ہے کہ اس سے نفس و شیطان اور معصیت، غفلت کے حجابوں اور تاریکیوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اور کہ یہ اتنی باطنی گرمی و حرارت رکھتا ہے کہ جس سے انسان کا بیضۂ ناسوتی پھٹ کر اس میں سے دل کا مرغ لاہوتی زندہ ہو جاتا ہے۔ اور یا یہ کہ اس میں ایسی باطنی بجلی پنہاں ہے کہ جس کی طاقت اور پاور کے برق براق پر سوار ہو کر ذاکر اور صاحبِ تصور اللہ تعالیٰ کی پاک اور بلند درگاہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسمِ اللہ کو ظاہر زبان سے ادا کرنا یا کاغذ پر لکھنا یا خالی آنکھ سے دیکھنا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی دوائی مثلاً کونین یا سنکھیئے کی ڈلی ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھتا ہے یا اسے آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ایسا کرنے سے دوائی یا سنکھیئے کی کیا تاثیر معلوم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دوائی اپنے خاص محل معدے یا جگر اور خاص کر خون میں جا کر اثر کرتی ہے۔ مثلاً سنکھیئے کی تاثیر دیکھنی ہو تو اسے منہ میں ڈال کر گلے سے نیچے اتار کر معدے کے اندر پہنچایا جائے تب معلوم ہو جائیگا کہ وہ سنکھیئے کی سفید ڈلی جو ہاتھ کی ہتھیلی پر محض چونے کی طرح ایک بے اثر چیز معلوم ہوتی تھی جس وقت گلے سے نیچے اتر کر معدے اور جگر میں جا پہنچی تو جسم و جان کے لیے ایک ایٹم بم ثابت ہوئی جس نے وجود کے پرخچے

اڑا دیئے۔ اس طرح مفید اور نافع دوائی مثلِ تریاق بھی انسانی وجود کے اندر جا کر تاثیر دکھاتی ہے۔ ہر چیز اپنے محل اور مقام میں اثر کرتی ہے۔ نیز دوائی کا اگر جوہر نکال کر بذریعہ انجکشن اور جلدی پچکاری خون کے اندر داخل کیا جائے تو اس سے زیادہ جلدی وجود اور جسم انسانی میں مفید یا مضر انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ غرض تصور اسم اللہ ذات تمام قرآن کریم اور اسماء العظامِ الٰہی کا جوہر نکلا ہوا ہے اور اس کا معدہ انسانی دل ہے اور یہی اس کا بطنِ باطن ہے۔ اگر اسے ظاہر زبان سے ورد کیا جائے اور ذکرِ ظاہر کی تمام شرائط اور جملہ لوازمات کے ساتھ دل کے باطنی بطن میں پہنچایا جائے تو البتہ ضرور اپنا اثر دکھائے گا۔ یا تصور اور تفکر کے انجکشن سے وجود کے کسی خاص مقام میں تحریر اور مرقوم کر کے پہنچایا جائے تب معلوم ہوگا کہ اسم اللہ کا چار حروف سے مرکب لفظ جو ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھنے یا زبان سے ادا کرنے یا آنکھ سے دیکھنے کے وقت ایک معمولی اور بے اثر چیز معلوم ہوتا تھا جب بطنِ باطن میں پہنچا تو ایک ایسا باطنی برق کا پاور ہاؤس ثابت ہوا کہ جس نے وجود کی تمام نفسانی اور شیطانی تاریکیوں کو کافور کر دیا اور وجود کو اللہ تعالیٰ کے غیر مخلوق انوار سے ابدالآباد تک زندہ اور تابندہ کر دیا۔

اسم اللہ ذات بذریعہ تصور و تفکر جسم کے جس مقام یا عضو میں نوری حروف سے مرقوم ہو جاتا ہے تو وہ عضو نورِ اسم اللہ ذات سے باطن میں زندہ ہو جاتا ہے۔ اور جب طالب کے وجود کے تمام ضروری اندام اور اہم اعضاء نقش اسم اللہ ذات کی نوری تحریر سے منقش اور منور ہو جاتے ہیں تو باطن میں ایسے طالب کا ایک نوری لطیف وجود زندہ ہو جاتا ہے۔ ایسا طالب سالک اس نوری لطیف جثے کے ساتھ عالمِ غیب اور عالمِ امر کے لطیف جہان میں گویا ازسرِ نو جنم لیتا اور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہاں روحانی ماں باپ کے ہاتھوں اس کی پرورش اور تربیت ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اچھا خاصا نوری طفل بن جاتا ہے۔ وہاں روحانی مدرسوں اور باطنی مکتبوں کے اندر روحانی مدرسوں کے ذریعے اسے نوری تعلیم ملتی ہے۔ سو نفوس کے مدرسے اور ہیں، قلوب و ارواح کے کالج الگ ہیں اور اسرار و انوار کے دارالعلوم علیحدہ ہیں۔ ان نوری علوم کے الفے بیٹ یعنی حروفِ تہجی اور ہیں۔ وہاں کی زبان، اصطلاح، نصاب و طریقۂ تعلیم اور کتابیں مختلف ہیں۔ وہاں کی زمین و آسمان اور جہان بالکل جدا ہے۔ شنیدہ

کے بود مانندِ دیدہ۔

دِل گفت[1] مرا علمِ لدنی ہوس است — تعلیمے کن اگر ترا دسترس است
گفتم کہ الف گفت دِگر گفتم ہیچ — درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

غرض یہ راستہ باطنی وجود اور اس کے باطنی حواس کا ہے۔ ظاہری وجود اور عنصری جسم کا وہاں کوئی دخل نہیں۔

پائے ظاہر[2] رَو ہمیشہ راہِ ظاہر میرود
قطع راہِ باطنی ہا کارِ پائے دیگر است

دکاندار مشائخ نے اسلامی تصوف اور روحانی علم کو سخت بدنام کیا ہے۔ یہ علم اہلِ مشرق کی اصلی وراثت تھی اور اسی علمِ روحانیت کی بدولت مشرق مغرب پر بجا طور پر فخر کرسکتا تھا۔ سچ پوچھو تو مشرق کے پاس یہ دولتِ ابدی اور سعادتِ سرمدی نہ ہو تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے نام نہاد صوفیوں کے پاس آج اس علم کا محض یہ دعویٰ کہ "پدرم سلطان بود" رہ گیا ہے۔ یا کہیں کہیں تصوف اور روحانیت کا خالی جامہ اور لباس یا محض زبانی بے محل اور بے جا لاف اور قصے کہانیاں رہ گئی ہیں۔ آج یورپ والے اس علم کو از سرِ نو اپنا رہے ہیں اور اس کی طلب و تلاش میں یہ جفاکش اور جانباز لوگ سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ اگرچہ آج یہ لوگ اس علم کی ابتدائی منزل میں ہیں لیکن وہ دن دور نہیں کہ یہ آفت کے پرکالے ایک دن اس سعادتِ دارین اور گنجِ کونین کا بھی کھوج لگا لیں گے۔ کیونکہ زندگی عمل اور جدوجہد کا نام ہے۔ خالی دعوے، وراثت بلکہ استحقاق بھی کوئی چیز نہیں۔

زندگی جُہد[3] است استحقاق نیست
جُز بعلمِ انفس و آفاق نیست

(اقبال)

---

[1] دل نے کہا کہ مجھے علمِ لدنی کا شوق ہے اگر تجھے آتا ہے تو مجھے سکھلا دے۔ میں نے کہا کہ الف کہو۔ اس نے کہا کچھ اور۔ میں نے کہا کچھ نہیں۔ اگر گھر میں کوئی اہل ہے تو یہ ایک حرف ہی کافی ہے۔

[2] ظاہریت کی پیروی کرنے والا قدم ہمیشہ راہِ ظاہری ہی پر چلے گا۔ باطنی معاملات کی راہ کو طے کرنا دوسرے قدم کا کام ہے۔

[3] زندگی استحقاق کا نام نہیں بلکہ سراپا جدوجہد کا نام ہے۔ انفس و آفاق کے معارف کو جاننے کے بغیر زندگی کچھ نہیں۔

اس قوم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں اگر کوئی شخص کسی نئی مہم کو سر کرنے لگتا ہے یا کسی نئی ایجاد اور اختراع یا کسی نئے علم کی تلاش و تحقیق شروع کرتا ہے تو تمام قوم اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگ جاتی ہے۔ بلکہ خود حکومت اس کی پشت پناہ بن جاتی ہے۔ لیکن مشرق کی شقاوتِ قلبی اور شامتِ عملی ملاحظہ ہو کہ اگر کوئی شخص سادہ لباس میں عرشِ معلی کے ستارے اتار کر دکھا دے یا عالمِ غیب کے بحرِ عمیق میں غوطے لگا کر باطن کے وہ دُرِ ثمین نکال کر لا دے جس کی نظیر دنیا میں ملنی محال ہو تو یہ پہلے تو اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے اور اگر کہیں پتہ لگے کہ اس کی قدر و قیمت ہونے لگی ہے تو ایک دنیا حسد کے مارے اس کی مخالفت اور عداوت پر کمر بستہ ہو جائے گی اور اسے کہیں کا نہیں رہنے دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اسے گوشۂ خمول اور کنجِ گمنامی میں سر چھپانا پڑے گا۔ قومی بہتری اور مذہبی اشاعت کے سلسلے میں جان و مال کی جو بازی اہلِ یورپ لگا رہے ہیں اسے دیکھ کر ہم مسلمانوں کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔ ہم اس سلسلے میں ان لوگوں کے چند واقعات بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتے ہیں۔

ایک عیسائی عورت مسز رینالڈز نے بارہ لاکھ ڈالر مذہبی اور قومی بہتری پر خرچ کرنے کی وصیت کی۔ یروشلم سے ہزاروں میل دور جزیرہ نیوگنی میں لنڈن سے مذہبی تبلیغ کے لیے ایک مشن بھیجنے کی تجویز زیرِ غور تھی۔ وہاں کے حالات معلوم کرانے کے لیے ۱۸۷۱ء میں وہاں ایک مسیحی سیاح بھیجا جاتا ہے۔ سیاح مذکور لنڈن بائبل سوسائٹی کو نہایت مایوسی کی حالت میں یہ رپورٹ بھیجتا ہے کہ اس جگہ تو بس بڑے خوفناک مگرمچھ اور سخت زہریلے سانپ ہی رہتے ہیں۔ اور جو انسان بھی یہاں آباد ہیں وہ بھی ایسے ظالم اور خونخوار ہیں کہ ان کے درمیان قدم رکھنے کا بھی خیال نہ کیجیے۔ لنڈن سے جواب ملتا ہے کہ اتنی اطلاع بس کافی ہے کہ وہاں انسان بھی آباد ہیں اور جہاں کہیں انسان آباد ہیں مشنری کا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں لنڈن سے وہاں مشن بھیجا گیا اور اس مشن پر صرف لنڈن کی بائبل سوسائٹی نے ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ خرچ کیے۔ ان لوگوں کی مذہبی اور روحانی معاملات میں مالی اور جانی قربانیوں کی یہ ایک ادنیٰ مثال ہے۔ مذہبی امور میں غیروں کی قربانیاں اور جان فدائیاں دیکھو اور اپنوں کی تن آسانیاں اور بے پرواہیاں ملاحظہ ہوں۔

وہ ادنیٰ باطنی شخصیت یا اول جوہرِ حیات جس کا پتہ ابھی حال ہی میں یورپ کو لگا ہے ہمارے اہلِ سلف صوفیائے کرام کی اِصطلاح میں اسے لطیفۂ نفس کہتے ہیں۔ یہ لطیفہ ہر انسان کے اندر خام ناتمام حالت میں موجود ہے۔ اسی وجود کے ذریعے انسان خواب کے اندر داخل ہوتا ہے۔ نفس کا یہ لطیفہ جسدِ عنصری کو لباس کی طرح اوڑھے ہوئے ہے ہمارے اہلِ سلف فقراء کاملین اور سچے عارفین کے نزدیک سب سے ادنیٰ باطنی شخصیت نفس کی ہے۔ اس سے بڑھ کر اعلیٰ اور ارفع شخصیتیں انسان کے اندر بتدریج سلک سلوک باطنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جنہیں لطیفۂ قلب ولطیفۂ روح، لطیفۂ سِرّ، لطیفۂ خفی، لطیفۂ اخفیٰ اور لطیفۂ انا کہتے ہیں۔ اہلِ یورپ کو ان دیگر اعلیٰ اور ارفع شخصیتوں کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں۔ انہیں صرف لطیفۂ نفس کا ادراک حاصل ہوا ہے جو جسدِ عنصری کو لباس کی طرح اوڑھے ہوئے ہے اور جس وقت وہ خواب کی دنیا میں جا داخل ہوتا ہے تو وہاں وہ ایک لطیف مثالی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا جہان عالمِ ناسوت ہے۔ اس عالم میں نفس، سفلی ارواح، جن اور شیاطین سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ کیونکہ عالمِ غیب کی یہ سفلی ارواح بھی اسی عالم میں رہتی ہیں۔ اس لطیفے کا مقام شریعت ہے۔ یعنی شریعت کی پابندی سے اسے باطنی ترقی اور روحانی عروج حاصل ہوتا ہے اور باطنی طیر سیر اور چال اس کی اِلَی اللّٰہ ہے۔ یعنی اس مقام میں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف اس کا رخ اور رجوع ہو جاتا ہے۔ اس مقام میں سالک کا معاملہ محض قیل وقال، ذکر اذکار اور گفت وشنید تک محدود رہتا ہے۔ ایسے سالک کا حال اللہ تعالیٰ کی طرف صرف میل یعنی رغبت کا ہوتا ہے۔ اس لطیفے کا رنگ نیلا ہے۔ اور ذکر اس کا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ ہے۔ اور اسم تصور اس کا اسم اَللّٰہُ ہے۔ شریعت کی پابندی اور مُرشدِ کامل کی توجہ اور نظرِ التفات اور ذکر فکر میں ریاضت اور مجاہدے سے سالک کے نفس کا تزکیہ ہوتا رہتا ہے تو نفسِ امارہ سے لوامہ اور لوامہ سے ملہمہ اور ملہمہ سے مطمئنّہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ نفس کی چار قسمیں اور منزلیں ہیں۔ اول نفسِ امّارہ ہوتا ہے۔ اسے امّارہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ہر وقت برائی کا امر کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۂ یوسف میں فرماتے ہیں: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (یوسف ۱۲ : ۵۳)۔ یعنی نفس برائی کا امر کرتا ہے۔ یہ نفس کفار، مشرکین، منافقین، اور فاسقین وفاجر لوگوں کا ہوتا ہے۔ اگر اس کی اصلاح اور

تربیت نہ کی جائے تو یہ اپنی سرکشی، تمرد اور طغیان میں ترقی کرتا ہے اور انسان سے حیوان، حیوان سے درندہ بلکہ مطلق شیطان بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نفس کی باطنی بیماری لاعلاج ہو جاتی ہے اور وہ آخر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور اگر نفس کی اصلاح اور نیک تربیت شروع ہو جائے تو وہ بتدریج باطن میں عالمِ ملکوت اور حیاتِ طیبہ کی طرف ترقی کرتا ہے اور اس کا نفس امّارہ سے لوّامہ ہو جاتا ہے۔ لوّامہ کے معنی ہیں ملامت کرنے والا۔ یعنی گناہ پر انسان کو اپنا نفس ملامت کرتا ہے اور پشیمانی دلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائیدِ غیبی اور توفیقِ باطنی چونکہ ایسے نفس کے شاملِ حال رہتی ہے لہٰذا گناہ پر نفس انسان کو شرمسار کرتا رہتا ہے۔ ایسے نفس کو موت، روزِ قیامت اور حساب کتاب وغیرہ ہر وقت یاد رہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کی زبانی روزِ قیامت کے ساتھ ایسے نفس کی بھی قسم اٹھاتے ہیں۔ لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ (القیمۃ ۷۵: ۱۔۲)۔ ترجمہ: ”خبردار میں قسم کھاتا ہوں روزِ قیامت اور نیز قسم کھاتا ہوں گناہ پر ملامت کرنے والے نفس کی۔“ اس کے بعد نفس کا جب تزکیہ ہوتا ہے وہ لوّامہ سے ملہمہ ہو جاتا ہے۔ ایسا نفس گناہ کے ارتکاب سے پہلے اہلِ نفس کو تائیدِ غیبی سے الہام کرتا ہے کہ خبردار! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ گناہ سے باز آ جاؤ۔ ایسے نفس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ (النّٰزعٰت ۷۹: ۴۰۔۴۱)۔ ترجمہ: ”اور لیکن جو شخص قیامت کے روز اللہ کے روبرو حساب کے لیے کھڑا ہونے سے ڈرا اس نے اپنے نفس کو ہوا اور خواہشِ نامشروع سے باز رکھا۔ پس ایسے شخص کا ٹھکانا بے شک بہشت ہے۔“ یہ نفسِ ملہمہ کو ارتکابِ گناہ کے وقت تائیدِ غیبی کے ذریعے الہام مختلف طریقوں سے ہوا کرتا ہے۔ بعض دفعہ انسان کو صحیح دلیل اور خیال کے ذریعے گناہ سے روکتا ہے۔ بعض کو غیب سے وہم کے ذریعے بے صوت و آواز القا ہوتا ہے۔ بعض کو باطن میں فرشتہ آواز دیتا ہے جس سے دِل میں خوفِ خُدا موجزن ہو جاتا ہے اور انسان گناہ سے باز آ جاتا ہے۔ گاہے کسی نبی یا ولی کی روح غیب سے دستگیری فرماتی ہے اور گناہ سے روک دیتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ کے یہ غیبی براہین کسی نہ کسی صورت میں طالب سعادت مند کے شاملِ حال ہو جاتے ہیں اور اسے گناہ سے روک دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ

تعالیٰ یوسف علیہ السلام کے حق میں فرماتے ہیں: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ (یوسف ۱۲: ۲۴)۔ ترجمہ: ''تحقیق عزیز مصر کی بیوی زلیخا نے یوسف علیہ السلام سے زنا کا ارادہ کرلیا تھا اور یوسف علیہ السلام بھی ارادہ کر چکتا اگر وہ ہمارے بُرہانِ غیبی کو نہ دیکھ پاتا۔'' اس کے بعد جب اہلِ نفس باطن میں ترقی اور عروج کرتا ہے تو اس کا نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ گویا نفس اس ازلی راہزن شیطان سے نجات پا کر اپنی منزل دارُالامان اور منزلِ مقصود کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ مقام لا تخف و لا تحزن کا ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (یونس ۱۰: ۶۲)۔ ایسے نفس والا سالک اللہ تعالیٰ کا دوست اور مقرب بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے راضی اور وہ اللہ سے خوشنود اور رضامند ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ ایسے اہلِ نفسِ مطمئنہ کے حق میں فرماتے ہیں: يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (الفجر ۸۹: ۲۷۔۳۰)۔ ترجمہ: ''اے نفسِ مطمئنہ! اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر۔ ایسی حالت میں کہ وہ تجھ سے راضی ہے اور تو اس سے راضی ہے۔ پس میرے بندگانِ خاص کے حلقے میں شامل اور میری بہشتِ قرب و وصال میں داخل ہو جا۔'' ایسا پاک مزکی نفس اولیا اور انبیا کا ہوتا ہے۔ نفس کی یہ باطنی شخصیت بہت ارفع اور اعلیٰ ہوتی ہے۔ ہر ایک نفس اپنی خوخصلت اور رنگ و بو سے پہچانا جاتا ہے۔ چنانچہ نفسِ امارہ ہر وقت بری باتیں سوچتا ہے اور برائی اور گناہ و معصیتِ شیطانی کی طرف مائل رہتا ہے۔ ہر وقت کھانے، پینے، سونے، جماع اور اسی قسم کے شہوانی اور نفسانی خیالات میں محو اور منہمک رہتا ہے۔ موت اسے بھولے سے بھی یاد نہیں آتی اور یومِ آخرت حساب کتاب پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ اپنے نفسانی اور دنیوی دھندوں میں اس قدر محو اور مصروف ہوتا ہے کہ اسے دینی اور مذہبی باتوں کو سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ایسے نفس کی باطن میں مثالی صورت مردار پرندے کی ہوتی ہے۔ اور گاہے گاہے اسے خواب کی باطنی دنیا میں اللہ تعالیٰ بطور تنبیہ و اعلام نفس کی مثالی صورت دکھاتا رہتا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ۭ (الانعام ۶: ۳۸)۔ ترجمہ: ''اور نہیں ہے کوئی حیوان روئے زمین پر اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہو۔ مگر وہ مختلف گروہ اور ٹولے ہیں

تمہاری (باطنی) مثالیں۔" جس شخص کا نفس امارہ ہوتا ہے تو اسے نفس کا باطنی مرض اور بری خوخواب کے اندر کسی خاص حیوان کی مثالی صورت میں دکھائی جاتی ہے۔ ایسا شخص خواب میں اپنے نفس کو حیوانات میں سے خنزیر، کتے، بھیڑیئے، گیدڑ وغیرہ یا سانپ، چوہے، بچھو وغیرہ یا پسّو، جوں وغیرہ یا پرندوں میں سے گدھ، چیل، کوے وغیرہ کی صورت میں دیکھتا ہے اور اپنے مقام و منزل کو ٹٹی، شراب خانہ، قمار خانہ وغیرہ اور اپنی غذا گندگی، پاخانہ وغیرہ کی شکل میں دیکھتا ہے۔ الغرض یہ نفس کی باطنی مثالی صورتیں ہیں جو بدلتی رہتی ہیں اور ہر صورت اور سیرت اور خصلت سے پہچانی جاتی ہیں۔ چنانچہ خنزیر کی صورت نفس کی حرام خوری اور دیوثی پر دلالت کرتی ہے اور کتے کی صورت سے مراد حرص و آز اور محبتِ دنیا ہے۔ سانپ منہ سے ایذا رسانی اور مردم آزاری کی صفت ہے اور بندر کے دیکھنے سے نکتہ چینی کا مرض مراد ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔ جس وقت سالک سعادت مند شریعت کی پابندی اور ذکر فکر و ریاضت سے نفس کا تزکیہ کرتا ہے تو اس کا نفس ترقی پذیر ہو کر امارہ سے لوامہ بن جاتا ہے۔ اس وقت اس کی مثالی صورت حلال جانوروں مثلاً اونٹ، بکری وغیرہ یا مچھلی اور حلال کی سی ہو جاتی ہے۔ اور اپنا مقام اور منزل بھی اسی کے مطابق بہتر دیکھتا ہے۔ تیسرے مقام میں نفسِ ملہمہ منزلِ حیوانیت سے نکل آتا ہے اور مقامِ آدمیت و انسانیت میں قدم رکھتا ہے۔ لیکن جس وقت تک اس منزل میں کامل نہیں ہو جاتا اور جملہ عیوب و نقائص اور امراض بہیمی سے چھٹکارا نہیں پا لیتا اپنے نفس کو ناقص، بیمار، اپاہج، بدصورت، مفلس، نادان وغیرہ نامکمل انسان کی صورت میں دیکھتا ہے۔ چوتھے مقام میں جب نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے تو سالک خواب یا مراقبے کے اندر اپنے نفس کو خوبصورت، تندرست، امیر کبیر، قاضی یا حاکم یا کسی بزرگ صالح آدمی کی صورت میں دیکھتا ہے۔ اور مکانات میں سے کچہری، مسجد، خانقاہ، بیت اللہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ وغیرہ دیکھتا ہے۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اہلِ نفسِ امارہ ہمیشہ خواب میں سؤر، کتے اور گدھے وغیرہ دیکھتا رہتا ہے۔ یا اہلِ نفسِ مطمئنہ ہمیشہ اچھی چیزیں دیکھا کرے۔ بلکہ ہمارے اس بیان کا مدعا یہ ہے کہ اگر باطن میں خواب یا مراقبے کے اندر کسی کو اپنی باطنی مثالی صورت دکھانی منظور ہوتی ہے تو وہ خاص خاص حالتوں میں اپنے نفس کو اصلی مثالی صورت دیکھ لیتا ہے۔ ورنہ عوام جہلا اور اللہ تعالیٰ

سے غافل لوگوں کو نہ اپنے باطنی امراض کا احساس ہوتا ہے اور نہ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اور اکثر یہ مثالی صورتیں کسی آئینے کے اندر نظر آتی ہیں اور خاص کر اس وقت دکھائی جاتی ہیں جب کہ انسان ان کی اصلاح اور تزکیہ میں مشغول ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص نماز، نفل نوافل کے ذریعے نفسِ امارہ کے تزکیے میں لگ گیا ہے تو وہ اپنے نفس کو اغلباً اس طرح دیکھے گا کہ وہ مسجد میں داخل ہوگیا ہے اور وہاں پر کتا یا گدھا وغیرہ کھڑا ہے۔ یا نماز پڑھ رہا ہے مگر ناپاک جگہ اور مکان میں پڑھ رہا ہے۔ یا اگر کوئی شخص قرآن کی تلاوت سے تزکیۂ نفس کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسی جگہ میں اپنے نفس کی مثالی صورت دیکھے گا جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہوگا۔ یا اگر کسی نے مرشد مربی پکڑا ہے۔ یا وہ خواب یا مراقبے کے اندر اپنے نفس کی مثالی صورت کو اپنے مرشد کی حضوری میں دیکھے گا تو گویا مذکورہ بالا شخصوں نے اپنے نفس کی مثالی صورت کو نماز، قرآن اور مرشد کے مختلف آئینوں کے اندر دیکھ لیا ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ لطیفۂ نفس سے اعلیٰ اور ارفع شخصیت باطنی لطیفۂ قلب یعنی دل کے لطیفے کی ہے۔ یہ لطیفہ اپنے اندر بہت بڑی وسعت، عظمت، قدرت اور حکمت رکھتا ہے۔ جس طرح جسدِ عنصری کا مغز اور جوہرِ حیات لطیفۂ نفس ہے اسی طرح نفس کا اصلی مغز اور جوہرِ حیات لطیفۂ قلب ہے۔ سالک کے وجود میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور مرشدِ کامل کے فیض سے جب یہ لطیفہ زندہ ہو جاتا ہے تو سالک عالمِ ناسوت سے نکل کر عالمِ ملکوت میں قدم رکھتا ہے۔ عالمِ ملکوت عالمِ ناسوت کی نسبت اس قدر وسیع اور فراخ ہے جتنا ہمارا یہ تمام مادی جہان ماں کے تنگ و تاریک رحم کے مقابلے میں طویل اور عریض ہے۔ غرض ماں کے رحم کو اس مادی جہان سے جو نسبت ہے وہی نسبت اس مادی جہان کو عالمِ ناسوت سے ہے اور وہی نسبت عالمِ ناسوت کو عالمِ ملکوت سے ہے۔ غرض لطیفۂ قلب کا عالم ملکوت ہے اس عالم میں اس کے ساتھ فرشتے اور اہلِ قلب ارواح طیبہ بھی رہتے ہیں۔ مقام اس کا طریقت ہے۔ یعنی شریعت میں تو طالب محض اہلِ گفت و شنید اور صاحبِ قیل وقال ہوتا ہے۔ یعنی اپنے مطلوب اور محبوبِ حقیقی کی صفات اور حالات کے صرف ذکر اور بیان پر اکتفا کرتا ہے اور انہیں سن سن کر فردا بعد از موت وعدۂ وصل و ملاقات پر خوش ہوتا ہے اور اس کے انعام و اکرام جنت، حور و قصور کے ذکر اذکار سے دل کو تسلی دیتا ہے اور اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے۔ لیکن طریقت میں سالک اسی دنیا میں اللہ

تعالیٰ کی طرف چلنے لگتا ہے۔ یعنی اہلِ شریعت اہلِ شنید ہوتا ہے اور اہلِ طریقت اہلِ رسید ہوتا ہے۔ اس کی سیر اور چال لِلّٰہ ہوتی ہے۔ یعنی جو کچھ کرتا ہے اللہ کے لیے کرتا ہے۔ اور اس چال میں بجائے ظاہری بدنی اعمال کے وہ دِل کی نیت اور حضورِ دل سے کام لیتا ہے۔ طریقت میں دل کی نیت اور حضورِ قلب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا حال میل سے محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس لطیفے کے نور کا رنگ زرد ہے۔ اور ذکر اس کا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اور اسمِ تصور اس کا لِلّٰہ ہے۔ جس وقت سالک کا لطیفۂ قلب زندہ ہو جاتا ہے تو وہ نفس کے بیضۂ ناسوتی کو توڑ کر عنقائے قافِ قدس کی طرح عالمِ ملکوت میں اللہ تعالیٰ کے کنگرۂ عرشِ معلّٰے میں اپنا آشیانہ بنا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر فکر، اس کی تسبیح و تہلیل اور تلاوت، اطاعت، عبادات اور نیک اعمال کا نور اس کی غذا بن جاتی ہے اور اسی سے اسے قُوت اور قوت ملتی رہتی ہے۔ خواب و بیداری اور بھوک و سیری اس کے لیے ایک ہو جاتی ہے۔ اس مقامِ طریقت میں سالک سے کشف و کرامات صادر ہوتے ہیں اور خلقت کی رجوعات ہو جایا کرتی ہے۔ طالب کو چاہیے کہ اس مقام میں اپنے آپ کو چھپائے رکھے اور خود فروش نہ بنے۔ ورنہ آگے سلوک میں عروج اور ترقی سے رہ جاتا ہے۔ اس مقام میں سالک فرشتوں سے ملاقی ہوتا ہے۔ کراماً کاتبین کو وقتاً فوقتاً اپنے پاس آتے جاتے دیکھتا ہے۔ اور وہ اسے نیکی اور بدی کا الہام اور اعلام کرتے ہیں۔ جب کبھی اس کے گھر یا محلے یا شہر میں کوئی شخص قضائے الٰہی سے مرنے لگتا ہے تو وہ ملک الموت کو مع اپنے دیگر اعوان و مددگار ملائکہ کے آسمان سے اترتے اور روح قبض کرتے اور روح کو آسمان کی طرف لے جاتے دیکھتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ روح کی سعادت اور شقاوت کو بھی معلوم کر لیتا ہے۔ وہ گاہے گاہے ذکر اذکار اور تلاوتِ قرآن کے وقت فرشتوں کو مختلف اشکال میں آسمان سے اترتے دیکھتا ہے۔ وہ ملائکہ سے مصافحہ اور ملاقات کرتا ہے اور وہ زندہ دل آدمی کے ذکر اور تلاوت کے زائد نور سے غذا اور وظیفہ حاصل کرتے ہیں اور اس کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں۔ فرشتے اس مقام میں سالک کو اپنی باطنی بشارتوں اور روحانی اشارتوں سے دن رات خوش کیا کرتے ہیں۔ جس سے اس کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا

بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥ (حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۳۰۔ ۳۱)۔ ترجمہ: ''وہ لوگ جنہوں نے عہد کرلیا کہ ہمارا معبود اور مقصود اللہ تعالیٰ ہے اور اس بات پر ثابت قدم رہے ہم ان پر اپنے فرشتے نازل کرتے ہیں جو انہیں بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں کہ تمہیں مطلق آخرت کا خوف اور غم نہیں کرنا چاہیے اور اس بہشت کی جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے خوشی مناؤ۔''

جس وقت سالک کا دل ذکر اللہ سے زندہ ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں نورِ حق سے روشن ہو جاتی ہیں تو اس کی بینائی میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی ٥ (النجم ۵۳: ۱۱)۔ یعنی ''دل جس چیز کو باطن میں دیکھتا ہے اس میں کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوتا۔'' دل جس کو عرش اللہ سے تعبیر دی جاتی ہے اپنے اندر ایک بہت وسیع عالم کو لیے ہوئے ہے۔ نفسانی لوگ دِل کی عظمت اور وسعت کو کیا جانیں جو دل کو ایک گوشت کا جامد لوتھڑا سمجھتے ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آدم علیہ السلام جس وقت پیدا ہوئے تو ان کا سر عرش سے ٹکراتا تھا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نے ایک مٹھی بھر مٹی ان پر ڈال دی تو آپ نے موجودہ خاکی صورت اختیار کرلی۔ غرض یہ بھی لطیفۂ قلب کی باطنی شخصیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی مومن ذکر اللہ کرتے کرتے سوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذاکر سے عرشِ معلّے کے نیچے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کے ستر ہزار سر ہوتے ہیں اور ہر سر میں ستر ہزار زبانیں ہوتی ہیں اور وہ پرندہ ہر زبان سے اس ذکر کی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور اس ذکر کا ثواب اس ذاکر مومن کو پہنچتا ہے۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ جب کوئی ذاکر زبان سے ذکر کرتے کرتے سوجاتا ہے یا مراقبہ کرتا ہے تو کثرتِ ذکر سے حواس اِس ذکر کو قلب کے باطنی لطیفے تک پہنچا دیتے ہیں اور ذکر نفس سے دل کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور زبان مع دیگر حواس کے نیند اور مراقبے کے وقت چونکہ ذکر سے معطل اور موقوف ہو جاتے ہیں لہٰذا سالک کے دل کا باطنی لطیفہ اس ذکر کو خواب اور مراقبے کے اندر فوراً اختیار کر لیتا ہے اور دل ذکر اللہ سے گویا ہو جاتا ہے۔ سو اس حدیث میں عرش کے نیچے جس پرندے کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد لطیفۂ روح ہے۔

جب دل کا یہ باطنی لطیفہ ایک دفعہ کہے یَا اَللّٰہ تو ظاہری زبان سے ستر ہزار بار اَللّٰہ کہنے کے برابر درجہ اور ثواب رکھتا ہے۔ اور اسی طرح اگر لطیفۂ روح ایک دفعہ کہے یَا اَللّٰہ تو وہ

ستر ہزار دفعہ لطیفۂ دل کے اَللّٰہ کہنے کے برابر درجہ اور ثواب رکھتا ہے۔ اس حدیث میں روح کو ایسے پرندے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے ستر ہزار سر ہیں اور ہر سر میں ستر ہزار زبانیں ہیں۔ سو روح کے اس مرغ لاہوتی کے ذکر کی صحیح مقدار کا اندازہ ظاہری زبان کے مقابلے میں کس خوبی سے اس حدیث کے اندر دکھایا گیا ہے کہ یہ مرغ ہزار داستان ظاہری زبان کے مقابلے میں ستر ہزار زبان سے ذکر کرتا ہے یعنی مادی زبان کے مقابلے میں لطیفۂ قلب کے ذکر کا درجہ اور ثواب ستر ہزار گنا ہے۔ اور لطیفۂ قلب کی زبان کی نسبت لطیفۂ روح کے ذکر کا درجہ ستر ہزار گنا ہے۔ غور کا مقام ہے کہ ظاہری ذکر اور قلب اور روح کے ذکر کے درمیان کس طرح اس حدیث میں نسبت قائم کی گئی ہے۔ بعض کور چشم نفسانی لوگ آیات اور احادیث کے اندر اس قسم کے استعاروں اور مثالوں کو مبالغے اور ڈھکوسلے خیال کرتے ہیں اور ان پر تمسخر اور استہزا کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے پاک اور جامع کلام حق نظام کو بھلا مادی عقل والے کیا جانیں۔ جس سعادت مند کو اس آبِ حیات کا ایک قطرہ نصیب ہوا وہ عمر بھر اس کے اشتیاق میں روتا رہتا ہے۔

یا رب[1] چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

(حافظؔ)

اس قسم کی ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی مومن ذکر کرتے کرتے سو جاتا ہے تو عرش کے نیچے ایک ستون ہے وہ ہلتا اور حرکت کرتا ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کے عرشِ اعظم کو جنبش ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ تک اس ذاکر کی فریاد اور ندا پہنچ جاتی ہے اور اس کی دعا اور التجا اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ مقدس میں قبول ہو جاتی ہے۔ سو اس ستون سے بھی دل کا نوری ستون مراد ہے۔ جس کا ایک مکانی اور مادی سرا انسان کے اندر لگا ہوا ہے اور دوسرا باطنی سرا عرشِ معلّٰے سے ٹکراتا ہے۔ غرض جب لطیفۂ نفس کا تخمِ باطنی سرسبز ہو کر لطیفۂ قلب کا شجرۃ النور بن جاتا ہے تو وہ تخمِ نفس کے مانند ستر ہزار کیا بلکہ بے شمار پھل ایک ہی فصل میں لاتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے انس کی نسیم دل کے شجرِ طیبہ پر چلتی ہے تو شجرِ دل کا ہر پتہ، پھول اور پھل

---

[1] الٰہی! محبت بھی کس قسم کا چشمہ ہے کہ میں نے اس سے ایک قطرہ پیا اور دریا کے برابر روتا پڑا۔

اس سے حرکت میں آتے ہیں۔ اور ذکر اللہ سے گویا ہو جاتے ہیں۔

دل ایک بہت وسیع اور عظمت والی چیز ہے۔ جس وقت دل ذکر سے حرکت میں آتا ہے اور ذکر سے گویا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عرشِ معلّٰے کو اس سے جنبش اور حرکت ہوتی ہے اور حاملانِ عرش و سُکانِ عرش غرض عرشِ معلّٰے کے سب فرشتے حیرت میں آ جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس بندے کی بابت فرشتوں کے سامنے فخر و مباہات کے طور پر فرماتے ہیں کہ "آؤ اے ملائکہ! میرے خاکی بندے کے ذکر کی شان اور عظمت کا نظارا کرو۔ یہ بھی میرے ان خاکی پتلوں میں سے ایک ہے، جن کی پیدائش کے وقت تم نے بطور اعتراض کہا تھا کہ ان کی پیدائش کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تیری حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس کے لیے کافی ہیں۔" اس وقت اہلِ آسمان رشک سے کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی اس طرح خاکی انسان ہو کر اللہ تعالیٰ کو اس طرح یاد کرتے۔

آسماں[1] سجدہ کند پیشِ زمینے کہ برو
یک دو کس یک دو زماں بہرِ خدا بنشینند

دل محض گوشت کا یہ گاؤ دم لوتھڑا نہیں ہے جو سینے کے اندر بائیں طرف لٹک رہا ہے اور خون کو بدن میں دم بدم دھکیلتا اور بھیجتا ہے۔ یہ تو عالمِ شہادت میں اس نوری غیبی لطیفۂ قلب کا ایک مادی مسکن ہے۔ جس طرح تمام عنصری وجود کی زندگی کا اس دل کے لوتھڑے اور اس کے فعل و عمل پر انحصار ہے اسی طرح باطنی وجود کا اس نوری قندیل پر انحصار ہے۔ جس کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِىْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّىٌّ (النور ۲۴ : ۳۵)۔ اگر تمام روئے زمین کے لوگوں کے بدنی اعمال کو یکجا کیا جائے تو وہ ذاکرِ قلبی کے ایک دفعہ کے ذکر کے ثواب کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس واسطے کہا گیا ہے۔ تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ۔ یعنی ذاکرِ قلبی کے ایک دم کا صحیح فکر تمام جن و انس کی عبادت سے بہتر ہے۔

دِل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

(رومیؒ)

[1] آسمان اس زمین کے آگے سر بسجود ہوتا ہے کہ جس پر ایک دو اللہ والے رضائے الٰہی کی خاطر چند لمحے بیٹھے ہوں۔

ترجمہ: اپنے دل کو حاصل کر کیوں کہ یہی حج اکبر ہے اور ہزاروں کعبوں سے ایک دل بہتر ہے۔

یہ ہمارے پیر و پیشوا اور روحانی مربی حضرت سلطان العارفین قدس سرّہ العزیز کا ارشادِ گرامی ہے کہ اگر دل ایک دفعہ کہے یَااَللّٰہ تو اس کا ثواب ظاہری زبان سے ستر ہزار دفعہ ختم قرآن شریف کے برابر ہے۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر لطیفۂ روح ایک دفعہ کہے یَااَللّٰہ تو ستر ہزار دفعہ لطیفۂ قلب کے یَااَللّٰہ کہنے کے برابر درجہ رکھتا ہے۔ اس کی مزید توجیہ اور فلاسفی یہ ہے کہ تمام قرآنِ مجید کا نور اسم اللّٰہ ذات میں اس طرح مندرج ہے جس طرح پھل کے اندر درخت ہوتا ہے۔ سو ظاہر زبان سے ستر ہزار دفعہ ختم قرآن شریف یا ستر ہزار دفعہ یَااَللّٰہ کہنے کے ایک ہی معنی ہوئے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ انسان کے وجود میں لطیفۂ دل اس طرح جاری اور ساری ہے کہ جس طرح دودھ کے اندر مکھن ہے اور جس طرح مکھن کے ذرات دودھ کے ہر ذرے کے اندر موجود ہیں۔ اس طرح لطیفۂ دل انسانی وجود کے رگ و ریشے، خون، گوشت اور مغز میں شامل اور محیط ہے۔ جب ذاکر کا دل ذکر اللہ سے گویا ہو جاتا ہے اور وہ ذکر کبھی تمام بدن میں سرایت کر جاتا ہے تو بدن کا ذرہ ذرہ اور ذاکر کے جسم پر ہر بال حرکت میں آ کر صاف طور پر حروف اور بلند صوت سے جہراً اَللّٰہ اَللّٰہ پکارنے لگ جاتا ہے۔ جسے ذاکر ہوش اور بیداری کی حالت میں کانوں سے سنتا ہے۔ خواب و خیال اور وہم و گمان کو اس میں مطلق دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے ذکرِ قلبی میں وجود کے تمام اعضاء اور ذرات اور بالوں کی شمولیت کے سبب یہ ذکر ظاہری زبان کے ذکر سے درجے اور ثواب میں ستر ہزار گنا ہوتا ہے۔

ناظرین کے مزید اطمینانِ خاطر کے لیے یہ فقیر اپنا واقعہ بیان کرتا ہے اور یہ بھی عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ''عرفان'' کے پہلے ایڈیشن میں اس فقیرؔ نے اپنے چند ایک روحانی واقعات اور غیبی مشاہدات ڈرتے ڈرتے درج کتاب کیے تھے کہ مبادا لوگ اسے میری خود نمائی پر محمول نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ شاہدِ حال ہے کہ میں اس معاملے میں نہ جھوٹا ہوں اور نہ فریبی اور نہ فریب خوردہ ہوں۔ بلکہ یہاں محض اس غرض سے تھوڑے سے اپنے سابق واقعات اور کچھ عینی مشاہدات اس کتاب میں بطور مشتے ؔنمونہ از خروارے بیان کر رہا ہوں کہ

شاید ان کا مطالعہ ناظرین کے لیے موجب ازدیادِ یقین اور باعثِ اطمینانِ خاطر ہو۔
اس فقیرؒ کا پہلے پہل جب ذکرِ قلبی جاری ہوا تو اس کی کیفیت یوں تھی کہ یہ فقیرؒ تصورِ اسم اللہ میں ایک دن مصروف تھا کہ یکایک ذکر کی ایک گونہ غیبی عظمت اور ہیبت اس فقیرؒ پر طاری ہو گئی۔ اس مستولی عظمت اور ہیبت کے اندر اس فقیرؒ کو تام استغراق اور مکمل غیبت حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے جسم کے تمام بال اپنی جڑ کے اردگرد چمڑے کے ساتھ ساتھ اس طرح حرکت کر رہے ہیں اور چکر کاٹ رہے ہیں جس طرح سخت آندھی اور تند طوفانِ باد کے وقت زمین پر اگی ہوئی گھاس کی حالت ہوا کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی ہر ہر بال بلند آواز اور صاف وصریح صوت کے ساتھ جہراً اَللّٰہ ھُوْ اَللّٰہ ھُوْ پکار رہے ہیں۔ میں پوری بیداری اور مکمل ہوش کی حالت میں اپنے جسم کے تمام بالوں کا ذوقِ تجلی کے وقت یہ عجیب وغریب حرکت اور فطرتی رقص دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے کانوں سے ان کے ذکر کا نہایت پر لطف غیر معمولی شور وغل سن رہا تھا۔ خواب وخیال اور وہم وگمان کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ بلکہ ذکرِ قلبی اور سلطانی ذکر کی یہ ایک ٹھوس حقیقت تھی جو اس فقیرؒ نے اپنے کانوں سے سنی اور اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اس کی حقیقی لذت اور اصلی کیفیت کا اندازہ حیطۂ تحریر اور دائرۂ تقریر سے بالکل باہر ہے۔ ظاہری عقل اور مادی دماغ اس کے سمجھنے سے قاصر ہے ؏

ذوقِ ایں بادہ نیابی بخدا تا نچشی

ترجمہ: خدا کی قسم اس شراب کی لذت تو اس وقت تک نہیں پا سکے گا جب تک کہ اسے چکھ نہ لے۔

غرض قلب کو اگر قلزمِ توحید کہیں تو بجا ہے اور اگر قاف قدس کہیں تو روا ہے۔ کیوں کہ لطفِ الٰہی سے جب لطیفۂ قلب زندہ ہو جاتا ہے اور اپنی غیبی اور نوری عظمت کے ساتھ متجلی ہو کر ذکر اللہ سے گویا ہو جاتا ہے تو فرشتے عش عش کرنے لگ جاتے ہیں اور ذاکرِ قلبی کو اس قدر عظمت اور وسعت حاصل ہو جاتی ہے کہ چودہ طبق اسے رائی کے دانے کے برابر نظر آتے ہیں۔

چرخ است حلقۂ درِ دولت سرائے دل عرش است پردۂ حرمِ کبریائے دِل

دل آنچناں کہ ہست اگر جلوہ گر شود ۔۔۔ نہ اطلسِ سپہر بگردِ قبائے دِل

گرگے کہ زیرِ پوست بخونِ تو تشنہ است ۔۔۔ یوسفؑ شود ز پرتو نورِ صفائے دِل

ما خود چہ ذرّہ ایم کہ نُہ ۹ محمل سپہر ۔۔۔ رقص الجمل کنند زبانگِ درائے دِل

دست از کتاب خانۂ افرنگیاں بشو ۔۔۔ صد شہرِ عقل گردِ سرِ روستائے دِل

ترجمہ:۔

۱۔ آسمان دِل کے دولت سرائے کا ایک حلقہ یعنی کنڈی ہے اور عرش دل کے حرم سرائے کا ایک پردہ ہے۔

۲۔ دِل اگر اپنی اصلی حالت میں جلوہ گر ہو جائے تو آسمان کے نو اطلس اس کی قبا (کوٹ) پر لپٹ جائیں۔

۳۔ وہ بھیڑیا (نفس) جو اندرونی طور پر تیرے خون کا پیاسا ہے دِل کے مصفا نور کے عکس سے یوسفؑ بن جائے گا۔

۴۔ ہم خود تو ایک ذرہ کے برابر ہیں۔ آسمان کے نو کجاوے بھی دل کی گھنٹی کی آواز پر ناچتے ہیں۔

۵۔ انگریزوں کے کتب خانہ سے ہاتھ دھو ڈال یعنی اس سے کچھ دانائی کی امید نہ رکھ۔ عقل کے سینکڑوں شہر دِل کے دہقان پر قربان جائیں۔

یاد رہے آنکھوں کا ذکر یعنی تصور اسم اللہ ذات افضل الاذکار ہے اور اسی پر سارے سلوک اور معرفت کا دار و مدار ہے۔ کیونکہ مخلوق کی پیدائش اور آفرینش کا مقصد اور زندگی کی اصلی غرض و غایت محض اللہ تعالیٰ کی عبادت، معرفت، قرب اور دیدار ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذّٰریٰت ۵۱:۵۶) ۔ اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ ۔ کیوں کہ عبادت کا مقصد اور غرض معرفت ہے۔ حدیث: مَاعَبَدْ نَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ۔ حدیث قدسی: کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا فَاَرَدْتُّ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ ترجمہ: ’’(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا سو میں نے ارادہ کیا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پس میں نے اپنی پہچان کے لیے مخلوق کو پیدا کیا۔‘‘ سو انسان کی پیدائش اور آفرینش کی اصلی غرض و غایت اللہ کی معرفت اور پہچان ٹھہری۔ اور کسی چیز کی معرفت اور

پہچان کا سب سے عمدہ اور صحیح آلہ اور ذریعہ آنکھ اور بصارت ہے اور دیکھنے سے کسی چیز کی پوری پہچان ہو جایا کرتی ہے۔ دیگر حواس اور اعضا شناخت کے ناقص اور کمزور آلے ہیں۔ اس لیے آنکھ کا ذکر سب اذکار سے افضل، اعلیٰ اور اقرب الی اللہ ہے۔ ذکرِ عین عین الاذکار ہے اور صرف یہی ذریعۂ معرفت اور وسیلۂ دیدار پروردگار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو اکثر ذکر یا بصائر (آنکھوں) سے تعبیر کیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: قَدْ جَآءَ کُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ (الانعام ۶: ۱۰۴)۔ قولہ تعالیٰ: ھٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ (الاعراف ۷: ۲۰۳)۔ قولہ تعالیٰ: ھٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (الجاثیۃ ۴۵: ۲۰)۔ یعنی یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا ذکر تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمنزلۂ آنکھوں کے ہے اور ذکر سے اعراض کو اندھا پن قرار دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴)۔ پس معلوم ہوا کہ ذکرِ عین عین ہے۔ سو باطنی آنکھ یعنی تصور اور تفکر سے اسم اللہ ذات کو اپنے اندر نقش اور مرقوم کرنے سے ذکر انسان کے اصلی مغز اور باطنی شخصیت پر اثر پذیر ہو کر اسے زندہ اور بیدار کرتا ہے اور اس طرح گویا ذکر اپنے حقیقی مقام پر مذکور ہوتا ہے اور دوسرے طریقوں پر ذکر کرنے سے ذاکر اپنے اصلی مقصد اور حقیقی غرض سے بہت دور ہوتا ہے۔ غرض ذکر کا اصلی مقصد باطنی آنکھیں پیدا کرنا ہے اور جب سالک کی باطنی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو اس کی معرفت صحیح ہو جاتی ہے اور وہ عارف کامل ہو جاتا ہے۔ دیگر حواس والوں پر ہاتھی اور اندھوں والا قصہ صادق آتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک جگہ چند اندھے بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں وہاں ایک ہاتھی آ نکلا۔ ان اندھوں کو ہاتھی کی شناخت کا اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ سب اندھے ہاتھی کے اردگرد جمع ہو کر اسے ٹٹولنے لگے۔ ان میں سے جس اندھے کا ہاتھ ہاتھی کی کمر پر جا لگا وہ پکار اٹھا کہ ہاتھی تو ایک دیوار کی مانند ہے۔ دوسرا ہاتھی کی ٹانگ پر ہاتھ رکھ کر پکارا کہ نہیں تم غلط کہتے ہو ہاتھی تو ستون اور تھم کی طرح ہے۔ تیسرے نے ہاتھی کا کان چھو کر کہا کہ نہیں تم دونوں غلط بتا رہے ہو ہاتھی ایک بڑے پنکھے سے مشابہ ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر ایک اندھے نے اپنی ناقص پہچان کے سبب ایک غلط رائے قائم کر کے دوسرے اندھوں کو جھٹلایا اور ہاتھی کی شناخت ایک جھگڑے اور نزاع کی صورت اختیار کر گئی۔ بعینہٖ اسی طرح دنیا کے تمام باطل ادیان کے حق

سے اعراض اور غفلت کی اصلی وجہ باطنی کور چشمی ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرآئیل ۱۷: ۷۲)۔ یعنی "جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں اندھا اٹھے گا۔"

ہر کہ زشت[1] است ہماں زشت بعقبیٰ خیزد
کور از خواب محال است کہ بینا خیزد

قولہٗ تعالیٰ: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ (الحج ۲۲: ۴۶)۔ ترجمہ: "کیونکہ غفلت سے ظاہر آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دِل جو سینے کے اندر موجود ہے اندھا ہو جاتا ہے۔"

جنگِ ہفتاد[2] و دو مِلّت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(حافظ)

تمام دین کی اصل مراد اور قرآن کے نزول کی حقیقی غرض اور مذہب کا اصلی منشأ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور شناخت ہے اور معرفت کا اصلی آلہ اور ذریعہ باطنی آنکھ ہے جس کی بینائی، روشنی اور نور ذکر اللہ ہے اور تمام اذکار کا جامع ذکر اسم اللہ ذات ہے اور ذکر کا اعلیٰ اور اصلی مقام آنکھ ہے اور اس کا بہترین طریقہ اسم اللہ ذات کو تصور اور تفکر سے اپنے اندر نقش اور مرقوم کرنا ہے۔ اس کے علاوہ باقی جس قدر دینی اعمال اور مذہبی اشغال ہیں اس سے کم تر اور ادنےٰ درجے کے ہیں اور ان اشغال میں سالک کو کوئی نہ کوئی رجعت اور رکاوٹ لاحق ہو جاتی ہے۔ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ (الانعام ۶: ۹۱)۔

انشراحِ صدر اور دل کی زندگی اور اللہ تعالیٰ کے قرب، مشاہدہ، وصل اور دیدار کا راستہ بغیر تصور اسم اللہ ذات کے ہرگز نہیں کھلتا۔ اگرچہ طالب تمام عمر سخت ریاضت اور مجاہدہ کرتا پھرے اور مشقت سے بال کی طرح باریک ہو جائے لیکن دل ویسا مردہ اور تاریک رہتا

---

[1] جو اس دنیا میں بدعمل ہے وہ آخرت میں بھی بدانجام اٹھے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ اندھا خواب سے بینا ہو کر اٹھے۔
[2] بہتر (۷۲) فرقوں کو اپنی جنگِ اختلاف میں معذور سمجھ۔ کیونکہ انھوں نے چہرہ حقیقت دیکھا ہی نہیں۔ تو انھوں نے افسانہ طرازی کی راہ اختیار کی۔

ہے۔ کیونکہ ظاہری عبادت اور جسمانی اعمال سے نفس کا تزکیہ تو ہو جاتا ہے لیکن دل کی زندگی کا راستہ ہی اور ہے اور اس کا الگ طور ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیونکر جانیں کہ اسم اللہ ہی ذاتی اسم ہے اور اللہ تعالیٰ کے باقی سب اسما صفاتی ہیں اور یہ اسم سب اسما کا جامع اور اسم اعظم ہے۔ اس اسم کی اہمیت، جامعیت اور ذاتیت تو ہم پیچھے بہت کچھ بیان کر آئے ہیں۔ اب ہم اس کی لفظی جامعیت، اہمیت اور ذاتیت کو بطور مشتے نمونہ از خروارے بیان کرتے ہیں تا کہ ناظرین کے لیے باعثِ تسکینِ خاطر ہو۔ جب ہم لفظ اللہ کے تلفظ کی طرف خیال کرتے ہیں تو یہ چار حروف ا، لؔ، لؔ اور ہ سے مرکب ہے۔ اور اگر اس کا پہلا حرف الف دور کر دیا جائے تو تین حروف لؔ، لؔ اور ہ رہ جاتا ہے اور اس کے معنی نہیں بگڑتے بلکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے واسطے اور ذریعے کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اگر اس کا دوسرا حرف لام دور کر دیں تو لفظ لـــہ رہ جاتا ہے جو ضمیر اسم اللہ ذات کی نسبت پر دال ہے اور اگر دوسرا لام دور کر دیا جائے تو ھُو رہ جاتا ہے جس میں ذات کی طرف اشارہ ہے۔ غرض ہر حالت میں یہ اسم غیر متبدل اور قائم بالمعنی رہتا ہے اور اس کی چاروں حالتیں اللہ، لِلّٰہ، لہٗ، ھُو بذاتِ خود اسماء العظام ہیں اور ہر ایک اسم سلوک کے چاروں مقامات شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت اور چاروں عوالم ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت کے کشف اور طے کے لیے بمنزلۂ کلید اور کنجی کے ہے۔ اور ان چاروں اسما کے ذکر اور تصور سے سالک جملہ حجابات اور منازل و مقامات سے گذر کر اللہ تعالیٰ سے یکتا ہو جاتا ہے۔

چار بودم سہ شُدم اکنوں دوم
از دوئی بگذ شتم و یکتا شدم
(آتش)

سو سوائے اس اسم کے یہ بات اور کسی اسم میں نہیں پائی جاتی۔ یعنی اس کے ہر حرف کے علیحدہ کرنے سے اس کی الوہیت کے معنی نہیں بگڑتے اور ہر حرف کے الگ کرنے سے اس کی ایک علیحدہ صفت سلوک کے ایک خاص مقام کے لیے مخصوص رہتی ہے۔ یعنی اسم اللہ لطیفۂ نفس کے لیے مخصوص ہے اور اس کا عالم ناسوت، مقام شریعت اور سیر اِلَی اللّٰہ

ہے۔ دوم اسم لِلّٰہ لطیفۂ قلب کے لیے مخصوص ہے اور مقام اس کا طریقت، عالم ملکوت اور سیر لِلّٰہ ہے۔ سوم اسم لہ کا لطیفہ روح ہے اور مقام حقیقت، عالم اس کا جبروت اور سیر علیٰ اللہ ہے۔ چوتھا اسم ھُوْ ہے جس کا لطیفہ سِرّ ہے اور مقام اس کا معرفت اور عالم لاہوت اور سیر مَعَ اللہ ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

اس فن کے ماہرین اور مشائخین متقدمین نے سلوکِ باطنی کے سات لطائف قائم کیے ہیں اور ہر لطیفے کا علیحدہ عالم، الگ مقام، جُدا حال اور مختلف ذکر وغیرہ مقرر کیے ہیں۔ ذیل میں ہم وہ نقشہ درج کرتے ہیں:

| نام مقام | نام لطیفہ | عالم | سیر | حال | مقام | رنگ | ذکر | اسم تصور |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| مقامِ اوّل | نفس | ناسُوت | الیٰ اللہ | میل | شریعت | نیلا | لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ | اللہ |
| مقامِ دوم | قلب | ملکوت | لِلّٰہ | محبّت | طریقت | زرد | لا الٰہ الا اللہ | لِلّٰہ |
| مقامِ سوم | رُوح | جبرُوت یا حقیقتِ محمدیؐ | علیٰ اللہ | عشق | حقیقت | سُرخ | یا اللہ | لہ |
| مقامِ چہارم | سِرّ | لاہُوت | مَعَ اللہ | وصل | معرفت | سفید | یا حیّ یا قیّوم | ھُو |
| مقامِ پنجم | خفی | یاہُوت | فِی اللہ | فنا | مقامِ منتہی | سبز | یا واحد | محمدؐ |
| مقامِ ششم | اَخفیٰ | یاہُوت | عن اللہ | حیرت | بازشریعت | بنفشئی | یا احد | فقر |
| مقامِ ہفتم | اَنا | ھُوِیّت | بِااللہ | بقا | مقام جمع الجمع | بے رنگ | یا ھو | اللہ محمد |

اور نیز اگر اسی اسم اللّٰہ کے بیچ میں سے ایک لام کو علیحدہ کر دیا جائے تو الہ رہ جاتا ہے اور یہ بھی اسم الٰہی ہے اور اس اسم کی مختلف شکلیں اور اجزاء ھا، لاہ سب مختلف زبانوں اور زمانوں میں اسمائے الٰہی رہے ہیں۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کتب سابقہ میں مذکور ہے کہ آپ کے صلیب پر آخری الفاظ یہ تھے: اِھْلِیْ اِھْلِیْ مَاسَبَقْتَنِیْ۔ یعنی اے اللہ! اے اللہ! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ چنانچہ اس زمانے میں لفظ اھل اللہ کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا اور اس کے تینوں حروف الف لام اور ہ کے اسرار کو اگر تفصیل وار بیان کیا جائے تو ایک الگ دفتر درکار ہوگا۔ غرض اس کے الف میں ہزار اسرار ہیں اور اس کے لام میں الٓمّٓ اور کتاب لَارَیْبَ اور عالمِ غیب کے انوار ہیں۔ اور ہ میں ہُوِیَّتِ ذات اور ہدایتِ قرب دیدار ہے۔ دوسری وجہ اس کے ذاتی اسم ہونے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر اسم کسی خاص صفت سے موصوف ہے اور ہر اسم کسی خاص صفت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا دوسری صفت کی اس میں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ ہر اسم سے اسی خاص صفت کی دعا کی جاتی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ یَارَحِیْمُ مجھ پر رحم کر یا اے رَزَّاقُ مجھے رزق دے۔ یا اے مُعِزُّ مجھے عزت دے یا اے غَفَّارُ مجھے بخش دے۔ یا اے عَلِیْمُ مجھے علم عطا کرو غیرہ۔ اور کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اے علیم مجھے رزق دے۔ یا اے رزاق مجھے علم دے۔ مگر اسم اللہ جملہ صفاتِ الٰہی کا جامع ہے اور ہر صفت پر دال ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کی اعانت اس کے ذریعے طلب کی جا سکتی ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ۝ (یوسف ۱۲: ۱۸)۔ یعنی "اللہ سے ہر قسم کی استعانت جس سے تم اسے موصوف کرو، طلب کی جا سکتی ہے۔" یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اے اللہ مجھے علم دے، اے اللہ مجھے رزق عطا کر، اے اللہ مجھے بخش دے وغیرہ۔ اور قرآن مجید میں یہ اسم ہر صفاتی اسم کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ الرَّحِیْمُ "۔ وَھُوَالْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ" حَکِیْمٌ ۔ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ" عَلِیْمٌ"۔ ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِیُٔ الْمُصَوِّرُ ۔ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ" م بَصِیْرٌ"۔ یعنی اسم اللہ ذات فرداً فرداً بھی ہر صفت کا حامل ہے اور مجموعی طور پر مختلف اسماء کا بھی مظہر ہے اور یہ اس کے ذاتی ہونے کی تین دلیل ہے۔ سوم دلیل یہ ہے کہ عرب لوگ ہر اسم کا اشتقاق کرتے ہیں۔ لیکن اس اسم کا اشتقاق نہیں کیا جاتا۔ نہ یہ کسی اسم

سے مشتق ہے اور نہ کوئی اسم اس سے مشتق ہے۔ چہارم وجہ یہ ہے کہ جملہ اسلامی ارکان کی بنا اسی اسم پر ہے۔ چنانچہ اسی اسم کے اقرار سے انسان مسلمان اور اس کی تصدیق سے اہلِ ایمان ہوتا ہے۔ یعنی کلمۂ طیب لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ میں اسی اسمِ پاک کا اقرار اور اثبات ہے اور جملہ کلماتِ طیبات مثلاً کلمۂ شہادت، کلمۂ تمجید، کلمۂ توحید اور کلمہ طیب میں یہی اسم مذکور ہے۔ اور جملہ قرآنی سورتیں اسی اسم یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے شروع ہوتی ہیں اور ہر کام کے شروع کرنے میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھنے کی برکت اسی اسم سے ہے۔ اور نماز شروع کرتے وقت تکبیرِ تحریمہ یعنی اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہنے میں یہی اسم یاد کیا جاتا ہے۔ اور کفار سے جدال اور جہاد کے وقت بھی اَللّٰـهُ اَكْبَرُ کہہ کر اسی اسم سے استعانت طلب کی جاتی ہے اور بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں یہی اسم پڑھا جاتا ہے۔ اور نماز کی اذان میں اسی اسم کی منادی کی جاتی ہے۔ اور سورۃ فاتحہ، آیت الکرسی اور سورۂ اخلاص اور دیگر قرآنی سورتوں کو فضیلت اسی اسم کے طفیل حاصل ہے۔ غرض جملہ آیاتِ بینات اور کلماتِ طیبات کو قدر و منزلت اور عزت اور عظمت اسی اسم کی وجہ سے حاصل ہے اور یہی ذاتی اسم اور اِسم اعظم ہے۔

اگلے زمانے کے ہر نبی اور اس کی امت کو ایک صفاتی اسم عطا کیا گیا تھا جو ان کی صفاتی استعداد کے موافق ان کے لیے ذاتی اسم کا حکم رکھتا تھا۔ اور وہی اسم ان کے لیے مبداء فیوضات و کمالات تھا۔ اور اسی اسم کا طے اور کشفِ انواران کا منتہائے معراج تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر نبی اور اس کی امت کے ہر ولی کی طرف دعا اور التجا کے وقت اسی اسم سے متجلی ہوتا تھا۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمارے آقائے نامدار جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو آپ ﷺ کی فطرت اور طینت کو نورِ آبِ حیاتِ ذات سے گوندھا۔ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المآئدۃ ۵: ۳)۔ آپ ﷺ کو تاجِ دینِ مکمل پہنایا اور خلعتِ اتمامِ نعمت اور ردائے رضائے ابدی سے سرفراز فرمایا۔ اور آپ ﷺ کا نور چونکہ ذاتی تھا اس لیے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو ذاتی اسم عطا کیا گیا۔ نیز آپ ﷺ کی بعثت نے چونکہ سلسلۂ نبوت کو ختم کیا اور آپ ﷺ خاتم النبیین ٹھہرے اور آپ ﷺ کا دین جملہ ادیانِ ماضیہ کے لیے اور

آپ ﷺ کی کتاب جملہ کتب سماویہ کی ناسخ آئی۔ اسی طرح آپ ﷺ پر آفتاب اسم اللہ ذات کے ظہور سے تمام نجوم اسمائے افعال اور جملہ اقمار اسمائے صفات معدوم و مفقود ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف باقی تمام اسمائے ادیانِ ماضیہ کے راستے مسدود ہو گئے۔ حتیٰ کہ وہ زبانیں بھی دنیا سے ناپید اور معدوم کر دی گئیں اور ان تمام اسما سے دعاؤں اور التجاؤں کے وقت جو قبولیت اور تاثیر ہوا کرتی تھی، وہ یک قلم موقوف ہو گئی۔ نہیں دیکھتے کہ دنیا میں جس وقت نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے تو اگلے بادشاہوں کے نام کے تمام سکے، اسٹامپ اور ٹکٹیں وغیرہ منسوخ ہو جاتی ہیں اور اسی آخری بادشاہ کے نام کے سکے وغیرہ رائج ہو جاتے ہیں۔ گویہ اسم قدیم زبانوں اور اگلے زمانوں میں بھی اپنی جزی اور بگڑی ہوئی صورت میں موجود تھا اور آفتابِ عالم تاب کی طرح افق عدم سے آفاق وجود کو اپنی غیبی کرنوں سے منور کر رہا تھا لیکن اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں اس وقت جلوہ گر ہوا اور برقِ انوارِ ذات سے منور ہوا جس وقت آپ ﷺ کے وجودِ باجود نے لامکانِ قدم سے مکانِ حدوث میں قدم رکھا۔ جیسا کہ ہر زمانے میں خانۂ کعبہ کی زمین ابتدائے آفرینش سے کسی نہ کسی صورت میں مکرم و معظم چلی آ رہی تھی۔ لیکن آنحضرت صلعم کے زمانے میں اس کا شرف اور تقدس اوجِ کمال پر پہنچا۔ اسی طرح دین اور ہر مذہب کا ہر شعبہ آپ ﷺ کے عہد میں انتہائے عروج پر پہنچا۔

انسانی وجود کے برتن اور ظرف میں حق تعالیٰ کے انوار میں سے اتنا کچھ آتا ہے جس قدر اس میں وسعت اور استعداد ہوتی ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاط (البقرۃ ۲: ۲۸۶)۔ تمام انبیائے ماضیہ کی سرشت میں اسمائے صفات کی قابلیت اور استعداد تھی اور ان کے انوار صفاتی تھے۔ لہٰذا انہیں صفاتی اسماء کے انوار اور تجلیات کی برداشت اور طاقت تھی۔ اور وہ ذاتی نور کی برداشت اور تحمل کی استعداد اور توفیق نہیں رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نور دیدار اور لقا کے وقت جلوہ گر ہوا کرتا ہے۔ اور جس طرح آفتاب اور سورج کے طلوع کے وقت چاند اور تاروں کی روشنی معدوم ہو جاتی ہے اسی طرح حضرتِ ذات کے رویت اور جلوۂ لقا کے وقت نجومِ اسمائے افعال اور اقمارِ صفات کے انوار گم اور مفقود ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی یا رسول کو

دیدار اور رویت کا مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ اگرچہ بعض نے رویتِ الٰہی کی آرزو کی بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی استدعا کے مطابق ان پر تھوڑی سی تجلی ڈالی بھی ہے۔ مگر نورِ ذات کی تجلی کے وقت ان کے ہوش و حواس تو کیا ان کا وجود بھی قائم نہیں رہ سکا۔ لیکن آں حضرت صلعم کا نور چونکہ ذاتی تھا اور آپ ﷺ کی آنکھیں سُرمۂ مازاغ کے ذاتی نور سے سرگیں تھیں آپ ﷺ نے اسم اللہ ذات کے برق براق پر سوار ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذاتی جلوے دیکھے اور ذاتی لقا سے مشرف ہوئے اور صرف آپ ﷺ ہی معراج کی رات اسم اللہ ذات کی عینک لگا کر اللہ تعالیٰ کی ذاتی آیات کبریٰ اور ذاتی علوم اور معارف سے مشرف اور ممتاز ہوئے۔

موسیٰؑ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات      تو عین ذات مے نگری در تبسمی

..........................○..........................

# نورِ اسم اللہ ذات کا ظہور

جس طرح انسان کا بچپن دینِ فطرت یعنی اسلام کے موافق ہوتا ہے اسی طرح زمانے کا بچپن یعنی پہلا زمانہ مذہب اور روحانیت کے بہت موافق تھا۔ اس لیے تمام پیغمبر اس زمانے میں مبعوث ہوئے اور اولیاء اللہ اور روحانی لوگ بکثرت پیدا ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ سلف صالحین قدرتی اور فطرتی طور پر مذہب اور روحانیت کے قائل اور اس کی طرف دل وجان سے مائل تھے۔ جوں جوں انسان بڑا ہوتا ہے شیطان اس کی دینی استعداد اور اسلامی فطرت کو بگاڑنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ بلوغ تک اس کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اسی طرح جوں جوں زمانہ گذرتا گیا شیطان سامری کی طرح سیم وزر کے بچھڑے کو طرح طرح کے زیب وزینت دے کر لوگوں کو اس کے سحرِ محبت میں مسحور اور محصور کرتا رہا۔ اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور محبت ان کے دل ودماغ سے کافور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ آج زمانہ گو مادی طور پر مہذب اور مزین معلوم ہوتا ہے لیکن اخلاقی مذہبی اور روحانی لحاظ سے تقریباً مسخ ہو گیا ہے اور حیوانی اور طبعی زندگی بسر کر رہا ہے۔ دین اور مذہب کے فطرتی چیز ہونے کی اس سے زیادہ بین دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ بعض ایسے جہالت اور تاریکی کے زمانوں میں جب کہ پیغمبر مبعوث نہیں ہوئے تھے اور لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اسماء سے بالکل بے خبر تھے لوگوں کو اپنے خالق مالک اور معبودِ برحق کا خیال خود بخود فطرتی طور پر کھٹکتا تھا۔ لیکن بسبب کورچشمی اور لاعلمی کے لوگ اس اسم کے خاص محل یعنی مسٹے سے بھٹک جاتے تھے۔ چونکہ ان کے پاس بصائر اور نورِ ہدایت نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ اندھوں کی طرح اندھیرے کے اندر اس کی جستجو میں ہاتھ پاؤں مارتے تھے۔ اور جس چیز سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کی بو پاتے تھے اس کے سامنے جھکتے، اسے پوجتے اور اسے اپنا معبود بنا لیتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کی بعض اقوام نے اجرامِ فلکی مثلاً سورج، چاند اور ستارے پوجے۔ بعض نے دریا، پہاڑ اور جنگلی درخت اور پتھروں کے بت تراش کر اپنے معبود بنائے۔ اور بعض نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے آدمیوں اور بادشاہوں کی پرستش شروع کی۔ آج کل بھی افریقہ کی بعض وحشی قومیں جو زمانہ کی دستبرد سے ابھی تک محفوظ ہیں، ایسی موجود ہیں کہ اگر ان کے مذہبی ریکارڈ

کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ ان لوگوں میں آج تک نہ کوئی پیغمبر مبعوث ہوا ہے اور نہ انہیں کسی روحانی راہبر یا مذہبی پیشوا نے دین کی طرف دعوت دی ہے۔ بلکہ انہوں نے آج تک اللہ تعالیٰ کا نام بھی نہیں سنا ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں اپنے خالق مالک اور معبودِ برحق کا خیال اور اعتقاد نہایت محکم اور مضبوط پاتے ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح اسے پوجتے ہیں۔ ان وحشی اور جنگلی لوگوں کی روحانی طاقتیں آج کل کے نام نہاد مہذب اور روشن خیال شہری لوگوں سے بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی سرشت اور فطرت اللہ تعالیٰ کے نام اور ذکر کے خمیر سے تخمر ہے۔

انسان کسی چیز کے دیکھنے اور پہچاننے کے لیے دو طرح کے نور کا محتاج ہوتا ہے: ایک نورِ انفس، دوم نورِ آفاق۔ انفس میں نورِ بصارت اور آفاق میں نورِ نیر وآفتاب وغیرہ سے کسی چیز کو دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح باطن میں بھی سالک دو قسم کے نور کا محتاج ہوتا ہے۔ ایک نورِ بصیرت باطنی جسے نورِ یقین اور نورِ ایمان بھی کہتے ہیں۔ دوم نورِ دعوت و ہدایتِ انبیا و اولیا آفاق ہیں۔ چونکہ سب سے بڑا معدن و مخزنِ انوار جس سے تمام مادی دنیا روشن ہے آفتاب ہے۔ چنانچہ باطنی دنیا کے سب سے بڑے معدنِ انوار ہمارے آقائے نامدار حضرت احمدِ مختار صلعم ہیں اور ہر دو کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک ہی لفظ سراجاً منیرا سے خطاب فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۴۵۔۴۶) ط ترجمہ: "اے میرے نبی ﷺ! ہم نے تم کو شاہد اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلانے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔" دنیا میں اشیا کے لیے یہ ہر دو نور یعنی آنکھیں اور روشنی لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی اگر روشنی نہ ہو تو آنکھیں بے کار ہیں۔ اگر آنکھیں نہ ہوں تو تمام روشن دنیا تاریک ہے۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (یوسف ۱۲: ۱۰۸)۔ ترجمہ: "کہہ دے اے محمد صلعم! یہی میری راہِ اسلام (فطرتی دین) ہے کہ بلاتا ہوں میں اور میرے پیچھے آنے والے اللہ کی طرف لوگوں کو بصیرتِ باطنی کی طفیل۔" جہالت کے بعض تاریک زمانوں میں جب کہ یہ باطنی اور نوری سراج مفقود تھے اس لیے فطری مجبوری کے سبب ٹھوس مادی خدا مثلاً سورج، چاند اور پتھر

وغیرہ لوگوں کے معبود تھے۔ جیسے کوئی شخص جب کسی تاریک مکان میں کسی چیز کی خوشبو پاتا ہے تو وہ اس کی تلاش میں اندھوں کی طرح کبھی ایک چیز پر اور کبھی دوسری چیز پر ہاتھ مارتا ہے۔ یہی حال جہالت کے زمانوں میں بغیر راہبروں اور پیغمبروں کے مخلوق کا تھا۔ چونکہ مخلوق کے اندر اپنے خالق کے اسم کا نور بالقویٰ مستور ہوتا ہے اس لیے وہ ہر زمانے میں اس کی طلب وتلاش میں فطری طور پر بے چین اور مجبور ہوتی ہے۔ اس لیے انسان محبتِ ازلی اور جذباتِ فضلی کے سبب اللہ تعالیٰ کے خیال میں مست اور بے خود ہو کر اس کے شمعِ جمال کی مادی مثالوں اور مثالی اشیا پر مرتا ہے۔ اور جہاں کہیں جماد، نبات، حیوان، انسان اور اجرامِ فلکی میں اس کے جلال و جمال کی بو پاتا ہے وہ اندھوں کی طرح ان سے بغل گیر ہوتا ہے اور اپنے دل کی فطری امنگ ان کی پرستش سے نکالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہالت کے تاریک زمانوں میں لوگ قدرت کے مختلف مظاہر اور مادی اکابر کو اللہ تعالےٰ کے پاک اسما سے موسوم کر کے پوجتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اپنی اندرونی فطری طلب اور تلاش اور اسم اللہ ذات کی قدرتی حرارت اور پیاس نے سورج، چاند اور ستاروں کی طرف ملتفت کیا۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۤلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْۤءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام ۶: ۷۶ - ۷۹)۔

ترجمہ: ''جب ابراہیم علیہ السلام (کے دل) پر اس زمانے کے اصنام اور اجرام پرستی کے ماحول کی رات چھائی اور معبود کے خیال سے اس نے ستارے کی طرف دیکھا تو اس نے (لوگوں کی تقلید میں اپنے دل میں) کہا کہ یہی میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو اس نے کہا کہ میں چھپنے اور غروب ہونے والوں کو الوہیت کے لیے پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد اس نے چاند کو چمکتے دیکھا تو اس نے اپنے دل میں کہا کہ شاید یہی میرا رب ہو۔ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اس نے کہا کہ اگر اس طرح زوال پذیر چیزوں میں سے کسی کو معبود بنایا اور اپنے حقیقی رب نے مجھے اپنی طرف ہدایت نہ کی تو البتہ میں بھی ان اجرام اور اصنام پرستوں

کی طرح گمراہ ہو جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا تو اس نے کہا یہ بہت بڑا ہے۔ یہی میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اس نے کہا کہ اے جاہل قوم میں تمہارے ان سب مخلوق اور فنا پذیر معبودوں سے بیزار ہوں جو تم نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرائے ہیں۔ میرا دل تو اب ایسی عظیم الشان ہستی کی طرف متوجہ ہے۔ جس نے زمین اور آسمان اور مافیہا کو پیدا کیا ہے اور میں نے اسی ایک واحد ذات کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور میں مشرکوں سے نہیں رہا۔'' انسان کے اندر فطری طور پر اپنے خالق کا خیال روزِ ازل سے موجزن ہے اور اس کی طبیعت اور جبلت میں اس کے نام کا نور اور اس کے ذکر کا تخم روزِ اول سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ اندرونی استعداد اور باطنی قابلیت انسان کے اندر پہلے سے موجود نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو پیغمبروں کے ذریعے اپنی طرف بلانا صریح ظلم ثابت ہوتا۔ اور اللہ تعالےٰ کسی نفس کو اس کی وسعت اور استعداد سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ یہاں پر نیچریوں اور دہریوں کے اس باطل خیال کی قلعی کھل جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ مذہب اور اللہ تعالیٰ کی پرستش اور عبادت کی بنیاد خوف سے پڑی ہے اور حیات بعد الموت اور روح کی بقاء کا خیال اور اعتقاد انسان کے اپنے سائے اور عکس سے پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ انسان کی اپنی فطرت اور سرشت ہی مذہبی اعتقاد اور روحانی خیال کی پہلی محرک ہے اور بس۔ اور خوف و رجا تو یقین اور ایمان باللہ کی فطری تحریک کے بعد کے لازمی نتائج ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی فطرتی طلب اور طبعی پیاس کے لیے بے چینی کو معلوم کیا تو بسبب رحم اور شفقتِ خالقی اپنے بندوں میں سے خاص خاص ہستیوں کو اپنی قدرت کا مظہر بنا کر انہیں مخلوق کا پیشوا اور راہبر بنا کر بھیجا۔ اور ان کے ذریعے اپنی ذات وصفات واسما سے روشناس کیا اور اپنے نام ونشان کا پتہ دیا۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً مختلف زمانوں میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں اور رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (اٰلِ عمرٰن ۳: ۱۶۴)

''اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان والوں پر بہت احسان فرمایا جب کہ اس نے ان کی طرف اپنی جنس کا رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں اس کی کتاب

اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی اور تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔'' چونکہ ہر انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا علیحدہ علیحدہ معاملہ اس کی قدرت اور حکمت کے منافی ہے اس لیے یہ کلیہ قاعدہ رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں اپنی مخلوق میں سے ایک کامل انسان کو پہلے نورِ ایمان اور نیرِ اسم اللہ ذات سے منور کر کے شمع رشد و ہدایت بنا کر بھیج دیتا ہے۔ بعدہٗ اس کے نور سے ہزاروں لاکھوں چراغ روشن کر دیتا ہے۔ اور ایک کامل اور قابل ہستی کے دل کی زمین میں پہلے اسم اللہ ذات کے فطرتی تخم کو اپنی قدرتِ کاملہ سے سرسبز کر دیتا ہے اور جب وہ شجرِ طیبہ بن کر پورے طور پر پھلتا اور پھولتا ہے تو اس کے پھلوں سے لاکھوں کروڑوں نوری درخت پیدا کر کے دینِ قیم کا ایک سرسبز اور شاداب باغ بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کے سینۂ بے کینہ میں پہلے تخم اسم اللہ ذات سے شجرۃ الانوارِ قرآن کو نمودار کیا اور اس کی روشنی سے تمام دنیا کو منور کیا۔ جس کی کیفیت یوں تھی کہ جب آنحضرت صلعم کے وجودِ مسعود میں تخم اسم اللہ ذات نے پھلنے پھولنے کا تقاضا شروع کیا اور آپ ﷺ نے اپنے اندر نزولِ وحی کے آثار محسوس کیے۔ یعنی حضرت مریمؑ کی طرح آپ ﷺ نے اپنے بطنِ باطن میں حملِ وحی کی بے واسطہ ثقالت کو معلوم کیا اور بمقتضائے فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ○ (مریم ۱۹ : ۲۲) آپ ﷺ نے دشت و بیابان کا رخ کیا اور آبادی سے دور ایک پہاڑ کے غار میں جسے غارِ حرا کہتے ہیں جا کر معتکف اور گوشہ نشین ہو گئے۔ اور باطنی تخم کے سینچنے اور پھوٹنے اور روحانی عیسیٰ کے وضعِ حمل اور تولد ہونے کے انتظار میں بار بار وہاں جایا کرتے اور کئی روز بیٹھے رہتے۔ آخر ایک روز جبرئیلِ امین اس نوری تخم اسم اللہ ذات کو پانی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بحرِ انوار سے چشمۂ حیات اپنے سینے میں بھر لائے اور آنحضرت ﷺ کے سینے سے سینہ ملا کر آپ ﷺ کو زور سے دبا کر فرمایا اِقْرَاْ یعنی پڑھ۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے جواب میں کہا کہ اَنَا لَيْسَ بِقَارِیٍ۔ یعنی میں تو قاری اور پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ چنانچہ تین دفعہ جبرئیل امینؑ نے سینے سے دبایا اور ہر دفعہ آپ ﷺ اَنَا لَيْسَ بِقَارِیٍ فرماتے رہے۔ آپ ﷺ کے ہر بار اَنَا لَيْسَ بِقَارِیٍ فرمانے سے مراد یہ تھی کہ پانی تو مل رہا ہے مگر ابھی تک وہ نوری شجرِ قرآن پھوٹتا ہوا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ آخری دفعہ جب جبرئیلِ امینؑ نے سینے سے دبا کر فرمایا اِقْرَاْ تو

آپ ﷺ کی زبانِ حق ترجمان پر قرآن کی یہ پہلی سورۃ یوں جاری ہوگئی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ﴿﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ﴿﴾ (العلق ۹۶: ۱۔۵)۔ ترجمہ: "پڑھ (اے محمد ﷺ!) قرآن کو اپنے اس پروردگار کے نام (کی برکت) سے جس نے مخلوق کو پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خونِ منجمد سے بنایا۔ پڑھے جاؤ (اے محمد ﷺ) تیرے بڑے عزت والے رب کی قسم جس نے (عوام کو) قلم (کے کسی علم) سے سکھایا ہے اور (خواص کو بے واسطہ) وہ علم لدنی سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔" غرض قرآن کریم کی یہ پہلی آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿﴾ (العلق ۹۶: ۱۔۵)۔ یعنی قرآن پڑھ اے محمد صلعم اپنے رب کے اسم کے ذریعے صاف بتا رہی ہے کہ جس چیز کے پڑھنے کی جبرئیل امینؑ تاکید فرمارہے تھے وہ اسم اللہ ذات کی نوری تحریر تھی۔ بہت لوگ اس موقع پر یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم پڑھے ہوئے نہیں تھے اور اس وقت نہ قرآن کا کوئی نشان موجود تھا اور نہ پڑھنے کی کوئی چیز جبرئیلؑ کے پاس تھی جس کی نسبت جبرئیلؑ بار بار اِقْرَاْ کہہ کر پڑھنے کی تاکید فرماتے تھے۔ سو وہ اسم اللہ ذات کی نوری تحریر تھی جس کے تصور یعنی باطنی طور پر اس کے پڑھنے اور مرقوم کرنے کی جبرئیل آنحضرت صلعم کو تعلیم اور تلقین فرمارہے تھے۔ چنانچہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿﴾ (العلق ۹۶: ۱۔۵)۔ یعنی پڑھ قرآن کو اے محمد ﷺ! اپنے رب کے اسم کی برکت سے۔ سو بِاسْمِ رَبِّکَ میں صاف طور پر اسم اللہ ذات کی طرف اشارہ ہے کہ اے محمد ﷺ! اب اسم اللہ ذات تیرے سینے میں پھوٹ کر سر نکال چکا ہے اور شجرِ قرآنی بن رہا ہے اب قران کو پڑھ اور اس کے معارف و علوم اور اسرار و انوار کے پھل خود کھا اور اُمتِ مرحومہ کو قیامت تک کھلائے جا۔ اس طرح شجرِ قرآن آں حضرت صلعم کے وجودِ مسعود کی زمین میں اسم اللہ ذات کے نوری تخم سے پیدا ہوا۔ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ (الفتح ۴۸: ۲۹)۔ ترجمہ: "جیسا کہ نبات اور سبزی پہلی ڈالی اور شاخ کو نکالتی ہے اور پھر اس کو مضبوط اور محکم کرتی ہے۔ اور پھر وہ موٹا اور تن آور درخت بن کر اپنے تنے کے بل سیدھا زمین پر قائم اور کھڑا ہو جاتا ہے۔"

سو قرآن کی یہ بھاری امانت اس طرح جبرئیل امینؑ کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی طرف

سے آں حضرت صلعم کے سینۂ بے کینہ میں منتقل ہوئی۔ یہی وہ بھاری اور ثقیل امانت تھی جس کی برداشت سے زمین و آسمان اور پہاڑ عاجز آ گئے تھے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۷۲)۔ ترجمہ: "ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ پس سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا لیکن کامل انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ (اپنے نفس کے لیے) ظالم اور نادان ثابت ہوا۔ حدیث قدسی: لَا تَسَعُنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰکِنْ یَسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِالْمُؤْمِنِ۔ یعنی "میں آسمانوں اور زمینوں میں نہیں سماتا۔ لیکن مومن مسلمان کے قلب میں سما جاتا ہوں۔"

پرتوِ حسنت[1] نہ گنجد در زمین و آسماں ۔۔۔ من دریں فکرم کہ اندر سینہ چوں جا کردہ

قولہٗ تعالیٰ: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ (الحشر ۵۹: ۲۱)۔ ترجمہ: "اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ سنگین اور سخت پہاڑ بھی قرآن کی ثقالت اور عظمت سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔" دوسری جگہ ارشاد ہے: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ (المزمل ۷۳: ۵)۔ یعنی "ہم عنقریب تم پر بھاری اور ثقیل قول (قرآن) اُتارنے والے ہیں۔" چنانچہ قرآن کے نزول کے وقت آں حضرت صلعم کی یہ حالت ہوتی کہ آپ ﷺ بے ہوش ہو جاتے، آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ فق ہو جاتا اور سخت سردی میں بھی آپ ﷺ کے چہرے مبارک سے پسینہ ٹپکنے لگ جاتا تھا اور اگر سواری کی حالت میں آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو وحی کے بوجھ اور قرآن کی ثقالت سے سواری بیٹھ جایا کرتی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آں حضرت صلعم میری ران پر سر مبارک رکھ کر سو رہے تھے کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہونے کے آثار نمودار ہوئے تو وحی کے بوجھ اور قرآن کی ثقالت سے میری ران ٹوٹنے لگی۔ غرض قرآن کریم کی ثقالت اور عظمت وہی لوگ سمجھتے ہیں جن پر اس کلام پاک کی واردات کما حقہٗ ہوئی ہے اور جن کے قلوب نورِ قرآن کی قابلیت اور استعداد رکھتے ہیں۔ اس امانتِ گراں کا تحمل اس کامل انسان سرورِ دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا ورنہ عوام کالانعام قرآن کی

[1] زمین اور آسمان تیرے حسن کی تجلیات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ مجھے حیرت ہے کہ تو میرے سینے میں کیسے سما گیا ہے۔

قدر و عظمت کو کیا جانیں کہ قرآن ان کے حلقوم سے نیچے نہیں اترتا اور بہت لوگ قرآن پڑھتے ہیں درآنحالیکہ قرآن انہیں لعنت کر رہا ہوتا ہے۔ غرض قرآن کریم مع جملہ معارف و اسرار اور تمام علوم وانوار اسم اللہ ذات کے اندر اس طرح مندرج ہے جس طرح تخم اور گٹھلی کے اندر درخت ہوتا ہے۔ اور جس عارف کامل کے وجود میں اسم اللہ ذات قائم ہو جاتا ہے تو وہ بلا واسطہ تلمیذ الرحمٰن اور حافظِ قرآن ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بزرگانِ دین نے سلوکِ باطنی کے لیے صرف اسم اللہ ذات کے ذکر یا اس کے تصور کو نصب العین ٹھہرایا ہے۔

اے طالب! ہم نے اب دلائلِ عقلی اور نقلی سے نیز آیات و احادیث سے تجھے اللہ تعالیٰ کی پاک اور مقدس بارگاہ تک پہنچنے کا سب سے آسان، نزدیک اور بے خوف و خطر راستہ بتا دیا ہے اور گنجِ کونین اور سعادتِ دارین کی طرف بچی، پوشیدہ ترین راہ دکھا دی ہے۔ اگر تیری قسمت یاور اور ہماری بات پر باور ہے تو عنقریب اس پر چل کر تو جلدی زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔

| | |
|---|---|
| چہ در طولِ امل از حرص بے باکانہ آویزی | بایں زلفِ پریشاں ہر نفس چو شانہ آویزی |
| بقیل و قال نتواں در حریمِ کعبہ محرم شد | ہماں بہتر کہ ایں ناقوس در بتخانہ آویزی |
| نخواہی شد دِگر محتاج دامن گیریٔ مردم | اگر یک بار در دامانِ شب مردانہ آویزی |
| بہ ہمت گوہر یکدانہ چوں مرداں بدست آور | چو زاہد تا بکے در سبحۂ صد دانہ آویزی |

ترجمہ:

۱۔ تو لمبے چوڑے خام خیالوں میں کیوں بے باکی سے الجھ رہا ہے اور اس پریشان زلف میں کنگھی کی طرح پھنس رہا ہے۔

۲۔ تو محض باتوں سے حرمِ کعبہ کا واقف نہیں بن سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ اس باتوں کے ناقوس (سنکھ) کو بت خانہ میں لٹکا دے۔

۳ تو پھر دوبارہ کسی کا دامن پکڑنے کا محتاج نہیں رہے گا۔ اگر ایک بار کسی رات کو جاگنے والے مرد کا دامن پکڑ لے۔

۴۔ جوانمردوں کی طرح ہمت سے ایک دانہ گوہر کا حاصل کر لے۔ زاہد کی طرح تو کب تک سو دانوں والی تسبیح میں الجھا رہے گا۔

# ضرورتِ پیرو مرشد

واضح ہو کہ ہر راستے کے لیے رفیق، راہبر اور راہنما کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور ہر علم وفن کے لیے استاد اور معلم درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف اس طول طویل سفر اور دور دراز بے نام ونشان راستہ کو طے کرنے کے لیے ایک واقف کار راہبر اور کامل راہنما اشد ضروری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور علومِ لدنی سکھانے کے لیے استاد اور معلمِ باطنی نہایت لازمی ہے اور اس کی بغیر چارہ نہیں۔ قرآن کریم میں سورۂ کہف کے اندر موسیٰؑ نے خضر علیہ السلام سے باطنی غیبی علم یعنی علمِ لدنی حاصل کرنے کی استدعا کی اور ان کی خدمت، صحبت اور رفاقت اختیار کی۔ غرض ایک مسلمان کے لیے قرآنِ کریم سے زیادہ زبردست برہان اور قوی ترین دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ سو جب قرآن مجید سے اس پوشیدہ، مخفی اور غیبی علم کا وجود ثابت ہے۔ اور ادنیٰ کسبی علومِ دینی کا سیکھنا بمصداقِ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے) تو اس اعلیٰ علمِ لدنی کا سیکھنا بدرجۂ اولیٰ فرض ہونا چاہیے۔ اور اس علم کے استاد اور معلم بھی دنیا میں ظاہر اور مخفی طور پر موجود ہیں۔ اور قرآن کریم ان باطنی اساتذہ کا وجود بتلا رہا ہے۔ اور کوئی زمانہ ان سے خالی نہیں ہے۔ تو ان لوگوں پر سخت افسوس ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور باطنی علوم کے انکار پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور بعض سعادت مند اور نیک بخت طالب جب راہِ سلوک پر گامزن ہونے کا تہیہ کر بیٹھے ہیں تو یہ لوگ غولِ بیابانی بن کر ان کے راستے میں طرح طرح کے شکوک اور شبہات کے روڑے اٹکاتے ہیں اور انہیں اس راہ سے باز رکھنے کی کوششِ بے سود اور سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ اور ضال ومضل بن کر نہ خود اس راہ پر چلنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں اور نہ اوروں کو جانے دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف ہدایت کرتا ہے بھلا ان کو کون گمراہ کر سکتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ" (الحجر ۱۵: ۴۲)۔ ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے شیطان میرے خاص بندوں پر تجھے ہرگز غلبہ حاصل نہ ہوگا۔" وَمَنْ یَّھْدِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ط (الزمر ۳۹: ۳۷)۔ اگرچہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے دینی استعداد اور ملکۂ ہدایت یعنی تخمِ اسم اللہ ذات روزِ اوّل

سے ودیعت کر دیا ہے لیکن اُس استعدادِ بالقویٰ کو بالفعل جاری کرنے اور تخم اسم اللہ ذات کو پانی دینے اور پرورش کرنے کے لیے استاد اور مربی کی اشد ضرورت ہے۔ اور ہر چیز کا ملکہ فطرتاً انسان کے وجود میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس ملکے کو زندہ کر کے بروئے کار لانے کے لیے ایک دوسرے کامل انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ بولنے کا ملکہ اللہ تعالیٰ نے ازل سے بچے کی سرشت میں رکھ دیا ہے مگر اس ملکے اور قابلیت کو ظہور میں لانے اور اس کو پرورش اور تربیت دینے کے لیے ماں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ وہی زبان سیکھ جاتا ہے جو ماں اس کو سکھاتی ہے۔ بالفرض اگر کوئی بچہ ماں کے بغیر پرورش پائے یا گونگی دایہ کے سپرد کیا جائے اور اس کے سامنے کوئی بولنے والا شخص نہ ہو تو وہ بچہ یقیناً گونگا رہ جائے گا اور بولنے کا ملکہ کھو بیٹھے گا۔ حالانکہ اس میں استعداد اور ملکہ موجود تھا لیکن بغیر مربی ملکہ ضائع ہو گیا۔ جیسا کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں گنگ محل کا قصہ مشہور ہے کہ چند بچے گنگ دائیوں کے حوالے کیے گئے اور ان کی پرورش اور تربیت میں رکھے گئے تو سب کے سب گونگے ہو گئے۔ لہٰذا فطرت اور قدرت کے ہر سرمائے کو عمل میں لانے اور ہر ملکہ اور قابلیت کو جاری کرنے کے لیے ایک دوسرے انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ فطرت اور قدرت کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے اور اسی کمال اور قابلیت کے سبب انسانِ کامل کو خلیفۃ الارض کے خطاب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اسی باطنی فطری استعداد کی پرورش اور تربیت کے لیے یہی قاعدہ، کلیہ اور قانون جاریہ و مستمرہ رکھ دیا ہے۔ اسی کے مطابق حضرت رسول اکرم صلعم کے اندر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کے واسطے اور ذریعے سے اس نوری پھل اور تخم کی پرورش فرمائی اور آں حضرت صلعم کو صحابہؓ کا مربی استاد اور وسیلہ بنایا۔ اور تابعین اور تبع تابعین اور بعد ازاں جملہ کاملین، عارفین اور مومنین و مسلمین میں استادی شاگردی، طالبی و مرشدی اور مریدی و پیری کا سلسلہ جاری رہا اور قیامت تک اس ظاہری اور باطنی فیضان اور عرفان کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جو شخص اس قانونِ قدرت کے خلاف کرے گا اور انسانی وسیلے اور ذریعے سے منہ موڑ کر براہ راست اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرے گا وہ سخت نقصان اٹھائے گا اور یقیناً نور ایمان اور دولتِ عرفان سے محروم رہے گا۔ کوئی علم اور فن دنیا میں بغیر استاد اور معلم حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ پیر و مرشد کے

بغیر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت، قرب اور وصال تک پہنچ سکتا ہے۔

مے نروید تخم[۱] دل از آب و گل        بے نگاہ ہے از خداوندانِ دل
اندریں عالم نیرزی با خسے        تا نیاویزی بدامان کسے

بعض کور مادر زاد شقی ازلی راہِ معرفتِ مولیٰ اور علم باطن کے منکر ہیں اور صرف زبانی اقرار کسبی کتابی علم اور تقلیدی اسلام کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ ان کا معاملہ محض قیل و قال اور سنی سنائی باتوں تک محدود ہے۔ وہ دنیا میں رسیدِ دیدار اور یافتِ حق کے منکر ہیں۔ حالانکہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ أَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ أَعْمٰى (بنی اسرآئیل ۱۷ : ۷۲) ۔ انسان کو جو یقین کسی چیز تک پہنچنے اور اسے پالینے سے حاصل ہوتا ہے وہ سنی سنائی باتوں سے کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیشہ سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرنے والے لوگوں کے سرمایۂ ایمان کو شیطان بہت جلدی غارت کر کے لوٹ لیتا ہے۔ زبانی قیل و قال اور عقلی دلائل میں شیطان کا مقابلہ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ کیونکہ علم اور فضیلت میں وہ معلم الملکوت یعنی فرشتوں کا استاد رہ چکا ہے۔ میدانِ علم میں تو کوئی انسان بھی اس ملعون سے گوئے ایمان نہیں لے گیا۔ بڑے بڑے عالم فاضل اور دانا فیلسوف اس کے سامنے چوگانِ علم و فضل ڈال گئے ہیں اور بازی ہار گئے ہیں۔ اس ذاتِ بے چوں کو عقلی دلائل کے چوں چرا نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لیے علم بے چوں اور استاد کامل راہنما چاہیے۔ فضیلت یہاں محض بے کار ہے۔ یہاں وسیلت درکار ہے۔ دولتِ علم کا شیطان دھنی ہے اور متاعِ فضیلت میں سب سے غنی ہے۔ لیکن سرمایۂ وسیلت میں وہ نرا مفلس اور نادار ہے۔ جہاں علم میں وہ سب ملائکہ کا استاد اور سردار رہا لیکن جب آدم علیہ السلام کے سامنے سجود کا امتحان و سیلت پیش آیا تو یہ ملعون سب سے پیچھے رہ گیا اور بازی ہار گیا۔

چوں[۲] درپی علم و عقل درکار شدم        گفتم کہ مگر محرمِ اسرار شدم

---

۱ اولیاء اللہ کی توجہ کے بغیر دل کا بیج وجود انسانی کے آب و گل سے پھوٹ نہیں سکتا۔ اس دنیا میں تیری حیثیت ایک تنکے کے برابر بھی نہ ہوگی جب تک تو کسی کے دامن سے وابستہ نہ ہو جائے گا۔

۲ جب میں علم و عقل کی تحصیل میں مصروف ہو گیا۔ تو میں نے دل سے کہا کہ شاید میں آشنائے راز ہو گیا ہوں۔ لیکن عقل رکاوٹ ثابت ہوئی اور علم حجاب بن گیا۔ جب میں نے یہ جان لیا تو میں علم و عقل ہر دو سے بیزار ہو گیا۔

انما انا بشر مثلکم ...

ہم عقل عقیلہ بود ہم علم حجاب ۔۔۔ چوں دانستم زہر دو بیزار شدم

(رہرو نیشاپوری)

اگلے زمانے کے کفار نابکار بھی اسی خام خیال کے پندار میں ہدایت سے محروم رہے اور کہا کرتے: اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا (التغابن ۶۴: ۶) یعنی "ہم جیسے انسان ہمیں ہدایت کرتے ہیں۔" اور پیغمبروں سے کہا کرتے: مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا لا وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ (یٰسٓ ۳۶: ۱۵) ۔ یعنی "تم تو ہم جیسے انسان ہو اور اللہ تعالیٰ نے تم پر کوئی چیز نہیں اتاری اور نہ ہی تم ہم سے اس کے زیادہ حقدار ہو۔" اور کبھی کافر لوگ یہ اعتراض کرتے: مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ ط (الفرقان ۲۵: ۷) ۔ یعنی "یہ کیسے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں کہ ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں اور ہمارے ساتھ کوچوں اور بازاروں میں پھرتے ہیں۔" یعنی انہیں ایک فوق الفطرت اور اعلیٰ ممتاز ہستی ہونا چاہیے۔ اور گاہے کہتے ہیں لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِکَۃُ اَوْنَرٰی رَبَّنَا ط (الفرقان ۲۵: ۲۱) ۔ ترجمہ: "کیوں نہ ہم پر فرشتے اتارے گئے یا ہم خود خدا کو کیوں نہ دیکھ لیتے" تا کہ ہدایت کا معاملہ صاف ہو جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتے ہیں: وَلَوْ جَعَلْنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلْنٰہُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَیْھِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ ٥ (الانعام ۶: ۹) ۔ ترجمہ: "اگر ہم انسانوں کی بجائے فرشتے بھی مبعوث کر کے بھیجتے تو انہیں بھی بشری لباس پہنا کر بھیجتے۔ تا کہ تم ان کی باتیں سنتے اور انہیں دیکھ کر انکی پیروی کرتے۔" غرض اس قسم کے شکوک اور شبہات میں گرفتار ہو کر کفار ہدایت سے محروم رہے۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَ ھُمُ الْھُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ٥ (بنی اسرآئیل ۱۷: ۹۴) ۔ یعنی "لوگوں کے پاس جب کبھی ہدایت آئی تو صرف اس بات نے ان کو ایمان لانے سے روکا اور ہدایت سے باز رکھا کہ وہ یہی کہتے رہ گئے کہ آیا اللہ نے ہم جیسے انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔"

غرض اللہ تعالیٰ کے خاص برگزیدہ بندے یعنی انبیا اور اولیا اگرچہ ظاہری صورت اور شکل و شباہت میں خاکی پتلے اور ہم جیسے عنصری انسان ہوتے ہیں لیکن حقیقت اور معنیٰ میں نوری فرشتے بلکہ ان سے بھی اعلیٰ اور ارفع شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولانا

روم صاحبؒ فرماتے ہیں۔

کارِ پاکاں[1] راقیاس از خود مگیر — گر بماند در نوشتن شیر و شیر
آں یکے شیراست کو مردم درد — ویں دگر شیر است کش مردم خورد
گر بصورت آدمی انساں بدے — احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ (الکہف۱۸: ۱۱۰) ۔ یعنی ’’کہہ دے اے محمد ﷺ! میں تمہاری طرح انسان تو ہوں لیکن میری طرف اللہ تعالیٰ کی وحی ہوتی ہے۔ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں ظاہری صورت کا اقرار ہے اور يُوْحٰى اِلَيَّ میں حقیقتِ محمدی ﷺ کا اظہار ہے۔ فَهِمَ مَنْ فَهِمَ ۔ جس طرح شیطان آدم علیہ السلام کے خاکی جثہ کو دیکھ کر اس کی تعظیم و تکریم اور سجود سے باز آیا اور انانیت اور خود پسندی کے سبب ملعون ہوا اسی طرح جن لوگوں کی نظر انبیا اور اولیا کے ظاہری جسم پر پڑی اور ان کی حقیقت سے غافل رہ گئے وہ ان کی ہدایت، برکت اور فیض سے محروم رہ گئے۔ غرض انسان کو ہدایت انسان سے ہے۔ انسان کو ہر قسم کی برکت، فیض، رشد اور تعلیم و تلقین انسان سے حاصل ہوتی ہے اور بغیر استاد مربی اور مرشد کامل انسان کوئی چیز نہیں سیکھ سکتا۔

ہیچ کس[2] از خود بخود چیزے نشد — ہیچ آہن خنجر تیزے نشد
ہیچ حلوائی نشد استاد کار — تا کہ شاگرد شکر ریزے نشد
مولوی ہرگز نشد مولائے روم — تا غلام شمس تبریزے نشد
(رومی)

بعض اپنی شیطانی حسد اور کبر و انانیت کی وجہ سے مذہبی پیشواؤں اور روحانی رہنماؤں کی تعلیم و تلقین اور باطنی استمداد کا انکار کرتے ہیں اور اس کا نام توحید دھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ شاہ رگ سے ہمیں زیادہ نزدیک ہے اور وہ ہر جگہ حاضر ناظر اور سمیع و بصیر اور

---

[1] پاک لوگوں کے اعمال کو اپنے پر قیاس نہ کر۔ اگرچہ لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہیں۔ ان میں ایک شیر تو وہ ہے جو لوگوں کو پھاڑتا ہے اور دوسرا شیر (دودھ) ہے جسے لوگ پیتے ہیں۔ اگر انسان شکل و صورت کے اعتبار سے ہی انسان ہوتا تو حضور رسالت مآبؐ اور ابوجہل برابر ہوتے۔

[2] کوئی شخص از خود بخود کوئی چیز نہیں بنتا اور کوئی لوہا خود بخود تیز خنجر نہیں بن سکتا۔ کوئی حلوائی کاریگر نہیں بنتا جب تک کہ اس نے کسی ماہر کی شاگردی نہ کی ہو۔ مولوی بھی ہرگز مولائے روم خود بخود نہیں بنا جب تک وہ شخص شمس تبریزؒ کا غلام نہ ہوا۔

قریب و مجیب ہے۔ وہ خود ہادی ہے۔ ہمیں دوسرے واسطوں اور وسیلوں اور مرشدوں رہنماؤں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اللہ کافی ہے۔ اور اس انانیت اور استکبار اور بزرگانِ دین کے ساتھ حسد اور عناد کو شیطانی توحید کی آڑ میں چھپاتے ہیں اور ساتھ ہی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم موحد ہیں اور پیغمبروں اور پیروں کو ماننے والے معاذ اللہ مشرک ہیں۔ یہ لوگ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرتے ہیں۔ ان کا حال اگلے زمانے کے کفارِ نابکار کی طرح ہے جن کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ط كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ط (البقرۃ ۲: ۱۱۸) اور ایک دوسری آیت میں بھی اسی طرح کے الفاظ ہیں: لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ط لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ٥ (الفرقان ۲۵: ۲۱)۔ "پیغمبروں کے منکر کہنے لگے کیوں اللہ تعالیٰ براہ راست ہم سے کلام نہیں کرتا یا خود ہم پر آیتیں کیوں نہیں اترتیں۔ البتہ یہ لوگ اپنے نفسوں میں بڑے متکبر واقع ہوئے ہیں اور انہوں نے سخت سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔"

غرض دنیا میں کوئی علم و فن اور کوئی ہنر و کسب ایسا نہیں جو انسان نے دوسرے انسان کے واسطے کے بغیر براہ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل کیا ہو۔ یہ نفسانی کور چشم مردہ دل اور شقی ازلی لوگوں کا محض حسد اور استکبار ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلنے اور راہبر و راہنما کے ملنے سے باز رکھتا ہے۔ شیطان نے آدم علیہ السلام کو حسد اور کبر کی وجہ سے سجدہ نہ کرتے ہوئے توحید کو بہانہ بنایا اور کہا لَا اَسْجُدُ لِغَيْرِ اللّٰهِ یعنی میں غیر اللہ کو سجدہ نہیں کرتا اور میں موحد ہوں۔ اس طرح وہ ملعون گو توحید کا مدعی اور شرک کا منکر تھا لیکن بسبب کبر اور انانیت خود خدا کا شریک ہو رہا تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ایک حدیث قدسی میں فرماتے ہیں: اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ لَا اُشْرِكُ فِيْهِ غَيْرِيْ یعنی "میں اپنی کبریائی کی چادر میں کسی غیر کو شریک نہیں کرتا۔"

چنداں کہ با اہل کبر محشور شوی    از رحمت کردگار خود دور شوی
گر بادہ خوری و بعد ازاں توبہ کنی    بہتر کہ کنی نماز و مخمور شوی

(حافظ ابن کثیر)

ترجمہ: تو جتنا مغرور لوگوں کے ساتھ ملے گا اتنا اپنے پروردگار کی رحمت سے دور ہوتا جائے گا۔ اگر تو شراب پی لے اور اس کے بعد توبہ کر لے تو وہ نماز پڑھ کر مخمور اور مغرور ہونے

سے بہتر ہے۔

اس توحید نما شرک کو کور چشم نفسانی لوگ کیا جانیں۔ اس مریض کا کون علاج کرے جو مرض کو عین صحت خیال کرے۔ علم و فضل کے دودھ کے دریا کو سرکۂ استکبار کی ایک بوند بگاڑ دیتی ہے۔ خرمنِ ہزار سالۂ طاعت کو حسد کی ایک چنگاری راکھ سیاہ کر دیتی ہے۔ حدیث: مَنْ كَانَتْ فِيْ قَلْبِهٖ ذَرَّةٌ" مِنَ الْكِبْرِ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ۔ یعنی "جس شخص کے دل میں ایک ذرہ برابر کبر ہو وہ بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا۔" خودی اور خدا ہرگز اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ افسوس ہے اُن لوگوں پر جو خودی کو بلند اور شیطان کو خورسند کرتے ہیں۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

(ذوق)

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا: كَيْفَ الطَّرِيْقُ اِلَى الْوِصَالِ۔ یعنی "تیرے وصال کا راستہ کونسا ہے؟" تو جواب ملا: "دَعْ نَفْسَكَ وَتَعَالْ" یعنی "اپنے نفس کو چھوڑ دے اور چلا آ۔ مجھ سے واصل ہو جائے گا۔" جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کے آگے جھکتا ہے اور تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے سر بلند کرتا ہے۔ اور جو شخص خودی اور غرور کرتا ہے وہ سر کے بل گرتا ہے۔ دانہ اور تخم جس وقت زمین کے اندر اپنی ہستی اور خودی کو مٹاتا ہے تو سر سبز اور بلند ہوتا ہے۔ اس کی سلامتی اور صحت اس کے نمو اور ترقی سے مانع ہے۔ وسیلے کی فلاسفی یہ ہے کہ کبر اور انانیت کثرتِ متاعِ دین و دنیا کے لیے لازمی چیز ہے۔ شرابِ دنیا کے سکر سے جب انسان کا دماغ بدمست ہو جاتا ہے تو کوسِ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى بجانے لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دنیوی بادشاہوں نے اس سکر اور بدمستی کی وجہ سے خدائی دعوے کیے ہیں۔ شراب سے بھی دنیا کا نشہ بہت سخت ہے۔

بادہ[1] نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است
گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

---

[1] شراب پی کر ہوش وحواس بجا رکھنا آسان کام ہے (یہ کوئی مردانگی نہیں) اگر تو صاحبِ دولت ہو کر مست نہ ہو تو بے شک مرد ہے۔

نیز علم وفضیلت اور زہد واطاعتِ الٰہی باطنی اور دینی دولت اور متاعِ اخروی ہے۔ لہٰذا اس دولتِ اخروی کے مالک کو بھی کبر کا گھن اور انانیت کا نقص لاحق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس دولتِ علم وطاعت کے سب سے بڑے دشمن شیطان نے اسی سکر اور مستی کے سبب اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ کہہ کر کبر اور انانیت کا اظہار کیا۔ (متاعِ آخرت کے اسی قسم کے اکثر زردار یعنی دنیا میں آئے دن اکثر ظاہری بے عمل اور زاہدِ خشک ریاکار کسبی کتابی علم اور ظاہری اطاعت کے غرور اور پندار میں پیغمبری، مہدویت اور مجددیت کے باطل دعوے باندھتے رہتے ہیں۔ کسی سادہ ان پڑھ آدمی نے اس قسم کا جھوٹا دعویٰ نہیں کیا) لہٰذا اللہ تعالیٰ صرافِ حقیقی نے علمِ ازلی سے فرشتوں کے زرِ عیارِ علم وطاعت میں کبر وانانیت کے اس لازمی کھوٹ کو ملاحظہ فرمایا۔ اور چادرِ کبر کو اپنی مقدس اور غیور بارگاہِ وحدت میں داخل ہونے سے سخت مانع پایا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے زرِ علم وطاعت کو کبر وانانیت کے لازمی کھوٹ اور نقص سے صاف کرنے کے لیے آدم علیہ السلام کے آگے سجدے اور تعظیم وتکریم کی ذلت کی آگ میں ڈال کر پرکھنا اور صاف کرنا چاہا اور سب کو حکم دیا کہ اُسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ (الاعراف۷: ۱۱)۔ یعنی آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ اور یہ بات مسلّم ہے کہ کبر اور ذلت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ضدین ہرگز جمع نہیں ہوتے۔ اور نیز کُلُّ شَیۡءٍ یُعۡرَفُ بِضِدِّهَا۔ ہر چیز اپنی ضد سے پرکھی اور پہچانی جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے امتحاناً سجدے اور ذلت کی آگ میں ملائکہ کے زرِ علم و طاعت کو دیکھنا اور پرکھنا چاہا۔ سب ملائکہ نے متفقہ طور پر کبر اور انانیت کی چادر کو اپنے کندھوں سے دور پھینک دیا اور آدم علیہ السلام کے آگے سجدہ کر دیا۔ لیکن شیطان لعین چونکہ کھوٹی متاع کا مالک تھا اور اس کی فطرت میں کبر اور خودی کی کھوٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور کبر وانانیت کی چادر سے اس کا جسم اکڑا اور تنا ہوا تھا اس لیے وہ سجدے اور تعظیم کے لیے نہ جھک سکا اور صاف انکار کر دیا۔ اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ وَکَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۞ (البقرۃ ۲: ۳۴)۔ غرض محض کبر کے سبب وہ لعنتی اور راندۂ درگاہ ہوا۔ اگر اس نے اللہ تعالیٰ کے آگے لاکھوں برس سجدے کیے اور توحید کا دم بھرتا رہا لیکن بسبب کبر وانانیت خود اللہ تعالیٰ کا شریک بن رہا تھا۔ لہٰذا توحید کے اس جھوٹے دعوے نے اسے کچھ فائدہ نہ دیا اور وہ توحید کے عملی امتحان میں فیل ہو گیا۔ اور اس کے لاکھوں برس کے خزائنِ علم وطاعت کو کبر کی ایک

چنگاری نے راکھ سیاہ کر دیا اور ابدی لعنتی اور دوزخی ہو گیا۔ لہٰذا اے طالبِ خدا، پندارِ علم وطاعت کے جوئے اتار کر موسیٰ علیہ السلام کی طرح بارہ گاہِ قدس میں عجز و نیاز کے ننگے پاؤں سے داخل ہو جا۔ علم و فضل اور اطاعت اور زہد کو خیال میں نہ لا۔ اس کے خزانے میں ان چیزوں کی بڑی فراوانی اور ارزانی ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے سے عبودیت و شکستگی اور عجز و نیاز کا طلب گار ہے اور اس متاعِ عزیز کا خریدار ہے۔

بہوش[1] باش کہ ہنگامِ بادِ استغنا

ہزار خرمن طاعت بہ نیم جَو نہ خرند

حدیث قدسی: اَنِيْنُ الْمُذْنِبِيْنَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ تَسْبِيْحِ الْمُقَرَّبِيْنَ ۔ یعنی گناہگاروں کا رونا اور گڑگڑانا میرے نزدیک مقرب لوگوں کی تسبیح سے بہت عزیز اور پسندیدہ ہے۔

مشو اے عاصی بے چارہ نومید — کہ چوں پیدا شود اشراق خورشید
اگر افتد بہ قصرِ پادشاہی — ہم افتد نیز بر کنجِ گدائی
کسے کو برہنہ است امروز در راہ — بروے تابد ایں خورشید درگاہ
چو کارِ مخلصاں آمد خطرناک — گنہ گاراں برند ایں گوئے چالاک
نہ زیبد مردِ خودبیں بادشاہ را — انینِ المذنبین باید خدارا

دریں رہ نیست خود بینی خجستہ

تنِ لاغر دلے باید شکستہ

ترجمہ: اے مسکین گنہگار تو مایوس نہ ہو کہ جب آفتاب کی روشنی ظاہر ہوتی ہے تو جس طرح وہ شاہی محل پر پڑتی ہے اسی طرح فقیر کی جھونپڑی پر بھی پڑتی ہے۔ آج اگر کوئی شخص زندگی کی راہ میں مفلس و قلاش اور برہنہ تن بھی ہے تو اللہ کی بارگاہ کا یہ آفتاب اس پر بھی چمکتا ہے۔ جس روز مخلصوں کا کام بھی دشوار ہو جائے گا تو میدانِ حشر میں گنہگار سب پر سبقت لے جائیں گے۔ خود پسند انسان بادشاہ کی بارگاہ کے لائق نہیں۔ اسی طرح رب العالمین کی بارگاہ میں بھی گنہگاروں کی آہ وزاری درکار ہے۔ اس راستے میں خود پسندی موزوں نہیں۔

---

[1] ہوش سے کام لے کہ جب اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کی ہوا چلتی ہے تو طاعت و بندگی کے ہزار ہا خرمنوں کی قیمت نصف جَو کے برابر بھی نہیں ہوتی۔

یہاں تنِ ناتواں اور دلِ شکستہ کی ضرورت ہے۔

آدم علیہ السلام کے آگے فرشتوں کا سجدہ بظاہر اگرچہ شرک کی ایک ناگوار شکل تھی اور ملائکہ جیسے علم وطاعت کے پیکروں کے لیے بظاہر سخت کڑوی اور تلخ دوا کی طرح تھی لیکن چونکہ کبر اور انانیت کے مرض کے لیے یہ تریاق کی مانند مفید ثابت ہوتی تھی اس لیے اس حکیمِ ازلی کے فرمان کو پہچان کر دانا اور دور اندیش ملائکہ نے وسیلے اور ذلت کی اس تلخ اور ناگوار دوا کو آنکھیں موند کر اور دل کڑا کر کے پی لیا اور کبر وانانیت کے اس مہلک مرض سے نجات پائی۔

گیرم کی ہزار مصحف از بر داری  آں راچہ کنی کہ نفس کافر داری
سر رابہ زمین چہ می نہی بہر نماز  آں رابہ زمیں بنہ کہ در سر داری

ترجمہ: فرض کیا کہ ہزار مقدس کتابیں تیری بغل میں ہیں۔ لیکن تیرا نفس جو کافر ہے ان کتابوں کو کیا کرے گا۔ تو خالی سر کو نماز کے لیے زمین پر کیا رکھتا ہے اس چیز کو زمین پر رکھ جسے تو اپنے سر میں رکھتا ہے۔

شیطان جب آدم علیہ السلام کے سجدہ نہ کرنے سے لعنتی ہوا تو اس نے آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کی دشمنی اور گمراہی کا بیڑا اٹھایا۔ قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ ٥ (صٓ ۳۸: ۸۲)۔ ترجمہ: ’’شیطان نے کہا کہ تیری عزت اور جلال کی قسم میں آدم اور اس کی ساری نسل کو گمراہ کروں گا۔‘‘ پس پہلے پہل آدم علیہ السلام کو بہشت میں خودی کے شجرۃ الخلد کی طرف راغب کیا جس سے ان میں خودی اور نفسانیت پیدا ہوئی اور اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ بہشت کے اندر پہلے پہل جب آدم علیہ السلام کا بت تیار ہونے لگا تو فرشتوں نے سوال کیا کہ اے اللہ! یہ تو کیا چیز بنا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہوں تو شیطان کو رشک اور حسد کی آگ لگ گئی کہ خلافت کا حقدار میں ہوں یہ کہاں سے خلیفہ بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کے قریب آ کر شیطان اسے دیکھنے لگا اور جب اس کی عجیب وغریب خلقت اور اس کی آئندہ شان اور عظمت کو معلوم کیا تو جاتے وقت حسد اور نفسانیت کی وجہ سے ان کی لاش پر تھوک دیا۔ اور خودی ونفسانیت کی وہ شیطانی تھوک آدمؑ کے مقامِ ناف پر جا پڑی جس سے آدمؑ کے وجود میں نفس کی بنیاد پڑی۔ اور یہاں سے آدم اور اس کی نسل کے ساتھ شیطان کا ایک رشتہ اور رابطہ قائم ہو گیا اور گمراہی کا بیج اور تخم وجودِ

آدم میں بویا گیا۔ پھر ایک دن بہشت کے اندر آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا عرشِ معلیٰ منکشف ہو گیا۔ اس حالتِ کشف میں آدم علیہ السلام کو ساقِ عرش پر کلمہ طیب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لکھا ہوا نظر آیا۔ چنانچہ آدمؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ تیرے نام کے ساتھ یہ دوسرا نام محمد صلعم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دوسرا نام محمد صلعم پیغمبرِ آخر زمان کا ہے جو تیری نسل میں سے ہوگا اور میرا حبیب ہوگا اور تمام پیغمبروں اور ان کی امتوں کا پیشوا، سردار اور قیامت کے روز سب کا شفیع ہوگا۔ اس موقع پر شیطان نے آدم علیہ السلام کے وجود کے اندر اپنی اس نفسانیت اور غیرت کی رگ کو بھڑکایا اور آدم علیہ السلام کے اندر اپنا خیال اور وسوسہ ڈالا کہ عجیب انصاف ہے کہ بیٹے کو باپ کا شفیع بنایا جا رہا ہے۔

غرض یہاں سے شیطانی حسد، خودی، غیرت اور انانیت کے اربعہ عناصر وجودِ آدم میں نمودار ہوئے اور ان کے خمیر سے آدم علیہ السلام کے اندر نفس کا وجود قائم ہوا جس میں ابلیس ملعون نے اپنا مسکن، مورچہ اور کمین گاہ بنا لیا۔ اسی سے آدمؑ کو خودی اور شجرۃ الخلد کا فرضی سبز بہشت دکھا کر شجرِ ممنوعہ کا پھل کھلایا اور بہشت بریں سے باہر نکال لایا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کا امتحان مطلوب ہے اس لیے شیطان کو روزِ قیامت تک مہلت دے دی اور بڑا بھاری جرار جنودِ ابلیس یعنی شیطانی لشکر اس کے ہمراہ کر دیا اور گمراہی کے قسم قسم کے ہتھیاروں سے اسے مسلح کر دیا۔ جن میں زبردست اور کارگر ہتھیار خودی اور انانیت کا ہے۔ یہی اس کا اصلی قدیمی فطرتی ہتھیار ہے اور اس کے استعمال میں وہ بڑا ماہر ہے۔ یہی خودی اور انانیت پہلے اس کی اپنی گمراہی اور لعنت کا موجب بنی اور ہر بنی آدم کے وجود میں نفس کے مورچے سے یہی زہر میں بجھے ہوئے تیر ہر وقت چلاتا ہے کہ تیرے برابر اور کوئی نہیں ہے۔ اور بزرگانِ دین اور پیشوایانِ دینِ متین سے بدظن اور بدگمان کرتا ہے۔ پہلے روز آدمؑ کی نسبت حسد او رخودی و استکبار کے مہلک جراثیم نے خود اس کا کام تمام کیا اور پھر اسی سمِ قاتل کو آدمؑ کے وجود میں اپنی تھوک کے ذریعے ڈال کر اسے محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت اعتراض اور غیرت کو خودی کی شکل میں نمودار کیا اور اسے بہشتِ قرب سے نکال کر زندانِ بُعدِ دنیا میں ڈال دیا اور خودی و انانیت اور حسد کے یہی مہلک جراثیم نسلاً بعد نسلٍ آدم کی اولاد میں چلے آئے۔ اور کفار نابکار مشرک بے دین حاسد کور چشم قیامت تک اسی موروثی حسد اور انانیت

کی وجہ سے پیغمبروں اور اولیاء اللہ سے بدظن اور بدگمان رہتے ہیں۔ چنانچہ آدم علیہ السلام سال ہا سال اپنی خطا پر دنیا میں روتے رہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن پھر جب آپؑ کے اچھے دن آئے تو آپؑ پر اللہ تعالیٰ کا عرش دوبارہ منکشف ہوا اور ساقِ عرش پر کلمۂ طیب کو مرقوم دیکھ کر آپؑ کو اللہ تعالیٰ کا فرمان یاد آیا اور اپنی خطا کی معافی کا ایک زریں موقع مل گیا۔ اس وقت آدم علیہ السلام کے وجود میں اللہ تعالیٰ کے قہر و جلال کی آتشِ خوف اور یادِ خطا پر ندامت اور گریہ وزاری کے سبب خودی اور انانیت کے جراثیم کچھ تو جل گئے تھے اور کچھ دل سے آنکھوں کی راہ آنسوؤں کی شکل میں بہہ گئے تھے۔ اس وقت آدم علیہ السلام نے خودی اور انانیت کی آتشیں چادر گلے سے اتار کر عجز اور نیاز کا خاکی جامہ پہنا اور زمینِ نیاز پر سر رکھ کر اللہ تعالیٰ سے عرض پرداز ہوئے۔ "اے اللہ! اپنے اس حبیب کے صدقے جس کا نام مبارک تو نے اپنے اسم مبارک کے ساتھ عرشِ معلّٰی کے ساق پر مرقوم کیا ہے میری خطا معاف کر دے۔" قولہٗ تعالیٰ: فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ○ (البقرۃ ۲: ۳۷)۔ ترجمہ: "پس آدم علیہ السلام کو تائیدِ ربی سے چند کلمات کی تلقین حاصل ہوئی جن کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ تحقیق وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔" چنانچہ آدم علیہ السلام کی خودی کی پرکھ کے لیے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وسیلہ اس طرح محک ثابت ہوا جس طرح تمام ملائکہ کی خودی کا آدم علیہ السلام کے آگے سجود اور تعظیم و نیاز کے وسیلے سے امتحان ہوا تھا۔ اور جملہ اولیاء اللہ کی خودی کا امتحان حضرت سید الاولیا قطبِ ربانی غوثِ صمدانی حضرت سید محی الدین شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ العزیز کے فرمان حق ترجمان قَدَمِیۡ ہٰذِہٖ عَلٰی رَقَبَۃِ کُلِّ وَلِیِّ اللّٰہِ کے آگے سرِ نیاز و تسلیم جھکانے سے کیا گیا۔ کیونکہ خودی اور خدا ہرگز یکجا نہیں ہو سکتے۔ انسان کے وجود میں شیطان کے مختلف مورچے اور کمین گاہیں ہیں۔ چنانچہ نفسِ امّارہ اور خودی کا مسکن مقامِ ناف میں ہے۔ اور دوسرا مورچہ دل کے بائیں طرف خنّاس کا ہے۔ جو کہ شیطان کا معنوی خبیث طفل ہے۔ چنانچہ کبر و انانیت کا زہر شیطان اپنے فرزندِ لعین خنّاس کے ذریعے انسان کے دل میں ڈالتا ہے۔ خنّاسِ لعین کی بنیاد بھی مَنۡ یعنی میں کی منی اور اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ (الاعراف ۷: ۱۲) خودی اور انانیت کے خبیث نطفے سے پڑی ہے۔ اس کی

مثالی شکل ہاتھی کی سی ہے۔ اور مچھر کی طرح اپنی زہریلی خرطوم اور کبر و انانیت کے جراثیم سے بھری ہوئی سونڈھ جب انسان کے دل میں چبھو دیتا ہے تو شیطانی کبر اور انانیت کا اسے ایسا سخت بخار چڑھ جاتا ہے کہ فرعونِ بے عون کی طرح کوسِ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ۝ (النّٰزعٰت ۷۹: ۲۴) بجانے لگ جاتا ہے۔ اور اولیا اور بزرگانِ دین کیا بلکہ انبیا اور مرسلین کی بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔ غرض یہ سفاکِ ازلی دشمن انسان کو کبر اور میں کی چھری سے ذبح کرتا ہے۔

بکری کرے مَیں مَیں مَیں گلے چھری پھراوے
مینا کرے مَیں نہ مَیں نہ سب کے مَن کو بھاوے
(سرشارؔ)

حدیث: مَنْ مَدَحَ لِاَخِیْہِ الْمُسْلِمِ فِیْ وَجْھِہٖ فَکَاَنَّمَا ذَبَحَہٗ بِلَا سِکِّیْنٍ۔
ترجمہ: ''جس شخص نے اپنے کسی مسلمان بھائی کی اس کے منہ پر تعریف کی گویا اس نے اسے چھری کے بغیر ذبح کر ڈالا'' سو کبر اور انانیت شیطان کا ایسا کاری داؤ پیچ ہے کہ اس سے بغیر مرشد کے وسیلے کے بچنا محال ہے اور اس مہلک مرض کے لیے یہی وسیلے والی دوا تریاقِ اکبر اور اکسیرِ اعظم ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ ہر چیز حدِ اعتدال پر محمود اور مفید ہوتی ہے۔ افراط اور تفریط کسی صورت میں درست نہیں ہے۔ تواضع اور نیاز اگرچہ اچھی چیز ہے لیکن اس کی بھی حد ہونی چاہیے۔ یہ نہیں چاہیے کہ پیغمبر کی تعظیم و تکریم خدا سے بڑھ کر کی جائے اور ولی کو نبی سے بڑھا دیا جائے۔ والدین اور استاد کی تعظیم کی اپنی حد ہے۔ مُرشد اور ولی کا اپنا مخصوص مقام ہے اور اس مقام اور مرتبے کے موافق اس کی تعظیم لازمی ہے۔ اور نبی اور رسول کا مرتبہ اگرچہ تمام خلقِ خدا سے بڑھ کر ہے لیکن اسے اللہ تعالیٰ سے ہرگز نہیں بڑھانا چاہیے۔ اور جو تعظیم و تکریم یعنی سجدہ بغرضِ اظہارِ عبودیت اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لیے مخصوص ہے اس میں کسی بشر کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔

ع گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

اور ہر جگہ بے وجہ اور بے محل تواضع اور انکسار کو خواہ مخواہ اپنا شیوہ اور خو بنا لینا انسان کو اپنی اور غیر کی نظروں میں ذلیل کر دیتا ہے اور خود اعتمادی اور خودداری کے مفید جذبے کو بھی

فنا کر دیتا ہے اور انسان کو پست ہمت اور بے غیرت بنا دیتا ہے۔

تواضع گرچہ محمود[1] است فضلِ بیکراں دارد
نباید کرد بیش از حد کہ ہیبت رازیاں دارد

سو نیاز اور تواضع دو قسم کی ہے: ایک محمود، دوم مذموم۔ چنانچہ کسی بے دین دنیادار، مالدار یا دنیوی ظالم، فاسق، فاجر حاکم کی دنیوی طمع اور جلبِ منفعت کے لیے تعظیم وتکریم ناجائز اور ناروا بلکہ حرامِ مطلق ہے۔ حدیث میں آیا ہے: مَنْ تَكَرَّمَ غَنِيًّا لِغِنَائِهٖ فَقَدْ ذَهَبَ ثُلُثَا دِيْنِهٖ۔ یعنی جس شخص نے کسی دنیادار کی محض دنیا کی خاطر عزت اور تعظیم کی اس کا دو تہائی دین جاتا رہا۔ کتنی بڑی تہدید ہے۔ اہلِ سلف صالحین اس بارے میں بڑی احتیاط برتتے تھے اور کسی دنیادار کی عزت وتکریم کرنا بڑا بھاری گناہ سمجھتے تھے۔ بلکہ دنیاداروں اور اغنیا وملوک کے ساتھ سخت بے اعتنائی اور بے پروائی سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ آیا ہے کہ "اَلْكِبْرُ مَعَ الْمُتَكَبِّرِيْنَ عِبَادَةٌ" یعنی متکبر اور مغرور لوگوں کے ساتھ کبر کرنا اور خودداری سے پیش آنا ہی عبادت ہے۔ اور محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے والدین یا اپنے سے بڑی عمر والے خویش یا رشتہ دار سے تواضع ونیاز سے پیش آنا یا استاد یا کسی بزرگ نیک صالح یا کسی شریف النسب سید، قریشی، بزرگ زادہ یا پیر ومرشد کی عزت اور توقیر کرنا اور ان کے آگے تواضع اور نیاز سے پیش آنا محمود اور مبارک فعل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مسکین اور نادار بندے کی اہانت اور تحقیر محض اس کی ناداری اور افلاس کی وجہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی نظر سے گرا دیتا ہے اور اس کا مغضوب اور مقہور بنا دیتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی ﷺ کے اندر بے شمار موجود ہیں۔ اور سلف صالحین اور بزرگانِ دین کی کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ مقامِ عبرت ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلعم اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں۔ لیکن دو مقام پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے بھی ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے اور قرآنِ کریم میں ایسے واقعات کا ذکر آیا ہے۔ ایک واقعہ تو وہ ہے کہ حضرت سرورِ کائنات ﷺ ایک دن اشراف اور روسائے قریش کو دینِ اسلام کی باتیں سنا رہے تھے

---

[1] تواضع ہر چند پسندیدہ ہے۔ اور اس میں بے شمار فضیلتیں ہیں۔ مگر حد سے زیادہ اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس سے انسان کا وقار جاتا رہتا ہے۔

کہ ایک شخص نابینا صحابی عبداللہ ابن مکتومؓ اس مجلس میں آ گئے۔ اور بسبب نظر نہ ہونے کے آنحضرت صلعم کو تنہا خیال کیا اور آپ ﷺ کی بات کاٹ کر کچھ دین کی بات پوچھنے لگے۔ چنانچہ آں حضرت صلعم کو یہ ناگوار گذرا اور حضرت عبداللہ کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور منہ پھیر لیا۔ حضرت عبداللہ مجلس سے نا امید و ملول ہو کر چلے گئے۔ جس پر جبرئیل علیہ السلام بارگاہِ ایزدی سے یہ آئتیں لے کر آ گئے: عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ (عبس ۸۰: ۱ ـ ۱۱)۔ ترجمہ: ”محمد صلعم نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ جب کہ ان کے پاس ایک نادار نابینا مسلمان آیا۔ اور اے میرے نبی! تجھے کیا خبر تھی شاید اس نادار اندھے کی اصلاح ہو جاتی اور اسے ہدایت نصیب ہوتی یا نصیحت حاصل کرتا۔ اور اس نصیحت سے اسے فائدہ پہنچتا۔ لیکن جو شخص غنی اور بے پروا ہے اس کی طرف تو آپ ﷺ خوب متوجہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ آپ ﷺ کی نصیحت اور توجہ ان اشقیاء و اغنیاء کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی۔ اور تیرے ذمہ کوئی بات نہیں ہے کہ کوئی ہدایت پر نہ آئے۔ لیکن جو شخص (عبداللہؓ) تیرے پاس دوڑ کر آتا ہے، درآنحالیکہ وہ خدا سے ڈرتا ہے تو تو اس سے اعراض اور بے پروائی کرتا ہے۔“ جب یہ آئتیں آنحضرت صلعم پر اتریں تو آپ ﷺ کا رنگ مبارک فق ہو گیا اور آپ ﷺ فوراً مجلس سے اٹھ کر حضرت عبداللہؓ کے پیچھے چلے گئے اور اسے بغل میں پکڑ کر واپس مسجدِ نبوی ﷺ میں لے آئے اور ان کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا کر انہیں عزت واحترام کے ساتھ بٹھا دیا۔ اور ان کی بڑی دلجوئی اور دلداری فرمائی۔ اور ہمیشہ ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ اور دو بار انہیں اپنے پیچھے مدینے کا خلیفہ نائب اور حاکم مقرر کر کے آپ ﷺ سفر پر تشریف لے گئے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب جبرئیل علیہ السلام مذکورہ بالا آئتیں سنانے لگے تو میرے دل پر اللہ تعالیٰ کے جلال کی بڑے ہیبت چھا گئی اور میرا دل خائف اور لرزاں رہا۔ حتیٰ کہ آیت كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ (عبس ۸۰: ۱ ـ ۱۱) سنی اور دل کو سکون حاصل ہوا۔ اور آیت مذکور کے یہ معنی ہیں کہ یہ ”قرآن تو ہر کہ ومہ کے لیے عام اللہ تعالیٰ کی دعوتِ پند و نصیحت ہے اور اس میں کسی کے لیے خصوصیت اور امتیاز نہیں ہے۔“

ایک دوسرا واقعہ بھی اسی قسم کا قرآنِ کریم میں مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ مفلس اور نادار اصحاب کی ایک اچھی خاصی جماعت جنہیں اصحابِ صُفّہ کہتے تھے آنحضرت صلعم کے پاس موجود تھی۔ یہ لوگ وطن اور گھر بار چھوڑ کر احکامِ الٰہی سیکھنے اور کسبِ سلوک کے لیے آنحضرت صلعم کے پاس جمع ہو گئے۔ چونکہ ان کو رہائش اور سکونت کے لیے کوئی مکان میسر نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی رہائش کے لیے مٹی کا وسیع چبوترہ بنا رکھا تھا۔ چونکہ عربی زبان میں اس قسم کے چبوترے کو صُفّہ کہتے ہیں اس لیے ان کا نام اصحابِ صفّہ پڑ گیا تھا۔ بعض بزرگانِ دین کا قول ہے کہ لفظ صوفی اسی سے نکلا ہے۔ غرض یہ لوگ پورے تارک الدنیا اور متوکل علی اللہ تھے۔ متاعِ دنیا میں سے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ بمشکل سترِ عورت کے لیے ایک چادر یا گودڑی ہر ایک کے پاس ہوتی تھی اور قوتِ لایموت پر ان کا گذر اوقات تھا۔ دن رات یادِ الٰہی اور دیدارِ محمدی صلعم اور آپ ﷺ کی صحبت اور توجہ ان کی غذا تھی۔ آنحضرت ﷺ جس وقت ان کے درمیان تشریف لاتے تو یہ لوگ پروانوں کی طرح آپ ﷺ کی شمعِ جمال پر گر کر آپ ﷺ کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ دنیاداروں اور زرداروں کو ہمیشہ فقرا اور ناداروں سے نفرت رہا کرتی ہے اور ان کے ساتھ یکجا بیٹھنے میں اپنی ہتک اور توہین خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ صنادید اور رؤسائے قریش جب آنحضرت صلعم سے ملنے آتے اور آپ ﷺ کو ژولیدہ موئے اور گرد آلود درویشوں کے مجمع میں بیٹھا دیکھتے تو ان کو ان کے ساتھ اکٹھا بیٹھنے میں عار اور شرم محسوس ہوتی۔ ایک دن ان رؤسا اور امراء نے آنحضرت صلعم سے کہا کہ ہم جب کبھی آتے ہیں تو آپ ﷺ کو ان میلے کچیلے اور ننگے ملنگوں میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔ ہم آپ ﷺ کے پاس آپ ﷺ کی باتیں سننے کے لیے جب کبھی آیا کریں تو آپ ﷺ ان سے اٹھ کر ہمارے ساتھ ایک الگ جگہ میں بیٹھا کریں جہاں ان لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو۔ یا کم از کم ان سے منہ پھیر کر ہماری طرف متوجہ ہو جایا کریں۔ چونکہ آپ ﷺ دین اور دعوت کے معاملے میں حریص واقع ہوئے تھے اس لیے آپ ﷺ اس معاملے میں کوئی تجویز کرنے لگے تو اتنے میں جبرئیل علیہ السلام یہ آئتیں لے کر آئے: وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ

مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿الکھف ۱۸: ۲۸﴾۔ ”اے محمد صلعم! اپنے نفس کو ان درویشوں (اصحابِ صفہ) کی ظاہری میل کچیل اور گرد وغبار پر صابر اور قانع رکھ جو دن رات اپنے رب کی یاد میں محو اور مصروف ہیں اور ہر حال میں اس کی رضامندی وخوشنودی اور قرب ومشاہدہ ان کا مقصود اور مدعا ہے۔ ان لوگوں سے نظر اور توجہ ایک لحہ کے لیے بھی نہ ہٹا۔ اگر ایسا کیا تو گویا تو نے دنیا کی زیب وزینت کا ارادہ کر لیا۔ اور صنادید اور رؤسائے قریش کی بات نہ مان جن کے دل میری یاد سے غافل ہیں اور دنیوی اور نفسانی خواہشیں ان کا مقصود اور مطلوب ہیں۔ گو ظاہری صورت میں ان کی زندگی کامیاب معلوم ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا معاملہ ہیچ در ہیچ اور تباہ ہے۔“ ان حالات کو دیکھ کر سلف صالحین اور بزرگانِ دین دنیوی امراء اور رؤسا کی توہین وتحقیر اور خدا کے نیک، فقیر اور نادار بندوں کی تعظیم وتکریم میں بڑا بھاری غلو کیا کرتے تھے اور دنیا داروں اور زرداروں بلکہ بادشاہوں تک کو ایک مکھی اور جوں کے برابر بھی نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ لوگ اپنی نیت میں صادق تھے اور اللہ تعالیٰ کے نام کی رفعت اور بلندی ان کا مقصود تھا۔ ان کی روحانی طاقتیں فلک الافلاک پر پہنچی ہوئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بادشاہوں کو ان کا حلقہ بگوش غلام اور تابعدار بنا دیا تھا۔ کیونکہ اس زمانے کے نیک بادشاہوں پر یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی تھی کہ ان کی بادشاہی اور سلطنت کا قیام اور قوام ان قدسی نژاد ہستیوں کے پاک دم سے ہے۔ لہٰذا اس زمانے کے بادشاہ درویشوں کے درباروں میں سائل اور گداگروں کی حیثیت سے جایا کرتے تھے اور ان کے وسیلے اور دعا کے طفیل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اپنی مشکلات حل کراتے تھے۔ تاریخ کی کتابیں ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہم ان میں سے چند ایک مختصر واقعات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ حضرت میاں میر صاحبؒ ایک دن اپنے درویشوں کے ساتھ اپنے حجرے کی چھت پر صبح کے وقت رونق افروز تھے۔ اُس وقت آپ ایک درویش کی ران پر سر مبارک رکھ کر آرام فرما رہے تھے اور باقی درویش اپنی گودڑیوں میں سے جوئیں نکالنے میں مصروف تھے کہ اتنے میں آپؒ کے ایک درویش نے شہنشاہِ ہندوستان یعنی شاہجہان بادشاہ کو مع اُن کے بڑے فرزند دارا شکوہ کے حضرت میاں میر صاحبؒ کی زیارت کے لیے آتے

دیکھا تو ہنس دیا۔ آپؒ نے اُس درویش سے ہنسی اور خوشی کی وجہ پوچھی تو اس نے عرض کیا کہ جناب بادشاہ شاہجہان اور دارا شکوہ آپؒ کی زیارت کے لیے آ رہے ہیں۔ اس پر آپؒ نے فرمایا کہ ارے نادان! میں تو یہ سمجھا کہ تجھے اپنی گودڑی میں کوئی بڑی موٹی جوں مل گئی ہے جس سے تو خوش ہو رہا ہے۔ بے وقوف تو بادشاہ کے آنے سے دانت دکھا رہا ہے۔ غرض ان لوگوں کی نظروں میں بادشاہِ دنیا کی حقیقت جوں اور پسو سے بھی کم تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے نام کی ہیبت اور حشمت اور عزت وعظمت اُن کے وجودِ مسعود میں اس قدر تھی کہ بادشاہ ان کے رعب وجلال سے تھر تھر کانپتے تھے اور اُن کی کفش برداری کو اپنی سعادت اور فخر سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت حضرت میاں میر صاحبؒ کی قدم بوسی سے فارغ ہو کر جب شاہجہان اور دارا شکوہ ایک طرف کونے میں مسکینوں کے ساتھ بیٹھ گئے تو حضرت میاں میر صاحبؒ اس وقت الائچی خورد منہ میں چبا رہے تھے اور اس کا فضلہ اپنے منہ سے نکال کر تھوکتے جاتے تھے اور شاہجہان بادشاہ اُسے بطور تبرک اپنی شاہی چادر کے ایک کونے میں ہیروں اور جواہرات سے زیادہ قیمتی سمجھ کر جمع کرتے جاتے تھے۔

قدم بروں مگذر از سرائے درویشی — کہ مار گنج بود بوریائے درویشی
اگر زسیل حوادث جہاں شود ویراں — خلل پذیر نگردد بنائے درویشی
زباں درازیٔ تیغ وسناں بود چنداں — کہ از نیام نیاید عصائے درویشی
بکار ہر کہ فتد عقدہ دریں عالم — شود کشادہ زدست دعائے درویشی
بہشت اگرچہ مقامات دلنشیں دارد — نمے رسد بمقام رضائے درویشی
ہمائے فقر بہر کس نمے کند اقبال — وگرنہ نیست سرے بے ہوائے درویشی
دو عالم از نظرش چوں دو قطرہ اشک فتد — بدیدہ ہر کہ کشد توتیائے درویشی

منہ چوں مرکز ازیں حلقہ پا بروں صائب
کہ دل بوجد در آرد نوائے درویشی

(صائب تبریزی)

کتاب تذکرۃ الاولیا میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک رات خلیفہ ہارون الرشید نے فضل برمکی سے کہا کہ آج ہمیں کسی مردِ خدا کے پاس لے چلو کیونکہ اس دنیوی طمطراق اور

سلطنت کی سر دردی سے دل بیزار ہو گیا ہے۔ شاید قلب کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ سکون اور اطمینان حاصل ہو۔ فضل انہیں سفیانؒ عینیہ کے دروازے پر لے گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو سفیانؒ نے پوچھا کون ہے۔ کہا امیر المومنین دروازے پر تشریف لے آئے ہیں۔ سفیانؒ نے کہاں مجھے کیوں نہ پہلے اطلاع دی کہ میں خود حاضر ہو جاتا۔ جب ہارون الرشید نے یہ سنا تو کہا یہ وہ مرد نہیں ہے جسے میں طلب کرتا ہوں۔ سفیان نے یہ سن کر کہا کہ اگر مردِ خدا کی طلب ہے تو انہیں فضیل بن عیاضؒ کے پاس لے چلو۔ چنانچہ ہر دو وہاں سے شیخ فضیل بن عیاضؒ کی کٹیا پر گئے۔ شیخ صاحبؒ اس وقت یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الجاثیة ۴۵: ۲۱) ۔ ہارون نے کہا کہ اگر میں پند چاہتا تو یہی آیت میرے لیے کافی تھی۔ اس آیت کے معنی ہیں ''جن لوگوں نے بدکاری کو اپنا شیوہ بنالیا ہے کیا انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ہم اُنہیں نیکوکار مومنوں کے برابر کر دیں گے۔'' اس آیت نے ہارون کے دل پر تازیانہ عبرت کا کام کیا۔ پھر دروازے پر دستک دی تو شیخ صاحب نے پوچھا کون ہے۔ کہا امیر المومنین! جواب دیا۔ امیر المومنین کا میرے پاس کیا کام اور مجھے اس سے کیا مطلب؟ مجھے اپنے کام سے نہ نکالو اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اس پر فضل برمکی نے کہا کہ بادشاہِ اسلام کا بھی لوگوں پر کچھ حق ہوا کرتا ہے۔ فرمایا مجھے پریشان نہ کرو۔ فضل برمکی نے کہا اور اصرار کیا کہ اجازت سے اندر آئیں یا حکم سے۔ فرمایا اجازت نہیں ہے حکم سے آؤ تو تم جانو۔ ہارون اندر آئے تو شیخ صاحبؒ نے اپنا چراغ گل کر دیا تا کہ ہارون کے چہرے پر نظر نہ پڑے۔ ہارون اندھیرے میں آگے بڑھے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کا ہاتھ شیخ صاحبؒ کے ہاتھ پر جا پڑا تو آپؒ نے فرمایا: مَا اَلْیَنَ هٰذَا الْكَفُّ لَوْ نَجَا مِنَ النَّارِ۔ یعنی ''یہ ہاتھ کس قدر نرم ہے کاش دوزخ کی آگ سے بچ جائے۔'' یہ فرما کر نماز کی نیت باندھ لی اور نماز پڑھنے لگ گئے۔ ہارون رونے لگ گیا اور عرض کی کہ آخر کچھ تو ارشاد فرمائیے۔ شیخ صاحبؒ نے جب سلام پھیرا تو فرمایا کہ تمہارے دادا نے آنحضرت ﷺ سے کسی علاقے کی امارت طلب کی تھی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں آپ کو اپنے نفس پر حاکم اور امیر بننے کی تلقین کرتا ہوں۔ یعنی اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا امر کرتا رہ یہ ہزار سال تک خلقت کی امارت اور

عدالت سے تیرے لیے بہتر ہے۔ اِنَّ الْاَمَانَۃَ نَدَامَۃٌ "یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یعنی امیری اور حکومت قیامت کے روز جملہ حاکموں اور امیروں کے حق میں موجب ندامت اور باعثِ شرمندگی ثابت ہوگی۔" ہارون نے کہا کہ کچھ مزید ارشاد فرمایئے۔ فرمایا جب عمر بن عبدالعزیز تخت پر بٹھائے گئے تو انہوں نے سالم بن عبداللہ اور احیاء بن حیاۃ اور محمد بن کعب وغیرہ کو بلا کر کہا کہ میں ایک سخت آزمائش اور بڑے امتحان کے معاملے میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتا ہوں۔ مجھے نجات کا کوئی مختصر سا راستہ اور اُس پر چلنے کی آسان ترین تدبیر بتاؤ۔ اُن میں سے بوڑھے بزرگ نے فرمایا کہ اے امیر المومنین تدبیر یہ ہے کہ اپنی رعیت کے بوڑھوں کو اپنے باپ اور جوانوں کو مثل بھائیوں کے اور چھوٹوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھو۔ ہارون زار زار رونے لگا اور کہا کہ کچھ مزید ارشاد فرمایئے۔ فرمایا: میں تیرے اس خوب صورت چہرہ پر ڈرتا ہوں کہ قیامت کے روز بُرے اعمال کے سبب بدنما اور خراب نہ ہو جائے۔ کیونکہ بہت سارے امیر وہاں اسیر ہو جائیں گے۔ ہارون چلا چلا کر رونے لگا اور پھر عرض کیا کہ کچھ مزید ارشاد فرمایئے۔ فرمایا خدا تعالیٰ سے ڈرو اور روزِ قیامت کے حساب کے لیے مستعد اور تیار رہو۔ کیونکہ قیامت کے روز حق تعالیٰ تم سے ایک ایک مسلمان کی باز پرس کرے گا اور ہر ایک کا انصاف طلب کرے گا۔ اگر رات کو تیری اس طویل اور عریض سلطنت کے اندر ایک بوڑھی عورت بھی بھوکی سوئے گی تو کل تیرا دامن پکڑے گی۔ ہارون روتے روتے بے ہوش ہو گئے۔ اس پر فضل برمکی نے عرض کیا کہ اے شیخ! بس کرو آپؒ نے امیر المومنین کو مار ڈالا ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ اے ہامان! خاموش رہ کہ تو نے اور تیرے ہم نواؤں نے اسے ہلاک کیا ہے۔ ہارون کا گریہ ان الفاظ سے اور زیادہ ہو گیا۔ بعدہٗ کہا کہ سچ ہے اے فضل! تو ہامان ہے اور میں فرعون۔ پھر ہارون نے پوچھا کہ میں نے سنا ہے آپ پر کچھ قرضہ ہے۔ جواب دیا کہ ہاں! اپنے مالک کا میں بڑا مقروض ہوں۔ اگر اس قرضے سے میں زندگی میں سبکدوش نہ ہوا تو مجھ پر افسوس ہے۔ ہارون نے کہا میں مخلوق کے قرضے کی بابت پوچھتا ہوں۔ آپؒ نے جواب دیا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اس کی نعمت اور دولت میرے پاس بہت ہے۔ ہارون نے ہزار دینار کی تھیلی سامنے رکھ کر عرض کی کہ یہ چیز مجھے بطور میراث ماں سے ملی ہے۔ یہ حلال طیب ہے۔ اگر

آپؒ اسے اپنے اخراجات میں استعمال فرمائیں تو ہرج نہ ہوگا۔ شیخ نے آہِ سرد کھینچ کر فرمایا کہ افسوس میری اتنی نصیحت اکارت گئی اور تجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ یہاں بھی تم نے ظلم شروع کر دیا ہے اور بیدادگری کرنے لگ گئے ہو۔ میں تجھے نجات اور مغفرت کی طرف لاتا ہوں اور تو میری ہلاکت اور تباہی کے سامان تیار کر رہا ہے۔ میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو تم رکھتے ہو وہ اپنے حقداروں کو دے دو اور تم پرایا مال ایسے آدمی کو دے رہے ہو جس کے لینے کا وہ کسی طرح حقدار نہیں ہے۔ اے ہارون! کچھ شرم کر! اور خدا سے ڈر۔ یہ کہہ کر شیخ صاحبؒ ہارون کے سامنے سے اُٹھے اور دروازہ بند کر دیا۔ ہارون روتے ہوئے روانہ ہوئے اور فضل برمکی سے کہا کہ مردانِ خدا اس طرح ہوا کرتے ہیں جس طرح فضیل بن عیاض ہیں۔ ابیات جمالیؒ:

لُنگکے زیرو لُنگکے بالا نے غمِ رزق و نے غمِ کالا
گز کے بوریا و پوستکے دلکے پُر ز درد دوستکے
ایں قدر بس بود جمالی را عاشق رند لاابالی را

ترجمہ: درویش کے لیے احرام کی صورت میں صرف ایک چادر اُوپر اور ایک چادر نیچے چاہیے۔ اس کا دل روزی اور کپڑوں کے غم اور فکر سے فارغ ہو۔ بچھونے کے لیے ایک چٹائی یا چمڑے کا ٹکڑا کافی ہے اور اس کا دل دوست کے درد سے پُر ہو یعنی خانہ ویران اور دل معمور ہو۔ جمالیؒ کے لیے اور ہر عاشق رند لاابالی کے لیے دنیا میں اسی قدر سرمایہ اور سرو سامان کافی ہے۔

غرض اگلے زمانے کے بزرگانِ دین اللہ تعالیٰ کے سچے طالب اور صادق سالک ہوا کرتے تھے۔ وہ باطنی دولت اور روحانی ثروت سے مالا مال تھے۔ اس واسطے انکے دلوں میں نہ دنیا کی محبت اور نہ کچھ قدر و قیمت تھی اور نہ دنیاداروں کی عزت اور حرمت تھی۔ وہ ہر وقت موت کے مطالعہ میں محو تھے۔ دنیا کی زندگی اُن کی حقیقت شناس دور بین نظروں میں محض ایک فانی شے خواب و خیال کی سی معلوم ہوتی تھی۔ آخرت کی دارِ جاودانی' زندہ بیدار دُنیا اُن کی آنکھوں میں حقیقی طور پر جلوہ گر تھی۔ خواب کی خیالی اور فانی زندگی کو زندہ بیدار جاودانی زندگی سے کیا نسبت۔ خواب کی بادشاہی ایک دمڑی کو بھی مہنگی ہے۔

لذاتِ[1] جہاں چشیدہ باشی ہمہ عمر — با یار خود آرمیدہ باشی ہمہ عمر
چوں آخر وقت زیں جہاں خواہی رفت — خوابے باشد کہ دیدہ باشی ہمہ عُمر

(خیام)

ایک حکایت مشہور ہے کہ حضرت شیخ شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک شہزادہ آیا اور چند اشرفیوں کی تھیلیاں نذر گذاریں کہ یا حضرتؒ میں نے دنیا ترک کر دی ہے اور میری دنیا کی یہ سب پونجی آپؒ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں اور مجھے اپنا طالب بنا کر اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھائیں اور اُس محبوبِ حقیقی تک پہنچائیں۔ شیخ صاحبؒ نے وہ تھیلیاں اُس شہزادہ کے سر پر لاد کر ایک اپنا درویش ساتھ کر کے فرمایا کہ جاؤ اسے دریائے دجلہ میں ڈال آؤ۔ جب وہ تھیلیاں دریا میں ڈال کر شیخ صاحبؒ کے پاس واپس آئے اور عرض کیا کہ حضرتؒ وہ اشرفیاں ہم دریا میں ڈال آئے ہیں۔ اب مجھے حضور حلقۂ ارادت میں داخل فرمائیں اور اپنی غلامی میں منظور فرمائیں۔ شیخ صاحبؒ نے اپنے درویش سے دریافت فرمایا کہ شہزادہ نے اشرفیاں کس طرح اور کیونکر دریا میں ڈالیں۔ درویش نے عرض کیا کہ جناب شہزادہ ایک ایک تھیلی کا منہ کھولتا جاتا تھا اور مٹھیاں بھر بھر کر دریا میں ڈالتا جاتا تھا۔ اس طرح سب دریا میں ڈال دیں۔ آپؒ نے شہزادے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر بجائے اشرفیوں کے ان تھیلیوں میں گندگی بھری ہوتی تو اُنہیں کس طرح دریا میں ڈالتا۔ شہزادے نے کہا کہ جنابؒ سب کو تھیلیوں سمیت یکدم دریا میں پھینک دیتا۔ شیخ صاحبؒ نے فرمایا تیرے دل میں ابھی تک دنیا کی محبت جاگزیں ہے۔ اس لیے تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ یک دم تجھ سے جدا ہو۔ تو مٹھیاں بھر بھر کر اس واسطے انہیں دریا میں ڈالتا تھا کہ وہ ایک لحہ کے لیے تیرے پاس اور بھی رہے اور جب وہ تجھ سے جدا ہوتی جائے تیرا ہاتھ آخری بار محبوبۂ دنیا سے چھوتا جائے۔ تیرے لیے یہ سزا مقرر کرتا ہوں کہ ایک سال تک بغداد کی گلیوں میں بھیک مانگتا پھر۔ چنانچہ شہزادہ زنبیل لے کر بغداد میں گداگری کرتا رہا۔ تقریباً ایک سال گذرا ہوگا کہ شہزادہ ایک روز خالی زنبیل لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور

[1] اگر زندگی کی ساری لذتیں تو نے چکھی ہوں اور عمر بھر تو اپنے محبوب کے ساتھ خرم و خوشدل رہا ہو مگر بالآخر جب اس جہان سے رخصت کا وقت آئے گا تو یہ سب کچھ ایک خواب ہوگا جو تو عمر بھر دیکھتا رہا۔

عرض کیا کہ جناب آج سارا بغداد پھرا ہوں۔ کسی نے ایک ٹکڑا نہیں ڈالا۔ سب یہی کہتے رہے کہ تو بڑا بے حیا اور کم چور ہے۔ ہٹا کٹا موچھ ڈنڈا ہے۔ کام نہیں کرتا۔ ہر روز دروازے پر آ دھمکتا ہے۔ سارے شہر کو گندہ کر رکھا ہے۔ شیخ صاحبؒ نے فرمایا کہ بس اب تیرا امتحان پورا ہو گیا ہے۔ اب تجھے دنیا والوں کی بے مروتی بھی معلوم ہو گئی ہے کہ اللہ کے نام پر روٹی کا ایک ٹکڑا بھی دینا گوارا نہیں کرتے۔ اب امید ہے کہ اگر تیرے پاس اللہ کے نام کی دولت آ گئی تو اس کی قیمت جانے گا اور اس درِ گراں مایہ کو رائیگاں کتوں کے منہ میں نہ ڈالے گا۔ اس کے بعد شیخ صاحبؒ نے اُس شہزادہ کو حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا اور وہ واصلانِ حق میں سے ہو گیا۔ یہ مذکورہ بالا چند حکایتیں بطور مشتے نمونہ از خروارے بیان کر دی گئی ہیں۔ اس سے ناظرین اہلِ یقین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے اہلِ سلف صوفیوں اور فقیروں نے اپنی روحانی سائنس کی وہ فوق العادت کشف کرامات اور حیرت انگیز کرشمے دنیا کو دکھائے جنہیں دیکھ کر اس زمانے کے تمام لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ حتیٰ کہ ایک گداگر سے لے کر شاہانِ جہاں تک ہر کہ ومہ اور خاص و عام ان کے عاشق اور شیدائی ہو گئے اور ہر شخص اُن پر جان و مال تصدق کرنے اور لٹانے کے لیے تیار ہو گیا اور معرفت اور فقر کے گوہرِ بے بہا کا دل و جان سے خریدار ہو گیا۔ اگلے زمانے کے فقیر بھی اپنی متاعِ عزیز کی قدر و قیمت خوب جانتے تھے اور تمام دنیا کی بادشاہی کے عوض بھی اسے کسی کے حوالے کرنا سخت گھاٹے اور خسارے کا سودا خیال کرتے تھے۔ اُس زمانے کے سالک فقیر اور معرفت کے اصلی مالک ان لعل و جواہرِ آبدار کے صرّافِ حقیقی اور سچے دکاندار تھے۔ اور اُس زمانے کے طالب مرید بھی اپنی طلب میں صادق اور اس عزیز القدر متاع گرانمایہ کے دل، مال اور جان بلکہ دو جہان کے عوض بھی خریدار تھے۔ چنانچہ وہ حضرت ابن یمین کے مصداق تھے۔ حضرت ابن یمینؒ نے ان ابیات میں اگلے زمانے کے سچے فقراء کا صحیح نقشہ پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

## اَبیات

| | |
|---|---|
| نانِ جویں و خرقۂ پشمین و آبِ شور | سی ۳۰ پارۂ کلام و حدیثِ پیمبری |
| ہم نسخۂ دو چار زعلمے کہ نافع است | در دیں نہ لغو بو علی و ژاژِ عنصری |

تاریک کلبہ کہ پے روشنیءِ آں | بیہودہ ہمتے نہ بُرد شمع خاوری
---|---
با یک دو آشنا کہ چیزد بہ نیم جو | درپیش چشم ہمت شاں ملک سنجری
ایں آں سعادت است کہ حسرت برد برآں | جو یائے تخت قیصر و ملک سکندری

ترجمہ: درویش اور فقیر کے لیے اس دارِ دنیا میں جَو کی روکھی سوکھی روٹی، کھارا پانی اور اون اور پشم کا خرقہ اور گودڑی کافی ہے۔ اس سے زیادہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ مطالعہ اور پڑھنے کے لیے کلام اللہ کے تیس پاروں اور احادیثِ نبوی کا شغل بس ہے۔ اور علمِ دین کے حصول کے لیے بو علی سینا کی لغویات اور عنصری کی فضولیات سے قطع نظر دو چار مفید نسخے درکار ہیں۔ اور رہنے کے لیے ایک تاریک کوٹھڑی جو سورج کی روشنی سے بھی بے نیاز ہو کافی ہے۔ اور صحبت اور سوسائٹی کے لیے ایک دو ایسے مردانِ خدا ہوں جن کی بلند ہمت کے سامنے نیمروز اور سنجر کا ملک آدھے جو کی قدر و قیمت نہ رکھتا ہو۔ اگر یہ حال کسی کو حاصل ہو تو وہ سعادت مند ہے کہ جس پر تختِ قیصر کے طلب گار اور ملکِ سکندر کے متلاشی رشک اور حسرت کھائیں تو زیبا ہے۔

جب فقر اور درویشی کی یہ گرم بازاری اور اس میں دین و دنیا کی دائمی عزت اور سرداری اہلِ خلف یعنی پچھلے زمانے کے لوگوں کو نظر آئی تو محض دنیوی حصول اور عز و جاہ کی خاطر اکثر لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ چونکہ اہلِ سلف کے صادق سچے سالک محبوبیت اور معشوقیت کے مجسم پیکر تھے اس لیے ان کے کردار کی ہر ادا، ان کی گفتار کا ہر لفظ حتیٰ کہ ان کے مخصوص لباسِ تصوف یعنی صوف، خرقے اور گودڑی کے ہر تار سے محبوبیت ٹپکتی تھی۔ اور تسبیح، عصا اور سجادہ و کلاہ وغیرہ تقدس کے لیبل اور سائن بورڈ سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے پچھلے ریاکار، مکار صوفیوں اور جھوٹے فقیروں نے ان کی تجارت شروع کر دی اور ان چیزوں سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ اور مرغانِ سادہ لوح کو ان داموں میں خوب پھنسایا اور انہیں نوچ نوچ کر کھایا۔ لیکن دروغ کو ہمیشہ فروغ نہیں ہوا کرتا اور جھوٹ اور فریب کا پول آخر کھل جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی عیاریاں اور مکاریاں زمانے پر ظاہر ہو گئیں اور ان کا پردہ چاک ہو گیا۔ ان کے احوال اور افعال کا تعفن اور بدبو عیاں ہو گئی۔

کامل فقیر اور سچے سالک صوفی اگر دنیا میں مل جائیں تو ان کی جس قدر عزت اور تعظیم

کی جائے کم ہے۔ان کی خدمت میں جان و مال قربان کر دینا چاہیے۔ انکے قدموں کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنایا جائے۔ان کے حقوق تمام دیگر حقوق پر مقدم ہیں اور باقی تمام حقوق ان کے حقوق میں ادا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے یہ لوگ ملانے والے ہیں اور ان کی بارگاہ میں مقبول اور منظور کرنے والے ہیں۔ سعادتِ دارین اور گنجِ کونین کی کنجیاں ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہیں۔ جس شخص پر نگاہِ لطف و کرم ڈالتے ہیں اسے دین و دنیا میں مالا مال کر دیتے ہیں۔ جس سے وہ تمام اہلِ حقوق کے حق ادا کر دیتے ہیں۔

تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی ۔۔۔ نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو ۔۔۔ یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
(اقبالؒ)

اسلام میں خلافت اور امامت یعنی ملکی، مذہبی اور روحانی پیشوائی نہایت لازمی اور ضروری چیز ہے اور کسی لیڈر، راہبر اور راہنما کے بغیر نہ کوئی ادارہ قائم رہ سکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے۔ اور نہ اجتماعی زندگی بن سکتی ہے اور نہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ غرض ایک کامل مرد کا وجود زندگی کے ہر شعبے میں مثل مرکز ہوتا ہے جس پر اس شعبے کا دائرہ دائر اور رواں ہوتا ہے۔ یا جس طرح چکی محور پر چلتی ہے۔ غرض زندگی کے تمام اجتماعی کاموں میں رہبر، راہنما اور پیشوا کا وجود اس طرح ضروری ہے جس طرح ریل گاڑی اور موٹر لاری کے لیے انجن ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو اسلام، ایمان، ایقان اور عرفان کے سلک میں منسلک کرنے کے لیے اہلِ کامل رہنما کا وسیلہ اور واسطہ اس طرح ضروری ہے جس طرح تسبیح کے دانوں کو ایک لڑی اور سلک میں منسلک کرنے کے لیے ایک تار اور تاگے کا وجود لازمی ہوتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (اٰلِ عمرٰن ۳: ۱۰۳) میں اسی وسیلے اور واسطے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی مردِ کامل کا وجود بمنزلہ ایک رسی کے ہے۔ اس کے ساتھ سب اکٹھے چمٹ جاؤ اور اس سے علیحدہ اور تفرق اختیار نہ کرو۔ نماز باجماعت پڑھنے کی اس لیے سخت تاکید ہے کہ اس میں ایک امام اور باقی مقتدیوں کا امام کے حکم اشاروں پر کام کرنے میں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (اٰلِ عمرٰن ۳: ۱۰۳) کا صحیح نقشہ کھنچ جاتا

ہے۔ قولہ تعالیٰ: وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ○ (یٰسٓ ۳۶: ۱۲)۔ یعنی: ”ہم نے ہر چیز ایک امامِ مبین کے وجود میں جمع کردی ہے۔“ قیامت کے روز بھی یہی نقشہ ہوگا کہ ہر قوم، ہر گروہ اور ہر امت اپنے ایک پیشوا اور امام کے پیچھے چلے گی اور پیش ہوگی۔ قولہ تعالیٰ: يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ (بنیٓ اسرآئیل ۱۷: ۷۱) ترجمہ ”جس دن ہم بلائیں گے ہر فرقہ کو ان کے سرداروں کے ساتھ۔“ اس لیے اللہ تعالیٰ کے نیک برگزیدہ بندوں کی تعظیم اور تکریم چونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے کی جاتی ہے اس لیے یہ تعظیم بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہوا کرتی ہے۔ البتہ دنیاداروں اور زرداروں کی محض دنیوی لالچ اور طمع کی غرض سے تعظیم و تکریم کرنا خدا کے نزدیک مکروہ، معیوب اور حرام ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی تعظیم و تکریم میں اللہ تعالیٰ کی عزت و توقیر مضمر ہے اور دنیا و دنیاداروں کی اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ہر جگہ مذمت فرمائی ہے اور ان کی عزت و تعظیم اور ان کی متابعت سے اپنے رسول کو منع فرمایا ہے۔ احمد اور ترمذی اور ابن ماجہ نے سہل ابن سعد سے یہ حدیث روایت کی ہے: لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَّا سَقٰى كَافِرًا مِّنْهُ شَرْبَةَ مَآءٍ۔ ”اگر دنیا کی قدر و قیمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو پانی کا ایک ٹھنڈا گھونٹ بھی نصیب نہ ہوتا۔“ اہلِ سلف بزرگانِ دین خدا کی برگزیدہ ہستیوں کی تعظیم و تکریم اور دنیاداروں کی اہانت اور تحقیر میں حد درجہ مبالغہ اور غلو فرماتے رہے ہیں۔ اور اس دستور العمل اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی کا باعث سمجھتے رہے ہیں۔ لہٰذا اولیاء اللہ اور انبیاء اللہ کی تعظیم و تکریم محمود ہے اور دولتمندوں اور اغنیا کی تعظیم مذموم ہے۔ بنی آدم کے ساتھ شیطان بڑے زبردست داؤ کھیلتا ہے اور جس طرح بن آئے انہیں خدا کی برگزیدہ ہستیوں سے بدظن اور بدگمان کرتا ہے اور ان کی تعظیم کا منکر بلکہ ان کا دشمن بنا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ان کا نام عزت اور تعظیم سے لینے بھی لگے تو انہیں سخت چڑ لگتی ہے۔ بزرگانِ دین کے بغض اور عناد پر شیطان اپنے ہم مشرب اور ہم نوا لوگوں کو طرح طرح کے باطل دلائل اور حجتوں سے مضبوط اور قائم رکھتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ تو موحد ہے اور توحید اصل کار ہے اور کبھی کہتا ہے اللہ تعالیٰ شاہ رگ سے نزدیک خود سمیع و بصیر اور قریب و مجیب ہے۔ انسانوں کو حیلے وسیلے اور شفاعت کی کیا ضرورت ہے۔ انبیا اور اولیا

اللہ بھی ہماری طرح انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ سفارش اور وسیلہ عدل کے منافی ہے۔ اور کبھی اس کے دل میں یہ وہم ڈالتا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ حقیقی بادشاہ کا ماننے والا اور طرفدار ہے اور تیرا پلہ بہر حال بھاری اور وزن دار ہے اور انبیا و اولیا کے ماننے والے تو انسانوں کے پرستار ہیں۔ اور انبیا اور اولیا خواہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں جائیں اللہ تعالیٰ کے آگے پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ غرض اس قسم کے باطل خیالات اور فاسد واہمات سے شیطان اپنے ہم جنسوں کی راہ مارتا ہے اور یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (النسآء ۴: ۱۵۰) کے طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق ڈالتا ہے اور انہیں ایک دوسرے کی ضد اور غیر ثابت کر کے راہِ راست سے بھٹکاتا ہے اور کبر و انانیت اور حسد کی شیطانی راہ پر چلاتا ہے۔ اور شرک کا خوف دلا کر انہیں بسبب کبر و استکبار خود اللہ تعالیٰ کا شریک بناتا ہے۔

بھلا جو لوگ خدا کے دوستوں کو مانتے اور ان کی تعظیم اللہ تعالیٰ کے لیے کرتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں رفیق اور راہبر بناتے اور اس راہ میں ان کی تعظیم اور تابعداری کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو ان جھوٹے مدعیوں کی نسبت لاکھ درجے بہتر مانتے اور جانتے ہیں۔ ایک شخص بادشاہ کے ماننے اور اس کی تعظیم و تکریم کا محض زبانی طور پر دور سے مدعی ہے اور دوسرا اس کی شمعِ جمال پر پروانہ وار مرتا ہے، اس کی طرف بمقتضائے فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ؕ (الذّٰریٰت ۵۱: ۵۰) دوڑتا ہے اور اس راہ کے رفیقوں اور راہبروں کی خدمت کر کے ان سے اس راہ میں مدد طلب کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے کوچے کی خاک کو آنکھ کا سرمہ بناتا ہے۔ تو بتاؤ کہ پہلے آدمی کے دل میں بادشاہ کی زیادہ عزت و عظمت اور توقیر ہے یا دوسرے کے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی نادیدہ تعظیم و تکریم یعنی عبادت میں ان کے نفس کی سرکوبی اور تذلیل نہیں ہوتی اس لیے وہ کیے جاتے ہیں۔ اور اس پر اتراتے اور نفس و شیطان کو فربہ بناتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی مقدس ذات بھی کسی مرئی صورت میں جلوہ گر ہو کر ان کے سامنے آ جائے تو یہ لوگ فوراً انکار کرنے لگ جائیں گے۔ یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ وَّیُدۡعَوۡنَ اِلَی السُّجُوۡدِ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ۙ خَاشِعَۃً اَبۡصَارُہُمۡ (القلم ۶۸: ۴۲ ۔ ۴۳)۔

ترجمہ: ’’جس دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی ظاہر فرمائیں گے اور ان لوگوں کو سجدہ کے لیے کہا جائیگا

تو یہ لوگ سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ اور ان کی آنکھیں شک وشبہ کے خوف سے خیرہ رہ جائیں گی۔" مختصر یہ کہ مرشد کے وسیلے کے بغیر نفس کی انانیت اور فرعونیت ہرگز دور نہیں ہو سکتی اور نفس نہیں مرتا۔

نفس نتواں کشت الّا ظلِّ پیر　　دامنِ ایں نفس کش را سخت گیر
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے　　بوسہ زن برآستانے کاملے
گر تو سنگِ خارا یا مرمر شوی　　چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی
یک زمانہ صحبتے با اولیاء　　بہتر اس صد سالہ طاعت بے ریا

ترجمہ: پیر کی مہربانی کے سوا نفس کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس نفس کو مارنے والے کا دامن مضبوطی سے پکڑ۔ اپنی مٹھی بھر مٹی یعنی جسم سے کیمیا بنا۔ اور اس کے لیے کسی کامل کی چوکھٹ کو بوسہ دے۔ اگر تو سنگِ خارا یا سنگِ مرمر کی طرح ناقص ہو جائے تو جب کسی صاحب دل کے پاس پہنچے گا تو گوہر بن جائے گا۔ کسی اولیا کی ایک لحظہ کی صحبت سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔

طالب کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں مرشد راہبر کا دامن ضرور پکڑے کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ محض زبانی اقرار کو سب کچھ سمجھتے ہوئے اپنی کور چشمی پر صابر ہیں اور چمگادڑ کی طرح تاریکی میں مگن اور خوش ہیں اور آفتابِ عالمتاب کی انہیں ضرورت نہیں ہے وہ مجبور اور معذور ہیں کیونکہ ان کے دل مادے کی ظلمت میں محصور اور غفلت کے غلاف میں مستور ہیں۔ مرشد کے وسیلہ کے بغیر اس راہ میں چلنا محال ہے۔ قولہ تعالیٰ: يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِىْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (المآئدة ۵: ۳۵)۔ ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لے آئے ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ پکڑ کر اس کی راہ میں سعی اور کوشش کرو۔ شاید تم چھٹکارا پالو۔" بعض لوگ کہتے ہیں کہ وسیلے سے مراد نیک عمل ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا خطاب ایمانداروں سے ہے کہ تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کرو اور اس کی راہ میں مجاہدہ اور ریاضت کرو۔ لیکن اس کے علاوہ اس کی طرف وسیلہ پکڑو۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وسیلہ ایمان، پرہیز گاری اور مجاہدے کے علاوہ کوئی اور چیز ہے جس کا خاص طور پر اللہ تعالیٰ امر فرماتے ہیں اور اسے ایمان اور تقویٰ وغیرہ پر

عطف کرتے ہیں۔ سو یہاں صاف طور پر معلوم ہے کہ یہاں وسیلہ سے مراد نہ ایمان، نہ علم اور نہ نیکی اور تقویٰ ہے۔ بلکہ اس سے مراد مرشد اور شیخ کامل رفیق راہبر راہِ مولیٰ ہے۔ سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کا امر فرمایا ہے۔ اول ایمان لانا، دوم تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرنا، سوم وسیلہ پکڑنا، چہارم مجاہدہ کرنا۔ سو وسیلہ پکڑنے کے بعد اس لیے مجاہدے اور ریاضت کا امر ہے کہ بعض لوگ محض حیلے، وسیلے اور شفاعت کے پندار اور گھمنڈ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر عمل کرنے سے رہ جاتے ہیں اور محض مرشد پکڑنے یا کسی مذہبی پیشوا کی شفاعت کو اپنی نجات کا سرٹیفکیٹ اور پروانہ سمجھ کر خود عمل نہیں کرتے جیسا کہ عیسائیوں نے کفارے کا مسئلہ گھڑ رکھا ہے اور شیعہ لوگ محرم کے دنوں میں صرف تعزیہ نکالنے اور اس روز ماتم کی محافل میں شامل ہونے اور رونے دھونے کو موجبِ نجاتِ ابدی خیال کرتے ہیں۔ لیکن بغیر وسیلہ علم، عمل، تقویٰ اور مجاہدہ کے خشک خرمن کو شیطان کبر و انانیت کی ایک چنگاری سے جلا کر خاکستر کر دیتا ہے جیسا کہ اس کے اپنے خرمنِ علم و عمل کا حشر ہوا۔ اور بغیر علم و عمل و مجاہدہ خالی وسیلے پر اعتماد کر لینا گمراہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ سو راہِ سلیم اور صراطِ مستقیم ان ہر دو کے بیچ میں سے بال سے باریک اور تلوار سے تیز پل صراط کی طرح ہے اور امتحان کا پردہ اور آزمائش کی سخت تاریکی اس پر چھائی ہوئی ہے۔ سو یہ صراطِ مستقیم اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی کوشش اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی کشش کے درمیان ہے۔ اور یہ راز عوام تو کیا خواص سے بھی پنہاں ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ خالی اِیَّاکَ نَعْبُدُ پر عمل کرنے والا شیطان کی طرح مغضوب اور مقہور ہو جاتا ہے اور خالی اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے گھمنڈ اور پندار میں بزرگوں کے آستانوں پر آلتی پالتی مار کر دھرنا لگا لینا گمراہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور مقبول لوگوں کا راستہ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے وہ نہ مغضوبوں کا راستہ ہے اور نہ گمراہوں کا۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ ان لوگوں کی رفاقت اور متابعت اصل صراطِ مستقیم اور نجات کا راستہ ہے۔ اور وہ لوگ یہ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ج وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ۝ (النسآء ۴: ۶۹)۔ ترجمہ: ''وہ

لوگ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے وہ انبیا علیہم السلام کا گروہ، صدیقین کا فرقہ، شہیدوں کا لشکر اور صالحین کا ٹولہ ہے۔ اور رفاقت و رہبری کے لیے یہ بہت عمدہ اور اچھے لوگ ہیں۔'' سو اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس میں پرواز کے لیے سالک کو اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہ کے ہر دو بال و پر لازمی اور ضروری ہیں۔ اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِہٖٓ اَھْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ہ (الملک ۶۷: ۲۲)۔ قاعدے کی بات یہ ہے کہ جو پرندہ ایک پر سے اڑتا ہے وہ سرنگوں ہو کر تھوڑا سا اڑتا ہے اور بعدہٗ گر جاتا ہے۔ اور دو پروں والا پرندہ سیدھا اڑ جاتا ہے۔

ایں زہد فروشاں[1] ز خدا بے خبر انند ایں دست و دہن آب کشاں پاک برانند
از مردم افتادہ مدد جوئے کہ ایں قوم با بے پروبالی پر وبالِ دگرانند

جس قدر طالبِ مولا کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں مرشدِ کامل کی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ اسے جانچ پڑتال اور حق و باطل اور کامل و ناقص کے درمیان تمیز کی ضرورت ہے۔ کیونکہ گندم نما جو فروش آدم صورت، دیو سیرت، جھوٹے لباسی، ریاکار دکاندار مشائخ دنیا میں حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ طالب کو تاریکی میں لکڑیاں جمع کرنے والے کی طرح نہیں ہونا چاہیے ورنہ کبھی سانپ کو لکڑی سمجھ کر ہاتھ لگائے گا اور ہلاک ہو جائے گا۔ خدا کے خالص کامل بندے دنیا میں مثل عنقا بہت کمیاب ہیں اور جھوٹے دکاندار، مکار، ریاکار شکاری بے شمار ہیں جو دامِ تزویر پھیلا کر مرغانِ سادہ لوح کو شکار کرتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست
(رومیؒ)

ترجمہ: (اے طالب) بہت سے ابلیس آدمی کی شکل میں پھرتے ہیں لہٰذا ہر ایک ہاتھ میں ہاتھ نہیں دے دینا چاہیے۔

---

[1] یہ پارسائی کی نمائش کرنے والے خدائے تعالیٰ سے بے خبر ہیں۔ یہ ہاتھ منہ دھونے والے اور جسم پاک رکھنے والے ہیں (باطنی پاکیزگی اور معارف خاصہ سے ناآشنا ہیں)۔ تو عاجز و منکسر اہلِ فقر سے مدد حاصل کر۔ یہ لوگ اگرچہ خود بے پر و بال ہیں مگر دوسروں کے لیے سامانِ پرواز ہیں۔

بلکہ آج کل تو جھوٹ کو فروغ ہے۔ جب لوگوں کی مذہبی ذہنیت کا دیوالیہ نکل چکا اور ان میں حق و باطل اور کھرے کھوٹے اور اصلی و نقلی کے درمیان تمیز کرنے کی سمجھ ہی نہ رہی اور لوگ نقلی پوتھ اور جھوٹے شیشے کے ٹکڑوں کو ہیروں کی قیمت پر خریدنے لگ گئے تو اصلی ہیروں کے مالکوں اور جوہریوں نے اپنی دکانیں سمیٹ لیں اور جھوٹے نقل فروش دکانداروں نے اپنی دکانیں سجالیں اور انہوں نے بے وقوف خریداروں کو خوب لوٹا۔ افسوس ہے کہ ان جھوٹے دکانداروں نے صرف ولایت اور نبوت تک اپنے جھوٹے دعووں کو محدود رکھا۔ ورنہ اگر ذرا جرأت سے کام لے کر اس مذہبی آزادی کے زمانے میں ان عقل کے دشمنوں کے سامنے خدائی کا دعویٰ بھی پیش کر بیٹھتے تب بھی ان کو ماننے کے لیے لاکھوں بے وقوف تیار ہو جاتے ہیں۔ افسوس صد افسوس! جن لوگوں کو اپنے ایمان کا بھی پتہ نہیں انہیں علی کرم اللہ وجہہ کا اوتار اور ایک ہی وقت میں نبی، مجدد اور مسیح، موعود اور کرشن وغیرہ سب بے سروپا دعووں میں سچا اور حق بجانب سمجھا جاتا ہے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

امروز[1] قدرِ گوہر و خارا برابر است باد سموم و بادِ مسیحا برابر است
چوں در مشامِ اہلِ جہاں نیست امتیاز سرگینِ گاؤ و عنبرِ سارا برابر است

انسان بڑا حیلہ جو اور کم چور واقع ہوا ہے اور ہر کام میں آسانی پیدا کرنے کا خوگر ہے۔ ہر مذہب اور ملت میں چڑھاؤ اور اتار یعنی ترقی اور تنزل کا دور ہوتا ہے اور جب کسی ملت کے تنزل کا دور شروع ہوتا ہے تو اس کے پیرو ضعیف الاعتقاد اور ناقص الیقین ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان کے دو گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک تو وہ گروہ جو بسبب اپنے زہدِ خشک کے مذہب کے خالی پوست اور چھلکے کو اختیار کر لیتا ہے۔ تمام مذہبی ارکان کو محض رسمی اور رواجی طور پر ادا کرتا ہے۔ یہ لوگ صرف اِقرارِ زبانی اور معمولی ورزشِ جسمانی اور خفیف مالی قربانی کو بہشتِ جاودانی اور معرفت و دیدارِ ربانی کی کافی قیمت سمجھتے ہیں۔ اور اس تھوڑے سے عمل کے بدلے بہشت کے پکے امیدوار اور بے دام خریدار بن جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ دین کا

---

[1] آج اس دور میں موتی اور پتھر کی قدر و منزلت یکساں ہے۔ بادِ سموم (زہریلی ہوا) کا جھونکا اور دمِ عیسیٰ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پھونک) برابر ہے۔ جب اہلِ عالم کی قوتِ شامہ خوشبو اور بدبو میں امتیاز نہیں کر سکتی تو گائے کا گوبر اور عنبر سارا برابر ہے۔

چھلکا محض پھیکا اور بدمزہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں وہ کوئی پائدار حظ اور ترقی نہیں پاتے لہٰذا وہ رفتہ رفتہ آخر میں اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ یا وہ اس کام کو محض ریا اور دکھلاوے کے طور پر کرتے ہیں اور دینی ارکان کی ادائیگی میں بھی دنیوی مفاد کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ان لوگوں میں خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی آنکھ میں تجسس اور دل میں چوں چرا کا مادہ غالب ہوتا ہے۔ ان کی آنکھ سخت عیب بین ہوتی ہے۔ یہ لوگ پیغمبروں اور اولیا اور تمام بزرگانِ دین کو اپنے برابر سمجھتے ہیں۔ کسی کو اپنے سے بہتر نہیں سمجھتے۔ اس واسطے یہ لوگ مذہبی پیشواؤں اور روحانی رہنماؤں کو ہمیشہ عیب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے ساتھ بغض و عناد رکھتے ہیں۔ اور پیغمبروں کے معجزات اور اولیا کے کشف و کرامات اور تمام فوق العادت روحانی کمالات کا انکار کرتے ہیں یا ان کی مادی رنگ میں سخت ناروا تاویلیں کرتے ہیں۔ چونکہ دین ان پاک ہستیوں یعنی انبیا اور اولیا کے ذریعے اور واسطے سے ہم تک پہنچا ہے لہٰذا ان بزرگ ہستیوں کی عزت اور توقیر دین کی عزت اور توقیر سے وابستہ اور متعلق ہے۔ یہ لوگ جب دین کے ان بانیوں اور مبلغوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ اس دین کو بھی سبک اور حقیر جاننے لگ جاتے ہیں جو ان کے واسطے اور ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ حقارت اور نفرت دین کے انکار پر منتج ہو جاتی ہے اور انہیں کفر اور الحاد کے گڑھے میں گرا دیتی ہے۔ دوسرے گروہ پر چونکہ حسنِ ظن غالب ہوتا ہے وہ خواہ مخواہ معمولی بات کو بڑی اہمیت دینے لگ جاتے ہیں۔ ان کی آنکھ بڑی ہنر بین ہوتی ہے اور ہر بات کو خواہ وہ عقل اور سمجھ کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہو، ماننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ مذہبی پیشواؤں اور روحانی رہنماؤں کو دین اور دنیا کے ظاہری و باطنی خزانوں کے مطلق العنان مختار اور بہشتِ بریں اور تمام نعمائے آخرت کے واحد اجارہ دار اور ٹھیکیدار خیال کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شفاعت اور سفارش کے غرور اور پندار میں بہشت کے پکے دعوے دار بن جاتے ہیں۔ اور تمام دینی ارکان کو بالائے طاق رکھ کر اپنے آپ کو جملہ مذہبی قیود اور دینی پابندیوں سے آزاد سمجھتے ہیں۔ بلکہ شفاعت کے پندار اور سفارش کے گھمنڈ میں وہ ہر قسم کے گناہ اور نواہی کے ارتکاب میں دلیر ہو جاتے ہیں۔ شیطان اس گروہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں اکثر علمائے بے عمل اور ناقص جھوٹے مشائخین کے دامِ

تزویر میں پھنسا دیتا ہے۔ اور ریا کار مشائخ اور علمائے بے عمل چونکہ دین کی آڑ میں دنیا کا شکار کرتے ہیں اس لیے یہ جھوٹے دکاندار پیر اکثر ایسے بے وقوف لوگوں کا دل بہلانے اور فریفتہ کرنے کے لیے انہیں جھوٹی تسلیاں دیا کرتے ہیں۔ اور جھوٹے کشف کرامات اور خالی لاف وگزاف سنا کر انہیں پھنسائے رکھتے ہیں۔ انہیں کہتے ہیں کہ بس سال کے سال ہمارا اخراج اور نذرانہ ادا کر دیا کرو اور ہماری زیارت کر لیا کرو، بس ہمارے دامن لگ گئے ہو، ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں آخرت کا کوئی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ ہم تمہارے ذمہ دار ہیں۔ تمہیں عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ بھی کفارے کی اس آسان صورت کو غنیمت سمجھ کر سال کے سال ٹیکس اور نذرانہ ادا کرنے اور سال کے بعد ایک دفعہ پیر کے پاؤں چومنے کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ ہر روز پانچوں وقت نمازیں ادا کرنے اور سال میں تیس روزے رکھ کر بھوکا پیاسا مرنے، ہر سال زکوٰۃ ادا کرنے اور حج کے لیے دور دراز پر خطر سفر اختیار کرنے اور ہر وقت دینی قیود اور پابندیوں میں جکڑے رہنے اور ساری عمر موت تک عمل، مجاہدے اور ریاضتِ شاقہ کے مقابلہ میں بس پیر کے اس آسان وسیلے اور شفاعت وحیلے کو اُخروی نجات اور حصولِ بہشت کے لیے بہت آسان اور مفت کا سودا سمجھ لیتے ہیں۔ لہٰذا تمام عمر اس امید پر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دراصل انسان کی فکری اور ذہنی گمراہیوں کا سرچشمہ یہی دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان عقل اور علم سے اس قدر عاری اور غافل ہو جائے کہ ہر بات کو بے سوچے سمجھے قبول کرلے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے۔ دوم یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالا نظر آئے یا مادی عقل پر منطبق نہ ہو سکے اسے فوراً جھٹلا دے اور یقین کرلے کہ جس شے کو اس کی عقل یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کر سکتی وہ شے حقیقتاً وجود نہیں رکھتی۔ اول الذکر کو ضلال اور گمراہی کہتے ہیں اور موخر الذکر کو کفر اور الحاد۔

اے انسان! اللہ تعالیٰ تجھ سے خالی ماننے کا طالب نہیں۔ اس کا امر ہے فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ط (الذّٰریٰت ۵۱: ۵۰) یعنی اللہ کی طرف دوڑ جاؤ۔ اور نیز ارشاد ہے: اَتَصْبِرُوْنَ ج وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝ (الفرقان ۲۵: ۲۰) ۔یعنی آیا تم صبر کیے بیٹھے ہو۔ حالانکہ تمہارا رب تمہاری طرف دیکھ رہا ہے اور تمہارا منتظر ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى

رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ ﴿الانشقاق ۸۴:۶﴾۔ ترجمہ: "اے انسان تو اللہ تعالیٰ کی طرف کوشش اور سعی کرنے والا اور آخر کار اس سے ملنے والا ہے۔" اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان نہ کوئی دور دراز مسافت ہے اور نہ پہاڑ جنگل اور دریا حائل ہیں۔ بندے اور رب کے درمیان نہ کوئی مسافتِ مکانی ہے اور نہ بُعدِ زمانی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں انسان کی شاہ رگ اور اس کی جان سے زیادہ اس کے قریب ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ اور اس بندے کے درمیان محض ظلمت کے معنوی حجاب حائل ہیں۔ جیسا کہ انسان سو جانے اور خوابِ غفلت میں پڑ جانے سے تمام دنیا اور اپنے قریبی ہم نشین بلکہ تن بدن سے بھی بے خبر اور غافل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی روح ازل کی گہری نیند میں پڑی ہوئی اپنے قریبی مالک اور حقیقی رب سے دور ہے۔ یہ مسافت اور بُعد محض قلبی اور معنوی قدموں سے طے ہوتی ہے اور بس۔ یہ جسدِ عنصری کی تگ و دو کا کام نہیں۔

آج کل سخت قحط الرجال ہے۔ کامل عارف اور طالب صادق کا وجود عنقا مثال ہے۔ زمانے سے مذہب اور روحانیت کی روح نکل گئی ہے۔ مغز ضائع ہو گیا ہے۔ دین اور مذہب کا محض چھلکا اور پوست رہ گیا ہے۔ ظلمت کی کالی گھٹائیں دلوں پر چھا گئی ہیں۔ اس اندھیری اور اندھی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سچے صادق سالکوں نے خمول اور گمنامی کی چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو چھپا لیا ہے۔ اور دیو سیرت اور عفریت صفت لوگ سلیمانی لباس پہن کر تختِ مشیخت پر جلوہ افروز ہو گئے ہیں۔ اور نادان و سادہ لوح لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ مکار دکاندار طرح طرح کے ناز اور کرشموں سے لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ بعض نے فقر کے خالی لباس سے، بعض نے صوفیانہ شکل و شباہت اور طرزِ ادا سے، بعض نے زبانی قیل و قال سے مثلاً مسائلِ تصوف اور پرانے بزرگوں کے قصے کہانیوں سے اور بعض نے اپنے خاندانی تقدس اور نسب و نسل کے بل بوتے پر مشائخی اور بزرگی کی دکان کو گرم کر رکھا ہے۔ غرض بزرگی اور مشائخی کے بیت المقدس کی تعمیر کی خاطر بعض نے سلیمان کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو کھڑا کر رکھا ہے۔ بعض نے اسے لباس پہنا رکھا ہے۔ بعض نے اس کے ہاتھ میں عصا دے رکھا ہے کہ اس کے سہارے کھڑا رہے۔ بعض نے تسبیح لٹکا رکھی ہے۔ بعض نے سامنے سجادہ بچھا دیا ہے تا کہ وہ زندہ سلیمانؑ دکھائی دے اور بھولے بھالے

سادہ لوح اور خوش اعتقاد طالب مسخر جنات کی طرح اس نمائشی بیت المقدس کی تعمیر میں تن من دھن سے خدمت بجالائیں۔ یہ دل کے اندھے دن رات مشیخت کی مردہ لاش کو زندہ سلیمانؑ خیال کر کے اس کی خدمت دل و جان سے بجالاتے ہیں۔ آخر مرور زمانہ سے جب عصائے مشائخی کو دیمک کھا جاتی ہے اور بے جان ہڈیوں کا سلیمان گر پڑتا ہے تب جا کر کہیں ان نادان احمق جنوں کو سمجھ آتی ہے کہ ہم تو ایک بے روح اور بے جان سلیمانؑ کی اطاعت میں عمرِ گراں مایہ صرف کرتے رہے ہیں۔ اور اس وقت ان بھولے بھالے سادہ لوح جنات کو تسخیر کی اس زنجیرِ تزویر سے نجات ملتی ہے۔

| | |
|---|---|
| در جامۂ[1] صُوف بستہ زُنّار چہ سُود | در صومعہ رفتہ دل ببازار چہ سُود |
| زآزارِ کساں راحتِ خود مے طلبی | یک راحت و صد ہزار آزار چہ سُود |

غرض طریقت کے اس بہت نازک، باریک اور سخت تاریک پل صراط پر صحیح اور سلامت چل کر بہشتِ قرب و وصال میں داخل ہونا نہایت مشکل اور دشوار کام ہے۔ انسان اس دنیا کے اندر سخت آزمائش اور کٹھن امتحان میں مبتلا ہے۔ ہزاروں لاکھوں میں سے کوئی ایک آدھ طالب بلند ہمت اور سعادت منداس میدان سے گوئے سبقت لے جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| گہ ناز کند فرشتہ[2] بر پاکئ ما | گہ دیو کند عار زنا پاکئ ما |
| ایماں چو سلامت بلب گور بریم | احسنت بریں چستی و چالاکئ ما |

---

[1] صوفیانہ لباس کے اندر زُنار باندھنے سے کیا فائدہ ہے۔ مسجد میں جا کر دل کو سیرِ بازار میں مصروف رکھنا بے کار ہے۔ لوگوں کو ستانے میں تجھے راحت ملتی ہے۔ ہزار تکلیفوں کے عوض ایک آرام حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہے۔

[2] کبھی تو فرشتہ بھی ہماری پاکیزگی پر فخر کرتا ہے اور کبھی شیطان ہماری ناپاکی سے عار محسوس کرتا ہے۔ اگر ہم سلامتیِ ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے تو ہماری چستی و چالاکی قابلِ تحسین و آفرین ہو گی۔

# اہلِ سلف اور اہلِ خلف

آج کل دنیا میں مغربی تعلیم اور نئی روشنی نے اکثر لوگوں کے دلوں میں الحاد اور دہریت کا زہر پھیلا دیا ہے۔ لوگ سرے سے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر ہو گئے ہیں اور یومِ آخرت، حشر نشر، سزا جزا، بہشت دوزخ، ملائکہ، ارواح غرض تمام غیبی مخلوق اور موت کے بعد زندگی کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا قدیم سے چلی آتی ہے اور اسی طرح یہ چلی جائے گی۔ اس سلسلۂ آب و گل کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ مادے کے اندر خود بخود یہ طاقت اور خصوصیت موجود ہے کہ جماد سے نبات اور نبات سے حیوان اور حیوان سے انسان بتدریج پیدا کرتا ہے۔ یہ لوگ مسئلۂ ارتقائے عالم میں ڈارونؔ کی تھیوری اور نظریئے کے قائل ہیں۔ ان کا محکمۂ ماہرین طبقات الارض اس نظریئے اور مسئلے کے ثبوت میں کچھ عقلی دلائل اور سائنس کے تجارب اور مشاہدے پیش کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بندر اور لنگور ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے ہیں اور دنیا میں پہلا ترقی یافتہ بندر معاذ اللہ آدم علیہ السلام کہلایا۔ چنانچہ اس مسئلے کے ثبوت اور تائید میں بہت شدّ و مد اور زور شور سے دلائل و براہین پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے چونکہ اپنا فطرتی انسانی جوہر ضائع کر دیا ہے اور غفلت اور بداعمال کی وجہ سے اس نوری استعداد کو کھو بیٹھے ہیں اور انسانیت کے اعلیٰ مرتبے سے گر کر معنوی اور اخلاقی طور پر حیوان اور بندر کے درکِ اسفل میں گر آئے ہیں۔ قولہٗ تعالیٰ: اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ؕ (الاعراف ۷: ۱۷۹)۔ یہ لنگوری دماغ والے اپنے پیشوا ڈارونؔ کے ارتقاء عالم کے بے ہودہ اور بے بنیاد مضحکہ خیز نظریئے کے بل بوتے پر اپنے آپ کو بڑے فیلسوف، دانا اور مدبر سمجھتے ہیں، اور اگلے لوگوں کو سادہ لوح، توہم پرست اور نادان خیال کرتے ہیں۔ ارتقائے عالم کا یہ نظریہ اس زمانے کی عقلی جدت طرازی اور علمی موشگافی کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ ابتداء ہی سے آج تک دہری اور نیچری خیالات کے لوگ دنیا میں چلے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم اس زمانے کے دہریوں کے اس مشہور قول کو یوں دہراتا ہے کہ وہ لوگ بھی یہی بات کہا کرتے تھے: وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ ۚ (الجاثیۃ ۴۵: ۲۴)۔ ''ہم کو نہیں مارتا مگر زمانہ۔'' یعنی زمانہ خود بخود ہمیں پیدا کرتا ہے، پالتا اور پھر مارتا ہے۔ دہری لوگوں کا

خیال ہے کہ ابتدائی زمانہ میں لوگ وحشی جانوروں کی طرح پہاڑوں کے غاروں اور درختوں کی کھوؤں میں رہتے تھے اور ننگے پھرتے تھے یا درختوں کے پتوں اور جانوروں کے چمڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے تھے۔ اور جس طرح لوگ مادی صنعت وحرفت اور مادی فنون اور ہنروں سے بے بہرہ تھے اسی طرح وہ سادہ لوح، کم عقل اور توہم پرست واقع ہوئے تھے اور بے سمجھ اور نادان تھے اور مذہب اور روحانیت اس توہم پرست اور کم فہم نادان زمانے کی اختراع اور خودساختہ باطل اور فرضی خیالات کا مجموعہ ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کو پہلے دن سے قدرت کے ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک انسان کی عنصری بناوٹ یکساں چلی آتی ہے۔ اس کے اعضا، قویٰ و حواس میں کوئی فرق نہیں آیا کیونکہ تین چار ہزار سالوں سے مردہ فراعنۂ مصر کی جو ممی لاشیں مصر کے میناروں سے برآمد ہوئی ہیں ان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ بھی ہماری طرح وضع قطع کے انسان تھے۔ ان کی اور آج کل کے انسانوں کی وضع قطع میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح انسانی دل و دماغ بھی ابتدائے آفرینش سے یکساں چلا آتا ہے۔ ہاں اتنا فرق ضرور رہا ہے کہ جس طرح بچے کی پیدائش اور سرشت فطرت دینِ اسلام کے موافق ہوتی ہے اسی طرح زمانے کے بچپن کی حالت یعنی اہلِ سلف کا ابتدائی دور فطرتِ دین کی موافقت اور مطابقت کے باعث مذہب اور روحانیت کی طرف قدرتی طور پر زیادہ راغب اور مائل تھا۔ اس واسطے اہلِ سلف نے قدرتی اور فطرتی طور پر مادے کے عارضی اور سطحی علوم وفنون کی بجائے مذہب اور روحانیت کے اصلی اور ضروری معارف وعلوم کی طرف رخ کیا۔ چونکہ انسان کے جوف میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی دل اور دماغ رکھا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مَاجَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ط (الاحزاب ۳۳: ۴)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے جوف میں دو دل نہیں رکھے کہ وہ ایک وقت میں دو باتیں سوچ سکے اور دو متضاد علوم یکجا حاصل کر سکے۔ علم الادیان اور علم الابدان کے دو متضاد رخ جسم اور روح کی ملاوٹ انسان کے لیے قدرتی طور پر ایسی پیچیدگی اور الجھاہٹ پیدا کر دیتے ہیں کہ ایک وقت میں ان دونوں سے عہدہ برآ ہونا اس کے لیے محال ہو جاتا ہے۔ اگر ایک طرف منہ کرتا ہے تو دوسرے سے رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اگلے لوگوں کے دل و دماغ پر مذہب اور

روحانیت کے ضروری علم نے قبضہ جمالیا تھا اور اسی ایک خالق کے خیال نے انہیں مادے کے عارضی سطحی علوم سے بے نیاز اور مستغنی کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے شوق اور شغف میں اس قدر محو اور منہمک تھے کہ انہیں مادی ترقی کی طرف توجہ و التفات کرنے کی مطلق فرصت نہ تھی۔ بلکہ وہ اصل کار یعنی روحانیت کی طرف لگ گئے۔ انہیں مادے کے چندروزہ عارضی علوم وفنون کی طرف چنداں خیال نہ تھا ورنہ انسان حاملِ بارِ امان اور اللہ تعالیٰ کا برحق خلیفہ ابتدائے آفرینش سے وہ غضب کا پرکالہ چلا آتا ہے کہ اس نے ہر زمانے میں انفس اور آفاق یعنی عالمِ غیب و شہادت کے جس ظاہری باطنی میدان میں اپنے عملی اور علمی ہمت کے گھوڑے دوڑائے ہیں وہاں اس نے وہ کمالات کر دکھائے ہیں کہ فرشتے عش عش کرتے رہ گئے ہیں۔ اہلِ سلف نے مادی چھلکے یعنی سطحی علوم کی بجائے ایک مخ العلوم اور اصل الفنون مذہب اور روحانیت کی طرف رخ کیا ہوا تھا۔ اور جس طرح آج کل کے نقد پسند، کوتاہ اندیش اور ظاہر بین اہلِ یورپ نے اپنی عزیز زندگی اور ساری طاقتیں مادے کی موشگافیوں اور سطحی علوم کی دقیق آرائیوں میں وقف کر دی ہیں اور اس میں ترقی کر کے مادے کے افق الاعلیٰ پر پرواز کر رہے ہیں اسی طرح فطرت کے موافق ابتدائی زمانے کے دور اندیش اولوالالباب اہلِ سلف نے اپنے دل ودماغ کو زندگی کے صرف واحد اور ضروری نصب العین اور انسانی حیات کے ایک ہی لازمی غرض و غایت یعنی اپنے خالقِ حقیقی کی معرفت، قرب اور حصول میں لگا دیا تھا۔ اور اس ضروری اور اصل کار کے لیے فراغت اور فرصت حاصل کرنے کے لیے اہلِ سلف ظاہری اور مادی علوم کی طرف بہت کم توجہ اور التفات دیتے رہے۔ یہاں تک کہ شارع اسلام علیہ السلام نے مادی آفاقی غیر ضروری محیر العقول عجائبات اور لمبے فلسفی خیالات پر غور وخوض کرنے سے بھی ممانعت فرما دی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب تمہارے سامنے سورج، چاند اور ستاروں کی ماہیت اور مایت اور ان کے دور یا چال یا ان کے سعد و نحس وغیرہ کی کیفیتوں کا ذکر چھڑے تو خاموش ہو جایا کرو اور جب کبھی تقدیر کا مسئلہ آن پڑے تو اس میں غور وخوض اور بحث مباحثہ کرنے سے مطلق باز آجاؤ۔ یا جب بھی میرے اصحاب کے آپس میں خلافت کے خانگی اختلاف یا تنازعات یا ان کی تفضیل وتکسیر وغیرہ کا ذکر مذکور ہو تو ان پر بحث مباحثوں سے اجتناب واحتراز کرو اور

ان غیر ضروری علوم کی بجائے ام العلوم اور اصل الفنون یعنی کلیدِ ذکر اللہ کو حاصل کر لو۔ اس سے تمام ظاہری اور باطنی علوم کے دروازے کھول لو گے اور کائنات کے جملہ معارف و اسرار تم پر واضح اور ہویدا ہو جائیں گے۔ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (ال عمرٰن ۳: ۱۰۱) ۔یعنی جس نے اسم اللہ کو مضبوط پکڑا پس وہ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت پا گیا۔ جس ایک کے جاننے سے تمام نہ جانی ہوئی اشیاء جانی جاتی ہیں، تمام نہ سنی ہوئی سنی جاتی ہیں، نہ دیکھی ہوئی دیکھی جاتی ہیں، جس سے لوحِ محفوظ کے سب نقش شیشۂ دل میں اتر آتے ہیں، جس سے حیاتؒ کے سرِ عظیم اور رازِ غیب قدیم کا انکشاف ہو جاتا ہے ایسی ذات جامع صفات کی معرفت سے دیدۂ دل کو روشن کرنا چاہیے۔ کیونکہ عالمِ شہادت اور عالمِ کثرت میں سطحی علوم کے شعبے بے شمار ہیں اور ظاہری علوم کا سلسلہ بہت طول طویل اور بے نتیجہ و بے بقا ہے لیکن انسانی عمر اس دارِ فانی میں بہت کوتاہ ہے۔

علمِ کثیر آمد و عمرت قصیر
آنچہ ضروری است بداں شغل گیر

(قرۃ العین طاہرہ)

ترجمہ: علوم بہت ہیں اور تیری عمر چھوٹی ہے۔ ان میں سے جو ضروری ہے اسے اپنا شغل بنا۔

پس دور اندیش اور دانا شخص وہ ہے جو اصل اور ضروری کام کو اختیار کرے اور غیر ضروری، عارضی اور فانی اشغال سے اجتناب کرے۔

کارِ دنیا[1] درازئ دارد
ہرچہ گیرد مختصر گیرد

اس لیے اسلام نے پہلے روز سے انسان کو مادی خاک رانی کی بجائے اپنے اصل روحانی کام کی طرف لگایا ہے۔ یعنی مخلوق اور مادے کے مشاہدے میں بھی خالق کا خیال یاد دلایا ہے اور صنعتِ کائنات میں صانعِ حقیقی اور مصوّرِ اصلی کا تصور جمایا ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي

[1] دنیا کا کاروبار بہت لمبا ہے۔ جو کچھ بھی اختیار کرو، مختصر اختیار کرو۔

الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (ال عمرٰن ۳: ۱۹۰ ـ ۱۹۱)۔ ترجمہ: ''تمام فلکی اجرام یعنی آفتاب، ماہتاب و نجوم اور جملہ ارضی و سفلی اشیا جمادات، نباتات، حیوان اور انسان وغیرہ اور دن رات کے بدلنے اور ان کے تغیرات اور ہیر پھیر کے مشاہدے میں بیدار مغز اور اولوالالباب لوگوں کے لیے بہتیری نشانیاں موجود ہیں۔ جنہیں اس مخلوق کے نظارے میں خالق یاد آتا ہے اور اس صنعت کے مشاہدے میں صانعِ حقیقی کا خیال پیدا ہوتا ہے اور نقش سے نقاش کا تصور دل پر نقش ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کھڑے بیٹھے اور سوتے لیٹتے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی اشیا میں ذکر فکر کرنے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (ال عمرٰن ۳: ۱۹۰ ـ ۱۹۱)۔ یعنی ''اے اللہ تو نے مخلوق کو عبث اور رائیگاں نہیں پیدا کیا۔ بلکہ محض اپنی ذات کی عبادت، معرفت اور قرب و وصال کے لیے پیدا کیا ہے اور ہمیں ان مادی فانی اشیا کی محبت کی آگ اور تاریکی سے بچا۔'' قولہ تعالیٰ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ (الذّٰریٰت ۵۱: ۵۶)۔ بعض نادانوں نے اس پچھلی آیت میں عبادت سے یہ مراد لی ہے کہ دنیوی زندگی میں اپنے اور اپنے بال بچوں کے خورونوش کے سامان مہیا کریں اور حیوانوں کی طرح چند روز پیٹ بھر کر کھائیں پئیں اور خوب عیش و عشرت کریں۔ اور بس اسی کو خدمتِ خلق اور غرض و غایتِ زندگی سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اصل عبادت، ذکر فکر، نماز، روزہ، ورد وظائف، مراقبہ اور مکاشفہ وغیرہ باطنی اشغال اور طریقت کے روحانی احوال اور مقامات و منازل، قرب اور وصال کو لایعنی شغل، تضیعِ اوقات اور محال خیال کرتے ہیں۔ مگر اسلام نے انسان کو زندگی کی اصلی غرض و غایت اور حقیقی مقصدِ حیات عبادت و معرفتِ مولا کی طرف لگایا ہے۔ اسلام کی پاک تعلیم نے بنی نوعِ انسان کو مادے کی ظلمت اور تاریکی سے بچا کر اپنے اصل الاصول اور معدن العلوم، علت العلل، مسبب الاسباب، رب الارباب، اول، آخر، ظاہر، باطن، عالم الغیب والشہادت اور خالق والاض والسمٰوٰت یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی واحد ذات پاک کی عبادت، معرفت، قرب، وصال، محبت، عشق، فنا، بقا کے اعلیٰ مراتب اور

مدارج کے حصول کی طرف لگایا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (یوسف ۱۲: ۳۹)۔ یعنی آیا عالمِ کثرت کے متفرق بے شمار محبوب اور معبود بہتر ہیں یا ان کا خالق مالک ذاتِ واحد قہار۔ اللہ بس ماسوئی اللہ ہوس۔ قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ (الانعام ۶: ۹۱)۔ ترجمہ: یعنی "اے میری نبی! تم ان لوگوں کو اپنی طرف سے میرے نام کی حقیقت اور اہمیت بتا دے۔ پھر انہیں چھوڑ دے کہ جس طرح چاہیں کھیلیں۔" تصور اسم اللہ ذات جب سالک کے دل پر قائم ہو جاتا ہے تو صاحبِ تصور کا دل اور دماغ اسم اللہ کے صبغۃ اللہ سے رنگا جاتا ہے اور اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ اسے ہر نقش میں نقاش کا نقشہ نظر آتا ہے اور ہر صنعت میں صانعِ حقیقی کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ کتابِ کائنات اُس قرآن اور مصنوعات اور اس کی آیات بینات بن جاتی ہیں۔

مادہ پرست عقل کے اندھے یہ سمجھتے ہیں کہ اگلے لوگ غیر مہذب، نادان، سادہ لوح اور توہم پرست تھے اور مادی علوم وفنون سے بے بہرہ تھے۔ گو آج کل کے ماہرینِ طبقات الارض کو پہاڑوں کے بعض غاروں میں اگلے زمانے کے لوگوں کے پتھروں کے اوزار اور بھدے برتن وغیرہ مل رہے ہیں تو اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ اس زمانے کے تمام لوگ اسی طرح غاروں میں رہتے ہوں گے۔ کیا آج کل اس ترقی یافتہ اور مہذب دنیا میں بعض وحشی اور جنگلی لوگ پہاڑوں کے غاروں میں رہائش نہیں رکھتے۔ پرانی طرز کی زندگی بسر نہیں کرتے۔ حالانکہ اس زمانے میں عالیشان محلوں کے اندر رہنے والے مہذب انسان بھی آباد ہیں۔ سو اگر ان لوگوں کو پہاڑوں کے غاروں اور زمین کے اندر دبے ہوئے تہہ خانوں میں پرانی طرز کے بھدے برتن و اوزار مل رہے ہیں تو یہ اس زمانے کی بعض وحشی اقوام کی استعمال کی چیزیں ہوں گی۔ نہ کہ اس زمانے کے مہذب اور شائستہ لوگ یہ چیزیں استعمال کرتے ہوں گے۔ کیونکہ کہ جس زمانے کے یہ غاروں والے اوزار اور برتن بتائے جاتے ہیں ماہرینِ طبقات الارض کو بعض دیگر مقامات سے اس زمانے کی اعلیٰ صنعت وحرفت کے آثار بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اس زمانے کے نہایت نفیس وعمدہ آلات اور سامان پاتے ہیں تو ان کی عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ غرض اگلے زمانے کے سچے پاک باز لوگ

باوجود مذہبی اور روحانی مصروفیتوں کے کسی علم وفن میں آج کل کے بوالہوس، طفل مزاج اور نفسانی لوگوں سے کم نہ تھے۔ اگر فی الحقیقت غور کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے تمام مادہ پرست ہر قسم کے علوم و معارف اور صنعت و حرفت میں اگلے لوگوں کی قائم کردہ بنیادوں اور اصولوں پر چل کر ترقی کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہر علم وفن کی ابتدائی ایجاد اور نئی بنیاد قائم کرنی مشکل ہوا کرتی ہے۔ اس پر چل کر آگے ترقی کرنا محض آسان اور قدرتی بات ہے۔ اگلے لوگوں کے ہر علم وفن میں ان کی معرکۃ الآراء تصانیف ان کے دماغی علوم اور عقل و فہم کی بلندی پر صاف دلالت کر رہی ہیں۔ آج کل کے لوگ محض ان کے خوشہ چین ہیں۔ ہم اہلِ سلف لوگوں کے علوم اور فنون میں ابتدائی ایجادات کی یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ کتاب ''علمِ عرب'' کے صفحہ ۲۲۷ پر جارجی زیدان ایک مستند عیسائی مؤرخ کا اقرار ہے کہ الجبرا مسلمانوں کی ایجاد ہے۔

۲۔ عیسائی مؤرخ ڈاکٹر ورپیر لکھتے ہیں کہ گھڑی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور خلیفہ ہارون الرشید نے ۸۰۷ھ میں بادشاہ شارلمین کے دربار میں ایک گھڑی بطور تحفہ بھیجی تو درباریوں نے حیرت سے اسے طلسم اور جادو خیال کیا۔ (از کتاب زبدۃ الصحائف فی اصول المعارف صفحہ ۶۹)

۳۔ عیسائی مؤرخ ڈاکٹر لیبان کا قول ہے کہ قطب نما جس کے بغیر سمندر کا راستہ طے کرنا ناممکن ہے مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ (کتاب تمدنِ عرب صفحہ ۴۰۴)

۴۔ مشہور فرانسیسی مؤرخ موسیو سدیو لکھتے ہیں کہ یوسف ابنِ عمر نے ۷۰۲ھ میں روئی کا کاغذ تیار کیا اور اسی مؤرخ کا کہنا ہے کہ علمِ ہندسہ عربوں نے یورپ کو سکھایا ہے۔

(ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۸، صفحہ نمبر ۲۷۵)

۵۔ ڈاکٹر ورپیر لکھتا ہے کہ تیزاب عربوں کی ایجاد ہے۔

(از ڈویلپمنٹ آف دی یورپ جلد ۱، صفحہ ۴۰۸)

۶۔ عیسائی مورخ جارجی زیدان کا قول ہے کہ بارود مسلمانوں کی ایجاد ہے۔

(از تمدنِ عرب جلد ۱، صفحہ ۹۹)

۷۔ عملی مکینکس کے بارے میں ڈاکٹر لیبان کہتے ہیں کہ عربوں نے عملی مکینکس کے

آلات ایجاد کر کے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا ہے۔ جن کو یورپ اور امریکہ آج کام میں لا رہے ہیں۔ (منزم صفحہ ۳۵۹)

۸۔ مشہور مؤرخ مارکولیتھ لکھتے ہیں کہ صرف مسلمانوں کی بدولت یورپ میں فلسفۂ یونان پھر زندہ ہوا۔

۹۔ پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے بڑی فیاضی سے یورپ کو مختلف علوم وفنون سکھائے۔ (لٹریری ہسٹری آف دی عرب صفحہ ۳۵۹)

۱۰ مشہور مؤرخ ڈاکٹر لیبان لکھتے ہیں کہ تمدنِ اسلام کا بڑا زبردست اثر دنیا پر رہ چکا ہے۔ مسلمانوں نے یورپ کی وحشی قوموں کو انسان بنایا۔ مسلمانوں نے یورپ میں علوم و فنون اور ادب و فلسفہ کا وہ دروازہ کھولا جس سے ہم یورپین قطعی ناواقف تھے اور مسلمان چھ سو برس تک مشرق سے مغرب تک ساری دنیا کے استاد رہے۔

۱۱۔ بندوق سب سے پہلے بابر بادشاہ کے ہاتھ میں دیکھی گئی۔ یہ یا تو اس کی ایجاد تھی یا کسی تُرک کی۔

۱۲۔ ڈاکٹر گستاوی لکھتے ہیں کہ عربوں کی بدولت یورپ نے تمدن اور تہذیب حاصل کی۔
(تمدنِ عرب صفحہ ۵۲۴)

۱۳۔ فرانسیسی مؤرخ موسیو سدیو لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے نویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی تک مختلف بیش بہا ایجادات کی ہیں۔ جن میں سے انجینئری کے اہم انکشافات انہیں کی ایجاد ہیں۔ (ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۶، صفحہ ۲۷۵)

۱۴۔ ڈاکٹر لیبان کا لکھنا ہے کہ عرب کی تقلیدِ معاشرت نے ساری دنیا کے امراء کی عادتوں کو درست کیا اور انہیں بہتر انسانی اخلاق و عادات سکھائے۔

(تمدنِ عرب صفحہ ۵۲۴)

علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں اہلِ سلف کے ذہنی کمالات اور دماغی قابلیتوں کا حال بطور مشتے نمونہ از خروارے تو ناظرین نے پڑھ لیا۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اگلے لوگوں کا اخلاقی معیار اس قدر رارفع، اعلیٰ اور بلند تھا کہ اگر بالفرض اہلِ سلف اور اہلِ خلف کو ایک وسیع میدان میں لا کر کھڑا کیا جائے اور ان سے لباسِ عنصری اتار کر اخلاق اور اعمال کی

باطنی صورت میں نمودار کر کے دکھایا جائے جیسا کہ قیامت کے روز ہوگا تو اہلِ سلف فرشتے نظر آئیں گے اور اہلِ خلف حیوان اور درندے دکھائی دیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ط (الاعراف ۷: ۱۷۹)۔ غرض انسان کی ظاہری صورت پر نہیں بھولنا چاہیے اور اس مادی خوب صورت زرق برق لباس، ظاہری شکل و شباہت اور خاکی خوبصورت خدوخال کا کوئی اعتبار نہیں اور نہ ہی مادی عقل، ظاہری زیرکی اور دنیوی کرّ وفر اور جاہ وحشمت کوئی چیز ہے۔ بسا اوقات بہت بے سروسامان، بے نوا، غبار آلودہ، ژولیدہ موئے، پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس درویش جسے تمہاری ظاہر بین آنکھیں حقارت سے ٹھکرادیا کرتی ہیں باطن میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت مہذب، خوبصورت، دانا، غنی اور مالدار بلکہ ان میں بعض امرا، رؤسا اور بے تاج شاہانِ وقت بھی ہوتے ہیں۔

خاکسارانِ جہاں رابحقارت منہ نگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ترجمہ: دنیا کے خاکساروں یعنی فقیروں کو حقارت سے مت دیکھ۔ تجھے کیا پتہ ہے کہ اس گرد میں شاید کوئی سوار یعنی اولیا ہو۔

وہ دل کی باطنی آنکھ اور ہے جس سے انسان کی اصلی باطنی صورتیں نظر آتی ہیں جو حقیقی و اصلی بادشاہ اور گدا میں تمیز کرتی ہے۔

مرد آں[1] باشد کہ باشد شہ شناس
مے نشاسد شاہ را درہر لباس

اس کے برخلاف تم ایک شخص کو دیکھو گے جو زرق برق لباس میں ملبوس ہوگا اور عمدہ خوبصورت شکل وشباہت والا ظاہر میں وجیہہ ہوگا۔ دنیوی دولت اور ظاہری جاہ وحشمت میں کوئی شخص اس کی برابری نہیں کرسکے گا۔ دنیوی اور مادی عقل میں افلاطونِ زمان اور جالینوسِ وقت شمار کیا جائے گا۔ لیکن اخلاقی مذہبی اور روحانی حیثیت میں وہ ایک لایعقل حیوان اور خونخوار درندہ ثابت ہوگا۔ لوگوں میں دنیوی لحاظ سے بڑا معزز اور مکرم ہوگا۔ لیکن

[1] مرد وہ ہے جو حقیقت کا شناسا ہو۔ وہ بادشاہ کو ہر لباس میں پہچان لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک جوں اور مکھی سے بھی کم تر اور ادنےٰ درجہ رکھتا ہوگا۔ غرض انسان کی ظاہری صورت، دنیوی حیثیت، مادی عقل کوئی اور چیز ہے اور انسان کے اخلاق اور اعمال کی باطنی صورت، دینی حیثیت اور مذہبی وروحانی سمجھ علیحدہ چیز ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واسطے فرمایا ہے کہ اَکْثَرُ اَھْلِ الْجَنَّۃِ بُلْہٌ" یعنی" جنت کے لوگ اکثر وبیشتر سادہ لوح ہوں گے۔" اکثر اہلِ جنت ایسے ہوں گے جن کے ہاتھ دنیوی عقل کی چالاکیوں اور شیطانیوں سے کوتاہ ہوں گے اور دنیوی دولت کو کچھ وقعت اور اہمیت نہیں دیں گے اور اس کے نفع ونقصان کی چنداں پرواہ نہیں کریں گے۔ اسی لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امّی یعنی ان پڑھ کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ دنیا کے شیطانی علم اور اس کے حصول کے مکروں، فریبوں اور منصوبوں سے ناواقف تھے۔ اسی دنیوی عقل کے لحاظ سے اکثر مالدار اور فیلسوف، کافر پیغمبروں کے ماننے والے سادہ لوح سچے صاف دل مسلمانوں کو سفہاء اور بادی الرائے یعنی کم عقل اور نادان کہا کرتے تھے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ (البقرۃ ۲: ۱۳)۔ ترجمہ: کافر کہنے لگے کہ آیا ہم اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح یہ احمق نادان لوگ ایمان لائے ہیں۔ ان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ خبردار دنیوی دولت اور مادی عقل پر مغرور کافر خود احمق اور کمینے ہیں لیکن وہ اس بات کو نہیں جانتے۔

غرض اہلِ سلف صالحین کا معیارِ اخلاق اس قدر ارفع اور بلند تھا کہ اگلے زمانے کے دنیادار امراء اور شاہانِ وقت بھی اس پچھلے زمانے کے صوفیاء اور مشائخین سے زیادہ نیک، متقی، پارسا اور زاہد و عابد تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ کا جس وقت وصال ہوا تو ان کی حسب وصیت یہ اعلان ہوا کہ آپؒ کا جنازہ وہ شخص پڑھائے کہ جس سے ساری عمر کبھی تکبیرِ اولیٰ اور عصر کی سنتیں فوت نہ ہوئی ہوں۔ ناظرین کو اس بات کا یقین مشکل سے آئے گا کہ ان کے جنازہ کو حسب وصیت پڑھانے کے قابل نہ کوئی عالم فاضل نہ کوئی متقی اور زاہد صوفی درویش اور نہ صاحب نسب سید و قریشی نکلا۔ بلکہ ایک مکرم، معزز اور ممتاز ہستی کے حسب وصیت نمازِ جنازہ پڑھانے کے قابل ہندوستان کی وسیع سلطنت کے فرماں روا سلطان شمس الدین التمش نکلے۔ نیز شہنشاہ اورنگزیب اپنے دورِ حکومت میں باون (۵۲)

سال تک اور سلطان نصیر الدین انیس (۱۹) سال تک قرآن شریف کی کتابت کرتے رہے۔ یعنی اکہتر (۷۱) سال اسی ہندوستان نے یہ تماشہ دیکھا کہ اورنگِ حکومت پر اور چترِ شاہی کے نیچے قرآن لکھا جارہا ہے۔ یہ تو اس زمانے کے بادشاہوں کا حال تھا جو سب سے زیادہ دنیوی تعلقات میں الجھے ہوئے، دنیاوی دھندوں میں سرتاپا ڈوبے ہوئے اور ملکی وسیاسی جھگڑوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زمانے کے پاک باز اور پاک طینت درویشوں اور فقیروں کا معیارِ زندگی کس قدر بلند ہوگا۔ اگر ان کے پاک اخلاق اور نیک اطوار کی مثالیں یہاں پیش کی جائیں تو ایک علیحدہ دفتر درکار ہوگا۔

غرض ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ اہلِ سلف صالحین باطنی مذہبی اور روحانی مصروفیتوں کے باوجود کسی علم وفن میں پچھلے لوگوں سے کم نہ تھے۔ آگرے کا تاج محل، مصر کی مینا ریں، قصرِ جمشید، تختِ طاؤس اور دیوارِ چین وغیرہ اگلے لوگوں کی علوِ ہمت وطاقت اور کمال صنعت و حرفت پر شاہد ہیں۔ مصر کی میناروں سے فراعنۂ مصر کی تین چار ہزار سالوں سے جو مدفون لاشیں اور ممیاں برآمد ہوئی ہیں۔ اور جب انہیں اتنے عرصۂ دراز سے صحیح سلامت پایا گیا تو اس زمانے کے سائنس دان کمال حیرت اور تعجب میں پڑ گئے اور انہوں نے یقین کرلیا کہ یہ فراعنۂ مصر کی اصلی لاشیں نہیں ہیں بلکہ کسی دھات کے ڈھلے ہوئے بت ہیں۔ لیکن جب وہ تمام کیمیاوی عملوں اور سائنس کے تجربوں میں اصلی لاشیں ثابت ہوئیں تو ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی اور آج تک اس راز اور مسٹری کو یہ لوگ نہیں کھول سکے کہ یہ لاشیں کس مصالحے اور کس عمل اور ہنر کے طفیل آج تک محفوظ چلی آئی ہیں۔ کیونکہ آج کل کے سائنسدان اور کیمسٹس کے پاس ایسی چیزوں کے دیر تک محفوظ رکھنے کے لیے صرف دو چیزیں ہیں۔ ایک برف اور دوم سپرٹ۔ سو معلوم ہوگیا کہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے کے لوگ جنہیں یہ لوگ وحشی، جنگلی اور احمق خیال کرتے ہیں آج کل کے نام نہاد مہذب اور عقل مند روشن خیال لوگوں سے ہر قسم کے علم وہنر میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ کیا طب، منطق، شعر، علم ہیئت، فلسفہ، ریاضی، علم کلام وغیرہ ظاہری علوم میں اگلے لوگوں مثلاً بوعلی سینا، افلاطون، جالینوس، ارسطو، فخر رازی، امام غزالی، حافظ شیرازی، فیضی، فردوسی اور مولانا روم وغیرہ کی مثل اور مثال پچھلا زمانہ پیش کر سکتا ہے۔ آج اس مہذب دنیا میں جس

قدر دانائی کی باتیں ضرب الامثال، عمدہ مشہور اشعار، اخلاقی مذہبی اور روحانی قواعد اور قوانین رائج اور جاری چلے آتے ہیں سب اگلے زمانے کے روشن ضمیر اور عالی دماغ لوگوں کے بنائے ہوئے اور وضع کیے ہوئے ہیں۔

مسمرزم، ہپناٹزم، انیمل میگنیٹزم یعنی قوت جاذبہ مقناطیسیہ، حیوانیہ اور سپر چولزم کے مشاہدوں اور تجربوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان میں ایک زبردست روحانی قوت اور ایک بڑی باطنی طاقت موجود ہے۔ اگر اس کی باقاعدہ مشق اور تربیت کی جائے تو اس کے ذریعے انسان اس مادی دنیا میں ایسے محیر العقول اور حیرت انگیز کرشمے دکھا سکتا ہے کہ وہ بڑے بڑے دانا، فیلسوف اور مادی عقلمندوں کا ناطقہ بند کر دیتا ہے اور سائنس اور فلسفہ اس کی توجیہہ سے صُمٌّ بُکمٌ (البقرۃ ۲: ۱۸) رہ جاتا ہے۔ اور کوئی جواب ان سے نہیں بن سکتا۔ یہ روحانی طاقتیں با اصطلاح متقدمین متصوفین خوارق عادات کرامات کہلاتی ہیں۔ اس قسم کی خلاف عادت فوق الفطرت غیر معمولی طاقتیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں: ایک علوی، دوم سفلی، علوی طاقتوں کے کرشمے چونکہ علوی غیبی مخلوق یعنی ملائکہ، فرشتوں اور مقدس ارواح کے ذریعے اور واسطے سے ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں اس لیے اس کا ذکر ہم کسی دوسرے موقعے پر کریں گے۔ یہاں پر ہم اہلِ سلف کے سفلی لیکن نہایت نادر، محیر العقول اور ہوشربا کرشموں کی آج سے تین سو سال پہلے کی ایسی مستند تاریخی شہادت پیش کرتے ہیں جس کی صحت کا انکار کسی صورت میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جس سے ایک سلیم العقل منصف مزاج انسان اندازہ لگا سکتا ہے کہ متقدمین کے باطنی علوم اور روحانی طاقتیں کہاں تک پہنچی ہوئی تھیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جہانگیر بادشاہ کے دربار میں بنگال کے چند مداریوں اور جادو گروں نے حاضر ہو کر جو کرشمے دکھائے تھے آج تک دنیا اس سے انگشت بدنداں ہے۔ ان میں سب سے ہوش ربا ریسمان اور آسمان والا معاملہ ہے۔ جس نے آج تک اہلِ یورپ کو ششدر اور حیران بنا رکھا ہے:

> کتاب تزکِ جہانگیری جو جہانگیر بادشاہ کے زمانے کی اس کی اپنی بنائی ہوئی تاریخ ہے اس میں یہ یوں مذکور ہے کہ بنگال کے چند مداری اور جادوگر جہانگیر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ علاوہ دیگر حیرت انگیز تماشوں اور

کرشموں کے ریسمان اور آسمان والا کرشمہ سب سے زیادہ ہوشربا تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ان جادوگروں میں سے ایک نے بڑھ کر بادشاہ کو سلام کیا اور عرض کی کہ جہاں پناہ میرا ایک دشمن آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ میں سیڑھی لگا کر آسمان پر اس کے ساتھ لڑنے کے لیے جا رہا ہوں۔ انشاءاللہ میں اسے قتل کر کے اور فتحیاب ہو کر واپس آ جاؤں گا۔ اور ایک خوبصورت نو جوان عورت کو بادشاہ کی کرسی کے قریب بٹھا کر کہا کہ یہ میری پیاری خوبصورت بیوی ہے۔ یہ حضور کے پاس میری امانت ہے۔ اسے میری واپسی تک اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ چنانچہ جادوگر نے میدان میں کھڑے ہو کر ایک ڈوری کو آسمان کی طرف پھینکا کہ اس کا ایک سرا نظروں سے غائب ہو گیا اور ڈوری ہوا میں معلق ہو گئی۔ چنانچہ جادوگر مذکور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سیڑھی کی طرح اس پر چڑھ گیا اور تماشائیوں کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ ایک لحظے کے بعد وہ ڈوری ہلنے لگی اور بعدہٗ آسمان کی طرف سے خون کی دھار بندھ گئی اور اس میں سے خون ٹپکنے اور بہنے لگا۔ تماشائی اس ڈوری کی عجیب و غریب حرکت اور اس میں خون کے زمین پر جاری ہونے کو نہایت حیرت اور تعجب سے دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں جادوگر کے ہاتھ پاؤں اور ہفت اندام یعنی سب اعضا یکے بعد دیگرے کٹ کٹ کر خون آلودہ حالت میں ڈوری کے قریب میدان میں آ کر آسمان سے گرنے لگے اور آخر میں اس کا سر دھڑام سے میدان میں آ کر گرا۔ اس پر جادوگر کی عورت جو بادشاہ کی کرسی کے پاس بیٹھی تھی چلا اٹھی اور زار زار روتی ہوئی اس جادوگر کی لاش کے پاس آ کر کہنے لگی کہ یہ تو میرے خاوند کی لاش ہے۔ آسمان پر دشمن نے اسے قتل کر دیا ہے اور اسے ٹکڑے کر کے نیچے پھینک دیا ہے۔ اور اپنے قبیلے کے جادوگروں کو مخاطب کر کے کہنے لگی کہ ایندھن وغیرہ کا سامان کرو۔ میں اپنے پیارے خاوند کے ساتھ ستی ہو کر زندہ جل مروں گی۔ چنانچہ جادوگروں نے فوراً ایندھن تیار کر کے ایک چتا بنا لی۔ بادشاہ اور امراء و وزراء نے انہیں اس کام سے بہتیرا روکا لیکن جادوگروں نے اس عورت کو چتا میں بٹھا کر اس کے خاوند کی لاش کے ساتھ آگ

لگا دی اور وہ چتا عورت سمیت ایک راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ بادشاہ اور تماشائی اس خوف ناک منظر کو سخت حیرت اور استعجاب سے دیکھ کر دم بخود بیٹھے تھے کہ اتنے میں جادوگر مذکور ہتھیار لگائے زندہ اور صحیح سلامت اس ڈوری پر سے اترتے ہوئے نمودار ہوا اور ایک لحہ میں جہانگیر کے سامنے آ کر بادشاہ سے یوں مخاطب ہوا کہ جہاں پناہ! حضور کے بخت و اقبال سے میں نے اس دشمن کو قتل کر دیا ہے اور جو لاش یہاں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گری تھی وہ میرے دشمن کی لاش تھی۔ بعدہٗ بادشاہ سے اپنی بیوی کا طلبگار رہا کہ میری امانت مہربانی کر کے مجھے واپس کی جائے۔ بادشاہ نے بہت معذرت کا اظہار کر کے کہا کہ اسے تو تیرے بھائیوں اور ہمراہیوں نے تیری لاش کے ہمراہ زندہ جلا کر ستی کر دیا ہے۔ ہم اس کا خون بہا دینے کو تیار ہیں۔ چنانچہ خون کا ابھی فیصلہ ہو رہا تھا کہ اتنے میں دھکتی ہوئی راکھ میں سے جادوگر کی عورت زندہ اور صحیح سلامت نکل آئی اور اپنے خاوند کے پہلو میں کھڑے ہو کر بادشاہ سے عرض کیا۔ جہاں پناہ خون بہا کی تکلیف نہ فرمائیے میں زندہ اور صحیح سلامت ہوں۔ یہ ہوش ربا اور حیرت افزا منظر دیکھ کر بادشاہ اور امراء و وزراء نے ان جادوگروں کو بڑے بھاری انعام و اکرام دیئے اور تماشائیوں نے بھی دل کھول کر نقد و جنس پیش کیے۔ پچھلے چند سالوں کی بات ہے کہ لنڈن میں تمام دنیا کے مداریوں، جادوگروں، شعبدہ بازوں اور جگلروں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے پروگرام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ جو مداری یا جادوگر جہانگیر بادشاہ کے دربار کا مذکورہ بالا ریسمان اور آسمان والا کرشمہ دکھائے گا اسے ۲۰ ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ اس انعام کو حاصل کرنے کے لیے دنیا کے تمام جادوگروں اور مداریوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور سائنس اور کیمسٹری کی بدولت اس کرشمے کے اظہار کے لیے بہتیرے اوزار اور آلات مہیا کیے لیکن کسی سے کامیابی کی صورت نہ بن آئی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ متقدمین اور متاخرین کے علمی اور ظاہری و باطنی کمالات میں کس قدر فرق ہے۔ افریقہ کے موجودہ حبشی اور جنگلی اقوام کے

روحانی کمالات کے جو ریکارڈ یورپین سیاحوں نے جمع کیے ہیں انہیں دیکھ کر انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ آج تک قدیم زمانے کے روحانی کمالات کا اثر پرانی اقوام میں چلا آتا ہے جو اس نئی روشنی کی تاریکی اور جدید تہذیب کی لعنت سے محفوظ ہیں۔ مصر کے قدیم مقبروں اور تہہ خانوں سے جو پرانی ہڈیاں تسبیح یعنی مالا اور دیگر استعمال کے برتن اور اوزار برآمد ہوئے ہیں ان بے جان اشیاء میں بھی اس زمانے کے لوگوں کی ایسی روحانی تاثیرات اور باطنی کمالات وابستہ ہیں جنہیں دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ایک سلیم العقل منصف مزاج شخص اس سے یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب ان قدیم لوگوں کی ان جامد بے جان اشیاء میں اس قدر روحانی طاقتیں پنہاں ہیں تو ان کی اپنی روحانی طاقتوں کا کیا حال ہوگا۔

اس سچے تاریخی واقعے کے بیان کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ اہل سلف کے باطنی علوم اور روحانی طاقتیں اس وقت افق الاعلیٰ پر پہنچی ہوئی تھیں اور جس طرح آج سے سو(۱۰۰) سال پہلے کے لوگ آج کل کے سائنس کی مادی ترقیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے اسی طرح آج کل کے الحاد زدہ مادہ پرست لوگ قدیم زمانے کے اہل سلف بزرگانِ دین کے روحانی کرشموں اور باطنی کمالات کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ یہی الحاد زدہ مہذب دنیا آج بھی اس زمانے کے پیشوایانِ مذہب اور بانیانِ دین یعنی پیغمبروں اور اولیاؤں کی اپنی عبادت گاہوں اور معبدوں میں دن رات مداح اور ثنا خوان نظر آتی ہے اور اسی کو ذریعۂ نجات سمجھتی ہے۔ سبحان اللہ! وہ الحاد زدہ یورپ جس کو اپنی مادی طاقت پر اس قدر ناز اور گھمنڈ ہے آج بھی اپنے اسرائیلی پیغمبروں کا لوہا طوعاً و کرہاً مان رہا ہے۔ جس کی تعریف و توصیف کے گیتوں سے دن رات یورپ کے گرجے اور کلیسائیں گونج رہی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگلے لوگوں کے روحانی پنجوں نے اس زمانے کے مادی لوگوں کے قلوب کو پکڑ رکھا ہے اور انہیں باطن میں زنجیرِ تسخیر سے جکڑ رکھا ہے۔ گو وہ نہیں سمجھتے کہ ان کی گردنوں میں یہ باطنی ڈوریں کس طرح پڑی ہوئی ہیں۔ ان سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن نکل نہیں سکتے جیسا کہ ہاتھی، اونٹ، بیل وغیرہ اگرچہ مادی طاقت اور ظاہری قوت میں انسان سے زور

آور اور طاقتور ہیں لیکن عقل، فہم اور علم کی بدولت انسان نے اپنے سے طاقتور اور شہ زور حیوانوں کو مسخر اور قابو کیا ہوا ہے اور ان سے اپنا کام لے رہا ہے۔ اسی طرح مردہ دل نفسانی لوگ اگرچہ مادی عقل اور ظاہری علم میں کتنے ہی دانا اور فیلسوف کیوں نہ ہوں لیکن باطنی علم اور روحانی طاقت والوں کے سامنے حیوانوں کی طرح ہیں۔ جن کو یہ لوگ سر کے باطنی بالوں سے نوری ہاتھ ڈال کر پکڑ لیتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: "مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ؕ" (ھود ۱۱: ۵٦)۔ ترجمہ: "اور نہیں ہے کوئی حیوان زمین میں مگر اللہ تعالیٰ نے اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے۔" جس طرح حیوانوں کو سینگوں یا پیشانی کے بالوں سے پکڑا جاتا ہے اور حسب خواہش ہر طرف لے جایا جاتا ہے اسی طرح ملکوتی روحانی علوم والے لوگ ان مادی حیوانات ناطق کو باطنی طور پر بہت آسانی سے دماغی بالوں سے پکڑ کر جس طرف چاہتے ہیں لے جاتے ہیں۔ رباعی۔

اے کز پئے علم و عقل بر پاشدۂ — تحصیل علوم را مہیا شدۂ
از دفترِ عشق تا نخوانی ورقے — بو جہلی اگرچہ ابن سینا شدۂ

ترجمہ: اے انسان تو جو علم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور مختلف علوم کو حاصل کرنے کے واسطے تیار ہوا ہے۔ عشق کے دفتر سے جب تک تو چند ورق نہیں پڑھے گا تب تک ابو جہل یعنی جاہل مطلق ہے۔ چاہے ابن سینا کی طرف دانا کیوں نہ ہو۔

آج اگرچہ سائنس اور مادی ترقی یورپ کو فرعونیت کے بامِ بلندی پر چڑھا رہی ہے لیکن اخلاقی اور روحانی انحطاط اس کو نفسانی ظلمت اور شہوانی غفلت کے درکِ اسفل اور جہالت کے تحت الثریٰ کی طرف نہایت تیزی کے ساتھ گھسیٹ رہا ہے۔ انہیں آج اپنی مادیت پر فخر کی بجائے اپنی روحانیت کے فقدان پر ماتم کرنا چاہیے تھا۔ مادی اور سیاسی عروج اگر انہیں ایک گز ابھار رہا ہے تو روحانی جہالت انہیں کوسوں نیچے دبا رہی ہے۔ اگر یورپ آج مادی عیش و عشرت اور دنیوی ساز و سامان کی وجہ سے شداد کی بہشت کا نمونہ بنا ہوا ہے مگر اخلاقی اور روحانی لحاظ سے تمام دنیا میں سخت مفلس ترین، نہایت نادار اور قحط زدہ علاقہ ہے۔ اگرچہ مادی ساز و سامان اور ظاہری خوراک کی بڑی فراوانی اور بہت بہتات ہے لیکن باطنی خوراک اور روحانی غذا ذکر فکر، طاعت اور عبادتِ الٰہی وہاں عنقا کی طرح نادر و نایاب

ہے۔ ہر جگہ دن رات ناچ و رنگ کی محافل قائم ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں۔ زنا، بدمعاشی، فسق و فجور کا دور دورہ ہے۔ خمر اور خنزیر عام خور و نوش ہے۔ ایک طرف کتوں کو اور دوسری طرف لیڈیوں کو بغل میں دبائے بیٹھے ہیں۔ شیطانی لہو و لعب اور نفسانی کھیل کود کے سوا وہاں اور کوئی شغل نہیں ہے۔ جہلا کی جہالت کا جہاں یہ جوبن اور شیطانی شہوت کا یہ شباب ہو وہاں اللہ کا نام لینے کی کسے مجال ہو۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

(اقبالؔ)

جس روز سے زمانے نے مادی ترقی اور دنیوی عروج کی طرف قدم اٹھایا ہے اور بالکل اسی ایک ہی طرف رخ کر ڈالا ہے اسی روز سے اخلاقی، مذہبی اور روحانی پستی کا انحطاط شروع ہوا ہے اور دین کے ضروری حقیقی اور اصلی پہلو سے لوگ غافل اور بے پرواہ ہوتے چلے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ زمانہ گو آج مادی ترقی کے فلک الافلاک پر پہنچ چکا ہے مگر روحانی اور اخلاقی پستی کے تحت الثریٰ اور درکِ اسفل میں گرا ہوا ہے۔

صفائیاں جتنی ہو رہی ہیں دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں پر اگر یہی روشنی رہے گی

(محمد اسمٰعیل میرٹھی)

افسوس مادہ پرست علم الابدان کی موشگافیوں میں عمریں صرف کر رہے ہیں اور عزیز جانیں تلف کر رہے ہیں مگر علم الادیان کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی کی آرائش و آسائش کے سامان مہیا کرنے کا شغف ان کے نزدیک لابد اور ضروری ہے۔ لیکن ابدی سرمدی حیات اور باطنی نوری دولت کے حصول کا مطلق خیال نہیں۔ خانۂ عنکبوت کی آرائش اور اس میں سامان کی افزائش کا کمال بندوبست ہے مگر دار عالم ملکوت کا کچھ فکر نہیں ہے۔

## ابیات

چند در فکرِ سرائے و غمِ منزل باشی　　گذرد قافلۂ عمرد تو غافل باشی

کعبہ در گام نخستیں کند استقبالت    از سر صدق اگر ہم سفر دل باشی
گر در آرائش ظاہر دگراں مے کوشند    تو درآں کوش کہ فرخندہ شمائل باشی
کشتیِ تن بشکن چند[1] دریں قلزم خوں
تختۂ مشق صد اندیشۂ باطل باشی!
(فیضی)

ترجمہ:

۱۔ تو کب تک جائے قیام اور منزل کی فکر کرتا رہے گا۔ اسی فکر میں عمر کا قافلہ گذر جائے گا اور تو غافل رہے گا۔

۲۔ کعبہ پہلے قدم پر ہی تیرا استقبال کرے گا اگر تو حقیقی طور پر دل کا ہم سفر بن جائے۔

۳۔ اگر دوسرے لوگ ظاہری آرائش کی کوشش کریں تو تُو صرف اس بات کی کوشش کر کہ تیرے اعمال نیک ہوں۔

۴۔ اس تن کی کشتی کو توڑ ڈال۔ کب تک تو اس خون کے سمندر میں صدہا باطل اندیشوں کا تختۂ مشق بنا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین کی بڑی مہربانی اور کمال حکمت ہے کہ اس نے قاہر و قوی اور جابر و جری یورپ کو مذہبی احساس، روحانی ذہنیت اور باطنی بصیرت سے خالی اور بے بہرہ کر دیا ہے اور دجال کی طرح اسے دینی اور مذہبی آنکھ سے کانا کر کے محض دنیوی جوع الارض اور سیاسی علو کی طرف لگا دیا ہے۔ ورنہ اگر انہیں علاوہ مادی قہرمانیت کے مذہبی اور دینی احساس بھی ہوتا تو آج تمام دنیا کو کفر اور الحاد کے باطل عقیدے کے ماننے پر مجبور کرتا۔

یورپ والے پہاڑوں کی چوٹیاں اور سمندروں کی گہرائیاں ناپتے پھریں۔ وہ دریاؤں کے دہانے اور عمق اور طول و عرض جانتے پھریں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی میں تحت الارض سٹیشن بنا کر موسمی حالات معلوم کرتے پھریں۔ ہوا، پانی اور خشکی کو مسخر کرتے رہیں۔ خلائی جہازوں کے ذریعے ستاروں تک پہنچنے کے خیال اور دھن میں خوش ہوتے رہیں۔

[1] آخری شعر کا مطلب یہ ہے کہ اس تن کی کشتی کو توڑ ڈال۔ یعنی عشقِ الٰہی میں فنا حاصل کر لے اور اپنے جسم کو مٹا دے تاکہ تو سینکڑوں فضول خطرات سے نجات پا لے۔ خون سمندر جسم ہی کو بتلایا گیا ہے کیونکہ جسم خون سے بھرا ہوا ہے۔

انہیں یہ مادی خاک رانی مبارک! مژدہ باد، او شہیدانِ ناز و ادا و کشتگانِ غمزہ و جفا کہ وہ نیرِ اعظم، انوارِ جمال و جلال کہ جس کے ایک ذرۂ شعاع سے آفتاب، ماہتاب منور ہیں۔ پھولوں کا رنگ و بو جس کے دم سے ہے۔ بتانِ جہاں کے لبوں کا تبسم جس کے کرم سے ہے وہ ہمہ خیر، وہ ہمہ دان، ہمہ بین، ہمہ نور، خوبی کی جان اور حسن کی روحِ روان، حق سبحان تمہارا مقصود اور مطلوب ہے۔ رندانِ جامِ وحدت تو روضۂ رضوان کو، جحیم سوزان کو اور آسمان و زمینِ گردان کو تین نوالے بنا کر آپ ہی آپ رہ جاتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ مسعود وجود جن کے مبارک دم سے آسمان سے بارشیں ہوتی ہیں، زمین بار آور ہوتی ہے، دنیا سے طرح طرح کی آفات اور مصائب ٹلتی ہیں۔ ان کے ابرو کے ایک ادنیٰ اشارے سے دنیا کی بڑی بڑی مہمیں سر ہوتی ہیں، ان کے باطنی ہاتھ کی ایک جنبش بادشاہوں کے تاج اور تخت الٹ دیتی ہے، ان کے لطف کی نیم نگاہ مفلس گداگروں کو تاج اور تخت کا مالک بنا دیتی ہے۔ وہ اگر دنیا میں بے کار نظر آتے ہیں تو اس لیے کہ وہ عالمِ جاودانی کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ دنیا میں جس قدر کوئی بڑا ہوتا ہے اتنا ہی اس کا کام تھوڑا ہوتا ہے۔ بادشاہ ہمیشہ اشاروں سے کام کیا کرتے ہیں۔ عام ملازموں کی طرح دن رات دفتر کے دفتر سیاہ نہیں کرتے۔ اگرچہ یہ لوگ مفلس اور بے نوا نظر آتے ہیں لیکن باطن میں روئے زمین کے حقیقی مالک ہوتے ہیں۔

خشت زیرِ سر و بر تارکِ ہفت اختر پائے!

دست قدرت نگر و منصب صاحب جاہی

افسوس کہ زمانے سے روحانی علوم اور باطنی فنون مٹ گئے ہیں اور باطنی امراض کے طبیب الارواح اور معالج القلوب دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اسلام در کتب اور مسلمانان در قبور والانقشہ نظر آتا ہے۔ مذہبی تعلیم اور روحانی تلقین کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ آج کل کے مدرسے اور کالج کیا ہیں۔ انسانی فطرت اور مذہبی ضمیر کے لیے گویا قصاب خانے اور بوچڑ خانے ہیں۔ جہاں لاکھوں انسانی قلوب کے معصوم ریوڑ کفر اور الحاد کی کالی دیوی کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں اور بے شمار پاک ارواح دہریت اور بے دینی کی دیوی کی دہلیز پر قربان ہوتی ہیں۔ ظاہر طور پر اگرچہ تعلیم پاتے نظر آتے ہیں مگر در حقیقت معنوی طور پر ذبح ہوتے رہتے ہیں۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ ؕ

نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاکُمْ ط اِنَّ قَتْلَهُمْ کَانَ خِطْأً کَبِیْرًا ٥ (بنیٓ اسرآئیل ۱۷ : ۳۱)
ترجمہ: ''بھوک اور افلاس کے خوف سے اپنی اولاد اور بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہم ہی انہیں اور تمہیں رزق پہنچانے والے ہیں۔ بے شک انہیں قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔'' یاد رہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اکثر لوگ اپنے بچوں کو دینی اور مذہبی تعلیم کی بجائے دنیوی تعلیم صرف اس لیے دیتے ہیں کہ دین اور مذہب کی تعلیم میں انہیں دنیوی دولت کے حصول کی کوئی امید اور صورت نظر نہیں آتی۔ اور سکول یا کالج میں داخل کر کے انہیں اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ لڑکا اس تعلیم کے ذریعے کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائے گا اور خوب روزی کمائے گا۔ یہاں اس آیت کا وہ پرانا مفہوم ہرگز تطبیق نہیں کھاتا کہ پرانے زمانے میں کفارِ عرب اپنی لڑکیاں زندہ دفن کیا کرتے یا انہیں ذبح کر ڈالتے۔ کیونکہ وہ لوگ یہ کام محض عار کی وجہ سے کیا کرتے تھے تاکہ کوئی شخص ہمارا داماد نہ ہو۔ ہرگز بھوک اور افلاس کے خوف سے یہ کام نہیں کرتے تھے۔ یہ ذکر ایک دوسری آیت میں یوں آیا ہے: وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ٥ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ٥ (التکویر ۸۱: ۸۔ ۹)۔ غرض بہت لوگ ہیں جو اپنے معصوم بچوں کو بھوک اور افلاس کے خوف سے سکولوں اور کالجوں میں داخل کر کے معنوی اور باطنی طور پر انہیں اپنے ہاتھوں قتل کر ڈالتے ہیں اور ان کی فطرتِ دینی اور استعدادِ مذہبی کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اکبر مرحوم نے اس مضمون کو اپنے اس شعر میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کالج کفر و الحاد کے ٹکسال ہیں۔ جہاں ضمیر اور فطرت کے زرِ عیار میں بے دینی اور بد اخلاقی کا کھوٹ ملا کر انسانی قلوب کے سادہ لوحوں پر کفر، الحاد اور دہریت کی مہریں لگ رہی ہیں اور مغربی رسم و رواج کے موافق رائج الوقت سکے اور کام کے مطابق دام تیار ہو رہے ہیں۔ اور یوں ہزاروں یوسف ان کھوٹے داموں کے عوض بکے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی مذہبی ذہنیت مفقود ہو گئی ہے۔ اور اگر دنیا میں کہیں خال خال مذہبی خیال موجود ہے تو مغربی تعلیم اور یورپین تہذیب نے اسے بگاڑ کر مسخ کر دیا ہے۔ اکثر قلوب مذہبی اور روحانی لحاظ سے مر چکے ہیں۔ ان میں کوئی مذہبی حس ہی باقی نہیں رہی۔ اگر کچھ تھوڑے سے

قلوب کسی قدر زندہ رہ گئے ہیں تو وہ سخت مہلک باطنی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان باطنی امراض کے اثرات مذہب کی نسبت آئے دن سخت کفر انگیز خیالات اور ملحدانہ شکوک اور اعتراضات کی شکل میں ان لوگوں کے دلوں میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اب دنیا میں نہ معالج القلوب ہیں اور نہ طبیب الاروح۔ اکثر کو تو اپنے مرض کا احساس ہی نہیں۔ بھلا جو مریض اپنے آپ کو تندرست اور صحت یاب سمجھے اس کا علاج کون کرے۔ یہاں پر ہم اس قسم کے چند دہریانہ شکوک اور شبہات اور ملحدانہ خیالات اور اعتراضات بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتے ہیں جو مغربی تعلیم کے اثرات سے دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ جس سے تقریباً مذہبی دنیا متعفن اور مسموم ہو گئی ہے ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو سرے سے خدا کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایسے خدا کو کیونکر مانیں جو نہ خود دنیا میں محسوس اور معلوم ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی عمل اور فعل دکھائی دیتا ہے۔ بھلا جو خدا سمجھ نہ آئے اسے کیونکر جانا اور مانا جائے۔ یہ لوگ دل کے اندھے ہیں۔ مادرزاد اندھے کو سورج کی روشنی اور اشیا کی رنگت کا احساس کرانا ناممکن ہے۔ سورج تمام دنیا کو روشن کر رہا ہوتا ہے، سارا جہاں اس کی روشنی سے تاباں اور درخشاں اور تمام اشیا کی صورتیں اور رنگتیں اس سے نمایاں ہوتی ہیں لیکن اندھوں کے نزدیک نہ دنیا میں سورج کا کوئی وجود ہے نہ دنیا میں اس کی روشنی اور حرارت کا کوئی فعل موجود ہے۔ ایسے لوگ اگر سورج کی روشنی اور حرارت اور اشیا کی صورت اور رنگت کو نہ سمجھیں اور نہ جانیں تو قصور کس کا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب را چہ گناہ

(سعدیؒ)

ترجمہ: اگر دن کے وقت چمگادڑ کچھ نہ دیکھ سکے تو اس میں چشمۂ آفتاب کا کیا قصور ہے۔

جب کہ کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ اس آفتابِ عالم تاب کے انوار سے زندہ اور تابندہ ہے اور تمام دنیا کے اولوالالباب، دانایانِ جہان اور اولوالابصار، بینایانِ زمان اس کی ذات والاصفات اور دنیا میں اس کی قدرت کے افعالِ جلال کے مشاہدات اور اعمالِ باکمال کے شاہد ہیں۔

ان میں بعض سیاسی ملحد ہیں جن کے سر پر سیاسی شیطان مسلط ہوتا ہے۔ شیطان انکے

دماغ میں یہ باطل خیال جما دیتا ہے کہ مذہب اور ادیان محض بنی نوع انسان کی ظاہری اور دنیوی بہبودی اور اقتصادی وسیاسی ترقی اور تہذیب وتمدن اور طرزِ معاشرت کی اصلاح کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور تمام مذہبی پیشوا یعنی اگلے پیغمبر اور اولیا وغیرہ اپنے اپنے زمانوں میں اپنی قوموں کے محض دنیوی ریفارمر اور ملکی مصلح اور سیاسی لیڈر رہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی دماغی قابلیت اور عقلی ذہانت سے اس زمانے کی محض دنیوی اصلاح اور سیاسی ترقی کے لیے مذاہب ایجاد کیے تھے اور بہشت کے خالی بہلاوے اور دوزخ کے وہمی ڈر کے ڈنڈے سے اس زمانے کے سادہ لوح لوگوں کو بچوں کی طرح اپنی خود ساختہ مذہبی پگڈنڈیوں اور شرعی راہوں پر چلاتے رہے ہیں۔ اور نعماءِ بہشت، حور وقصور محض طفل تسلیاں اور بھول بھلیاں تھیں اور عذابِ دوزخ محض ایک فرضی ہوّا تھا جو اس زمانے کے سادہ اور توہم پرست دماغوں کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ دراصل سیاسی ترقی اور ملکی فتح کی نقد بہشت مقصود اور مطلوب تھی۔ چنانچہ آزاد اور فاتح قومیں حکومت اور سلطنت کی بہشت میں یہاں راحت اور آرام پاتی اور عیش وعشرت کرتی ہیں۔ اور محکوم ومغلوب قومیں غلامی وذلت اور افلاس ومسکنت کے دوزخوں میں دکھ اور عذاب پاتی ہیں۔ پس مذہب کا مدعا یہی کچھ ہے۔ سوائے اس کے نہ کوئی بہشت ہے اور نہ دوزخ۔ نہ موت کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے اور نہ حساب کتاب ہے، نہ سزا ہے اور نہ جزا۔ اسی سیاسی الحاد اور دنیوی مفاد کی تائید میں وہ مفصلہ ذیل باطل خیالات اور بیہودہ خرافات بھی کہہ ڈالتے ہیں کہ یہ سب ظاہری شرعی شعائر اور مذہبی ارکان اسی دنیوی بہبودی اور سیاسی بہتری کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ ہر شرعی حکم اور دینی رکن میں کوئی نہ کوئی دنیوی مفاد اور سیاسی بہتری کا راز مضمر ہے۔ مثلاً کلمۂ شہادت صرف قومی اتحاد اور توحید کا ایک رسمی اظہار ہے۔ صوم اور روزۂ ماہِ رمضان جہادِ نفس اور تہذیبِ اخلاق کی ایک پریکٹس ہے یعنی نفس کو بھوک اور پیاس کی عادت ڈالنے اور شہوات وخواہشات کی ضبط کا خوگر بنانے کی مشق ہے تاکہ لڑائیوں میں خرچ اور خوراک وغیرہ نہ ملنے کے موقع پر کام آئے۔ نماز با جماعت صرف اطاعتِ امیر ہے اور نماز ایک قسم کی ورزش ہے اور وضو کا مطلب محض صفائی ہے۔ اور مساجد سیاسی اجتماع اور ملکی معاملات اور دنیوی مصالحات کی صلاح اور مشوروں کی پنج وقتہ انجمنیں ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ

جملہ علما و فضلا متقدمین و سلف صالحین وائمہ دین متین و محدثین اور کل فقہا مفسرین نے قرآن واحادیث کے اصل مدعا اور مفہوم کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔اور غرض وغایت دین کا وہی ہے جو ہم نے سمجھا ہے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (التوبۃ ۹ : ۳۰) ۔غرض یہ لوگ سب دینی ارکان اور تمام مذہبی شعائر کے تحت کسی نہ کسی دنیوی اور سیاسی مفاد کو مضمر سمجھتے ہیں۔

بعض کور چشم ملحد نبوت، رسالت اور حقیقت الوحی کی توجیہہ کرتے ہیں کہ پیغمبر اور رسول اپنی قوم کے ایسے ہمدرد لیڈر اور خیر خواہ مصلح ہوئے ہیں کہ جن میں فطرتاً اپنی قوم کی بہبودی اور ہمدردی کا جوش اور جذبہ ہوا کرتا تھا۔ اس جوش اور جذبے کے سبب ان پر اس قسم کے خیالات کا غلبہ رہا کرتا تھا اور غلبۂ تخیلات سے بعض مضامین کو ان کی قوت متخیلہ مہیا کر لیتی تھی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس غلبے کی حالت میں ان کو کوئی نہ کوئی آواز بھی سنائی دیتی تھی جس کو وہ وحی والہام سے موسوم کرتے تھے۔ اور گاہے کوئی خیالی موہوم صورت بھی انہیں نظر آجاتی تھی جس کو وہ ملک اور فرشتہ کہتے تھے۔ حالانکہ خارج میں نہ کوئی اس قسم کا غیبی وجود ہے اور نہ کوئی فرشتہ ہے۔ یہ سب انکی فطرتی قوت متخیلہ کی موہوم کارستانیاں ہیں۔ یہ عقل کے دشمن پیغمبروں کو یا تو فریبی یا فریب خوردہ تصور کرتے ہیں اور جملہ انبیا و مرسلین اور اولیا کاملین کی وحی والہامات اور معجزات و کرامات کو ان کے غلبۂ واہمات اور خیالات کی پیداوار خیال کرتے ہیں اور اپنے کو بڑے فیلسوف اور دانا محقق سمجھتے ہیں۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرآئیل ۱۷ : ۴۳)۔

فلسفی گشتی و آگہ نیستی[1] خود کجاؤ از کجاؤ کیستی

از خود آگہ چوں نہٖ اے بے شعور پس نباید بر چنیں علمت غرور

(علی ہجویریؒ)

ملاحدۂ دہر کا خیال ہے کہ مذاہب دور جاہلیت کی پیداوار ہیں اور اب روشنی اور علم کا زمانہ ہے۔ پرانے مذاہب اور قدیم طریقے اسی پرانے توہم پرست زمانے کے لیے موزوں

---

[1] تُو فلسفی تو بن گیا ہے مگر تجھے اتنا علم نہیں کہ تو کہاں ہے، کہاں سے آیا ہے اور تیری حقیقت کیا ہے۔ اے بے خبر! جب تجھے اپنی ہی خبر نہیں تو تجھے ایسے علم پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔

اور مناسب تھے اور اسی زمانے کے ساتھ رہ جانے چاہئیں۔ اب زمانہ ماشاء اللہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ پرانے مذاہب اور قدیم طریقے اس مہذب اور بیدار زمانے کو سنبھالنے اور شاہراہِ ترقی پر چلانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اس واسطے نئے ریفارمروں اور نئے فیشنوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، منہ سے ہر وقت اٹھتے بیٹھتے دھواں نکالنا، سیٹیاں بجانا، لہو و لعب اور کھیلوں میں بندروں کی طرح ناچنا اور مینڈکوں کی طرح پھدکنا پھاندنا ان کے نزدیک تہذیب کی علامتیں اور شائستگی کے آثار ہیں۔

اب نظر آتی نہیں ہے مسجدوں کے فرش پر
قوم نے اتنی ترقی کی کہ پہنچی عرش پر

(اکبرالہ آبادیؔ)

اگر ان کے سامنے مذہب اور اخلاق کا نام لیا جائے تو کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہم کو پرانے فرسودہ دقیانوسی زمانے کی طرف پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں۔ زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ یہ لوگ عورتوں کی آزادی اور بے پردگی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اور یورپ کے جاہلوں اور بے دینوں کی طرح عورتوں کو محفلوں اور مجلسوں میں مردوں کے دوش بدوش عریاں اور رقصاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس بے شرمی، بے حیائی اور بے عزتی کو ترقی، آزادی اور تہذیب کا نام دیتے ہیں۔ اے مغرب پرستو! اگر اس دیوثی کا نام ترقی اور آگے بڑھانا ہے تو یہ آگے بڑھنا تم کو مبارک ہو۔ ہم پیچھے ہی سہی۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

(اقبالؔ)

بعض لوگ ہیں کہ جملہ انبیا کے معجزات اور تمام اولیا کی کرامات اور خوارق عادات کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قانونِ قدرت کے خلاف کبھی واقع نہیں ہو سکتا اور دنیا میں جو علت و معلول، شرط و جزا اور سبب و اثر کا سلسلہ جاری نظر آتا ہے اس کے سوا نہ کوئی علت ہے اور نہ کوئی غیبی محرک و فعال قدرت موجود ہے۔ دنیا محض یہی عالمِ اسباب ہے۔ جو دائرۂ حواس کے اندر معلوم اور محسوس ہے۔ جس طرح کسی چیز کی فطرت واقع ہوئی ہے اس کے برخلاف

کبھی واقع نہیں ہوسکتا۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے، آگ جلاتی ہے، پانی ڈھلوان کی طرف بہتا ہے اور اس الحاد اور دہریت کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم ۳۰ : ۳۰)۔ جس کی تفسیر ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ اس فطرت سے مراد فطرتِ دینی ہے۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (الروم ۳۰ : ۳۰) سے مراد یہ ہرگز نہیں ہو سکتی کہ مادے کی خلقت میں تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ مادہ ہر وقت اور ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے اور ہر چیز میں تغیر و تبدل رونما ہے۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ قانونِ قدرت کے برخلاف کچھ واقع نہیں ہوسکتا بلکہ اللہ تعالیٰ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (البقرۃ ۲ : ۲۰) ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ ہرگز اپنے قانون کے تابع اور پابند نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے بنائے ہوئے اصول اور قواعد کا پابند ہو تو وہ خدا کس بات کا رہا۔ پھر تو کائنات میں مادے اور اس کے قوانین اور قواعد کا عمل و دخل رہا۔

خدا ہے فہم سے اور وہم سے دور
سمجھ لے جس کو بندہ وہ خدا کیا

اس دنیا کی چند روزہ مادی حکومتوں کو بھی گاہے گاہے بطور ضرورت قانون آرڈیننس جاری کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ (البروج ۸۵ : ۱۶) کو اپنے قانون اور قاعدے میں اسیر اور مقید رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں صاف صاف فرمارہے ہیں: یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ (الرعد ۱۳ : ۳۹)۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی لوحِ قدرت اور لوحِ محفوظ میں سے جس امر کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔ اور اس کے پاس لوحِ علم کی ام الکتاب ہے اور مسلمہ مسئلہ ہے کہ اَلْاَمْرُ یَتَغَیَّرُ وَالْعِلْمُ لَا یَتَغَیَّرُ یعنی امر اللہ بدلتا ہے اور علم اللہ نہیں بدلتا۔ بلکہ علم کے ذریعے امر کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً پانی ڈھلان کی طرف بہتا ہے۔ لیکن علم پمپ اور فوارہ کے ذریعے پانی نیچے سے اوپر کی طرف لایا جاسکتا ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس باقی سب امور کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ ۝ (البقرۃ ۲ : ۲۵۳) اور یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ ۝ (المآئدۃ ۵ : ۱)

یعنی اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز کا ارادہ کرے اپنے حکم سے پورا کرتا ہے۔ کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اور پھر صاف طور پر فرماتے ہیں: وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○(یوسف ۱۲ : ۲۱)۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے ہر امر اور قانون پر غالب ہے اور اس کے تغیر و تبدل پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کائنات کی ہر چیز میں طلوع و غروب، تغیر و تبدل اور ہر اصول و قواعد میں نقیض اس کے قہر ماہیت قدرت اور غلبۂ امر کا صاف صاف پتہ دے رہے ہیں۔ اور کوئی بات ہماری توقع اور قیاس کے مطابق واقع ہوتی نظر نہیں آتی اور کسی امر کے وقوع کے لیے صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی بلکہ اسباب کی آستین میں قدرت کا ہاتھ کارفرما ہے اور اکثر اسباب کے پردے میں کام کرتی رہتی ہے۔ لیکن گاہے بوقتِ ضرورت اسباب کی آستین چڑھا کر اور اتار کر کام کرنے لگ جاتی ہے۔ لہٰذا انبیا علیہم السلام کے معجزات اور اولیا کرام کی کرامات اور خوارقِ عادات محض قدرت کے ننگے ہاتھ کے کرشمے ہوا کرتے ہیں اور قانون جاریہ کے خلاف وقتی ضرورت کی تکمیل کے لیے گویا آرڈیننس ہوا کرتے ہیں۔ جن نادان نفسانی کور چشم لوگوں کی نظریں مادی اسباب تک محدود ہوا کرتی ہیں اور کنوئیں کے اندھے مینڈک کی طرح وہ مادی کنوئیں کو ساری کائنات سمجھتے ہیں وہ قدرت کی فوق الفطرت غیر مادی کارفرمائیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور قرآن میں جہاں کہیں اس قسم کے غیر فطری خلاف قیاس معجزات اور کرامات کا ذکر آتا ہے ان کو اپنی مادی عقل اور قیاس کے مطابق بنانے کے لیے معانی اور مفہوم میں عجیب قطع و برید اور سخت ناروا کفر انگیز تاویلیں کیا کرتے ہیں۔ ہم ان کور چشموں کو معذور اور مجبور سمجھتے ہیں۔

زاہلِ مدرسہ اسرارِ معرفت مطلب     کہ نکتہ داں نشود کرم گر کتاب خورد

ترجمہ: مدرسہ اور مکتب والوں سے معرفت کے اسرار نہ پوچھ۔ کیونکہ کیڑا چاہے کتاب بھی کھالے وہ نکتہ داں نہیں بن جاتا۔

نہیں ہے سائنس واقف کارِ دیں سے     خدا ہے دور حدِ دوربیں سے

بعض مذہب کو سیاست سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور مذہب کو محض عبادات اور اعتقادات میں محدود خیال کرتے ہیں کہ بندے کا خدا کے ساتھ ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے۔ سیاست

کا معاملہ بندوں کے درمیان آپس کا ہے۔ دنیوی اور سیاسی ترقی میں مذہب رکاوٹیں پیدا کرتا ہے اس لیے اس کو عملی دنیا میں جگہ نہیں دیتے۔ اسے ایک خیالی چیز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب کا مدعا اور غرض و غایت توحید یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور جاننا ہے اور یہ چیز ہمیں خیالات میں حاصل ہے تو پھر عملی اور شرعی تکلیفات کی کیا ضرورت ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تقریباً پانچ سو سال کے عرصے میں احکام اور قوانین میں تبدیلی کی ضرورت پڑی مگر تیرہ سو سال تک وہی ایک مذہب اور ایک ہی قسم کے قوانین اور احکام جاری ہیں۔ یہ بڑا ظلم ہے۔

بعض منکرِ نبوت نجات کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ انبیا توحید کے واسطے مبعوث ہوئے ہیں اور انہیں بھی اسی توحید کے علم اور عمل کا حکم تھا۔ پس جس کو اصل مقصود حاصل ہو غیر مقصود کا انکار اسے نقصان نہیں دیتا۔ پس توحید اعتقادی طور پر ہمیں حاصل ہے۔ عبادت اور اعمال اسی اعتقاد کے مختلف مظاہر ہیں یا اس کی صحت کے لوازمات اور ذرائع ہیں۔ جب اصل مقصود حاصل ہو جائے تو ذرائع اور وسائل کی کچھ ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح یہ بد بخت يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (النساء ۴: ۱۵۰) کے مصداق بن کر اپنے آپ کو نبی اور اس کی شریعت سے بری سمجھتے ہیں۔

ایک اور فرقہ ہے جو اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتا ہے اور احکام کو محض قرآن میں محدود سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ احادیث غلطی سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس لیے ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ قرآن خود مکمل چیز ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور آیاتِ قرآن کی اپنے مطلب کے موافق تاویلیں کر کے يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا (البقرۃ ۲: ۲۶) کے مصداق ہوتے ہیں۔ بعض ائمۂ دین کے اجتہاد اور فقہ کا انکار کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہتے ہیں۔ قرآنی آیات اور احادیث میں سے اپنے مطلب کے موافق جس کا جس طرح جی چاہے اپنے لیے ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر علیحدہ دین بناتے ہیں۔ اور دینِ قیم کی وحدت اور اجماعِ امت میں بگاڑ، تفرقہ اور تشتت ڈالتے ہیں۔ انسان چونکہ فطرتاً اور قدرتاً جھگڑالو، جلد باز، سہل انگار، سست اور کام چور واقع ہوا ہے اس واسطے وہ خواہ مخواہ دینی قیود اور مذہبی پابندیوں سے آزادی حاصل کرنے اور اس میں قطع و برید کر کے

آسانی پیدا کرنے کے لیے ہزاروں مکر اور لاکھوں بہانے اور حیلے بناتا ہے اور خدائی احکام کو کسی نہ کسی طرح توڑ مروڑ کر اپنی خواہشِ نفسانی کے موافق اور مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ لوگ نفس کے بندے ہیں اور ہوائے نفس کے تابع ہیں اور جملہ احکام کو اپنے نفس کے موافق بنانے میں حیلے بہانے تراشتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ (الجاثیة ۴۵: ۲۳) ۔ ترجمہ: ’’آیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنایا اور باوجود علم کے اللہ نے اس کو گمراہ کیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ پس کون ہے جو ایسے شخص کو ہدایت کرے سوائے اللہ کے۔ آیا تم نہیں سمجھتے ہو۔‘‘

مختصر یہ کہ مغربی تعلیم نے الحاد اور دہریت کا زہر تعلیم یافتہ طبقے کے دلوں اور دماغوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ اکثر دل مذہبی نقطۂ نگاہ سے مر چکے ہیں۔ ان کے اندر کوئی مذہبی حس باقی نہیں رہی اور نہ انہیں ہدایت کی طرف لانے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ باقی اگر چند دل رہ گئے ہیں تو وہ سخت مہلک امراض میں مبتلا ہیں اور مذکورہ بالا شکوک اور شبہات ان کے قلوب کو بری طرح گھیرے ہوئے ہیں۔ اکثر کو تو دنیوی خطرات اور نفسانی خیالات سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ دین اور مذہب کے معاملے پر تہہِ دل سے غور کریں اور سوچیں کہ آخر ہم کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ موت کی ضروری، اٹل اور لابد مہم کو اس طرح بھولے ہوئے ہیں کہ گویا انہیں یہ دور دراز سخت کٹھن، جان گداز اور روح فرسا سفر درپیش ہی نہیں۔ بعض کو اگر بھولے سے بھی کبھی اچانک موت کی یہ بڑی بھاری مہم یاد بھی آ جاتی ہے تو اسے یوں ٹال دیا جاتا ہے کہ موت جب آئے گی تو اس وقت دیکھا جائے گا۔ اس سے پہلے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے لوگ چلے گئے ہیں وہ گذارہ کریں گے ہم بھی کر لیں گے۔ اس قسم کی طفل تسلیوں سے شیطان ان نادانوں کو تھپکا تھپکا کر خوابِ غفلت میں سلا دیتا ہے اور اس سفرِ آخرت کے لیے زادِ راہ اور توشہ و سامان بنانے سے باز رکھتا ہے اور اس وقت ہوش آتا ہے جب پانی سر سے گذر جاتا ہے اور خالی ہاتھ، محتاج، نادار، اپاہج، اندھا، لولا، لنگڑا، سخت مصائب و آلام میں مبتلا اور

گرفتار ہو کر دارِ آخرت کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس وقت حسرت، ندامت اور تاسف سے ہاتھ ملتا ہے۔ لیکن "پھر پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔

حشمت میں ہو تو گرچہ سکندر سے زیادہ  اور عمر تری نوحؑ پیمبر سے زیادہ
روزِ پسیں نہ کچھ بھی رہے گا بجز دریغ  ہر چند کہ روئے تو سمندر سے زیادہ

ہماری اس کتاب کے مطالعہ سے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس کتاب کا مفہوم تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان بس دنیا کے تمام کام کاج چھوڑ کر جنگل میں جا بسے یا کسی حجرے یا گوشے میں بیٹھ کر تمام عمر اللہ اللہ ہی کرے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تصور میں محو اور غرق ہو کر رہے۔ سو اس کتاب کی غرض و غایت تو رہبانیت کی مشق معلوم ہوتی ہے حالانکہ لا رھبانیة فی الاسلام آیا ہے۔ یعنی اسلام میں رہبانیت کی تعلیم نہیں ہے۔ ایسی تعلیم تو عیسوی دین کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں جا رہے۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام صاحب غار تھے اور ہمارے پیغمبرؐ صاحب السیف اور صاحب الجہاد ہوئے ہیں۔ آج اقوامِ عالم خصوصاً یورپین اقوام سیاسی اور دینوی ترقی کے فلک الافلاک پر پرواز کر رہی ہیں اور مسلمان ذلت اور ادبار کے گڑھے میں گرے جا رہے ہیں۔ اسلام کو تنظیم، اتحاد، تعلیم، دولتِ دینوی، عروج اور سیاسی علو وغیرہ کی ضرورت ہے۔ افسوس! مسلمانوں میں سے اکثر لیلائے سیاست و دولت کے مجنوں للچائی ہوئی نظروں سے یورپین قوموں کی چند روزہ حیوانی لذتوں اور نفسانی دولتوں اور فانی مسرتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ترستے ہیں اور جب خدا اور رسول اور اسلام کو اپنی نفسانی اغراض میں مؤید اور معاون نہیں پاتے تو دل ہی دل میں بگڑتے اور اسلام کے خلاف طرح طرح کی خرافات اگلتے ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے سے ہماری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ مسلمان جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل جائیں یا حجروں میں بیٹھ کر ساری عمر اللہ اللہ ہی کریں اور دنیا کا کوئی کام نہ کریں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ہاں البتہ مسلمانوں کو ذکر اللہ اور اسم اللہ ذات کی طرف راغب اور مائل کرنے سے ہماری غرض اور غایت یہ ہے کہ مسلمان پہلے اصلی اور حقیقی معنوں میں مسلمان ہو جائیں۔ ذکر اللہ اور اسم اللہ ذات سے نورِ ایمان اور روشنیٔ ایقان و عرفان حاصل کر کے اسلام کے پاک اخلاق سے متخلق اور ایمان کی نوری صفات سے متصف ہو جائیں۔ اس کے بعد جب وہ

اصلی اسلامی شان کے ساتھ میدانِ عمل میں نکلیں گے تو زندگی کے ہر شعبے اور دنیا کے ہر فعل اور عمل میں تائیدِ ایزدی ان کے شاملِ حال ہوگی۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ وَاَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ط (المجادلۃ ۵۸: ۲۲)۔ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان لکھ دیا گیا ہے اور انہیں اپنی روح سے تائید فرمائی ہے۔ ایسے اہلِ ایمان لوگوں کی زندگی کے دونوں دینی و دنیوی، ظاہری و باطنی، صوری و معنوی، سیاسی و اخلاقی اور بدنی و روحانی پہلو ہر طرح سے نہایت کامیاب اور خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ ایسا شخص اپنے لیے اور غیر کے لیے، گھر کے لیے اور قوم کے لیے غرض تمام دنیا کے لیے اور آخرت میں باعثِ صد راحت اور موجبِ ہزار رحمت ہو جاتا ہے۔ جس طرح جانور اللہ کے نام کی تکبیر سے ذبح کے وقت پاک اور حلال ہو جاتا ہے اسی طرح انسان ذکر اللہ اور اسم اللہ ذات کے نور سے پاک اور طیب ہو کر صحیح طور پر اسلام، ایمان، ایقان اور عرفان وغیرہ کے درجات اور مراتب سے مشرف اور سرفراز ہو جاتا ہے۔ جب تک کسی قوم کے افراد فرداً فرداً اپنے نفس کا تزکیہ ذکر اللہ اور اسم اللہ سے نہ کرلیں اور اپنے نفسوں کی حالت اور کیفیت کو اللہ کے لیے بدل نہ ڈالیں ہرگز اللہ تعالیٰ اس قوم کی مجموعی حالت کو نہیں بدلتا۔ کَمَا قَالَ عَزَّ ذِکْرُہٗ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَابِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ط (الرعد ۱۳: ۱۱) کیا ہمارے آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تجلیۂ روح اور تخلیۂ سر کی خاطر ابتدائے وحی کے زمانے میں رہبانیت اختیار کر کے کئی دفعہ اکیلے پہاڑ میں نہیں جا رہتے تھے۔ اور متواتر کئی ہفتوں تک غارِ حرا میں تصور اسم اللہ ذات کے پاک شغل کی خاطر دن رات معتکف نہیں رہتے تھے۔ سو ہر مسلمان پر جو اصلی اور حقیقی معنوں میں مسلمان اور مومن باایمان بننے کا خواہش مند ہو فرضِ عین اور سنتِ عظیم ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک دفعہ ضرور اپنے دل کو اسم اللہ ذات کے صبغۃ اللہ سے پوری طرح رنگ لے اور بطور کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ (المجادلۃ ۵۸: ۲۲) اپنی لوحِ قلب پر نقش اسم اللہ ذات کو نقش اور مرقوم کرلے۔ اس کے بعد وہ عملی دنیا میں اگر نکلے گا تو تائیدِ ایزدی اس کی ہر جگہ اور ہر فعل میں دستگیری کرے گی۔ قوم کا ہر فرد جب اس شان سے نمایاں ہو جائے گا تو اس وقت قوم کی مجموعی حالت بھی بدل جائے گی۔ اور اَلۡاِسۡلَامُ یَعۡلُوۡ وَلَا یُعۡلٰی کی صفت سے جلوہ گر ہو جائے گی۔ ورنہ صرف

اسلامی نام کے رکھے جانے یا مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے سے انسان کی نجات ہر گز نہیں ہو سکتی اور نہ دینی اور دنیوی ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ صرف ظاہر صورتِ اسلامی اور رسمی رواجی عمل سے بھی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک صحیح اسلامی سیرت اور کردار اور ایمانی قلب اور خالص نیت پیدا نہ کرے۔ جیسا کہ حدیثِ نبوی ﷺ میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَلَا اِلٰی اَعْمَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَ نِیَّاتِکُمْ (مسلم) ۔ترجمہ: تحقیق اللہ تعالیٰ نہ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے اور نہ صورتوں، نہ تمہارے اعمال اور افعال کو بلکہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کا جب باطن صحیح اور درست ہو جائے گا تو ان کا ظاہر بھی اصلاح پزیر اور ترقی یافتہ ہو جائے گا۔ جب دل کی اصلاح ہو جاتی ہے تو جسد اور تن تبعاً درست ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: اِنَّ فِیْ جَسَدِ بَنِیْ آدَمَ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ، صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ ۔ترجمہ: "بنی آدم کے جسد میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب اس کی اصلاح ہو جاتی ہے تو تمام جسد اور بدن کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ خبردار وہ گوشت کا لوتھڑا دل ہے۔" غرض جس وقت قوم کے افراد کے قلوب اور نفوس اصلاح پذیر ہو کر بدل جائیں تو قوم کی ظاہری، دنیوی، سیاسی، اقتصادی اور باطنی مذہبی اور روحانی حالت بھی بدل جاتی ہے۔ جس زمانے میں مسلمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے فرماں بردار اور قرآن اور حدیث پر عمل کرنے والے یعنی متقی اور پرہیزگار تھے دنیا کی حکومت اور بادشاہی بھی ان کے قدم چومتی تھی۔ لیکن جس وقت مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور فرماں برداری چھوڑ دی اور نفس اور ہوا کے پیچھے پڑ کر قرآن اور حدیث پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس نافرمانی کی سزا میں ان پر ذلت اور مسکنت کو مسلط کر دیا اور ان سے سلطنت اور حکومت چھین کر اغیار کے حوالے کر دی۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار قریش نے جب اشاعتِ دین اور تبلیغ حق کے اجراء سے روکنے کی انتہائی کوشش کی حتیٰ کہ آپ ﷺ کو قتل کرنے اور دینِ اسلام کے مٹانے کا تہیہ کر لیا اور آپ ﷺ کو اپنا وطن مالوف مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ کے طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تو آپ ﷺ نے وہاں جا کر تبلیغ اسلام اور اشاعتِ دینِ حق کا کام شروع کر دیا۔ کفار نابکار کو جب معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ نے اپنا مشن وہاں بھی جاری کر دیا

ہے اور آپ ﷺ کو وہاں اس میں زیادہ کامیابی ہو رہی ہے تو ان الٰہی دشمنوں نے آپ ﷺ کو وہاں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اور آپ ﷺ کے مشن کو مٹانے کے لیے کوششیں جاری رکھیں اور وہاں جاکر حملے شروع کر دیئے تو آپ ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان معاندین اور مخالفین کے خلاف مجاہدانہ کارروائی شروع کرنے اور علمِ جہاد بلند کرنے کا اذنِ عام مل گیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے اصحابؓ کبار نے محض اعلاء کلمۃ الحق اور تبلیغ دینِ حق کے لیے بمصداق حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط (البقرہ ۲: ۱۹۳) تمام مخالفین اور جملہ کفار و مشرکین کے خلاف تلوار اٹھائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی نصرت آپ ﷺ کے شاملِ حال رہی اور آپ ﷺ کو اپنے سچے جہاد اور حقیقی مشن میں پوری کامیابی حاصل ہوئی اور آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے جانشینوں اور دین حق کے سچے پیروؤں کو دینِ حق کی تبع میں دنیا کی بادشاہی اور سلطنت بھی حاصل ہو گئی اور جہاں کہیں خدا کے ان صادق بندوں کے مبارک قدم پہنچے وہاں توحید اور دینِ حق کا آفتاب چمک پڑا اور کفر، شرک اور نفاق کی ظلمتیں دلوں سے کافور ہو گئیں اور تمام دنیا کی کایا پلٹ گئی۔ دل صاف ہو گئے اور نیتیں بدل گئیں۔ ہر شخص اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے برائی سے رک گیا اور رجا رحمت کے ارادے سے نیک کام کرنے لگ گیا اور اسی طرح تمام دنیا اسلام کی سلامتی، ایمان کے امن اور عرفان کی عافیت میں راحت اور آرام کی زندگی بسر کرنے لگ گئی۔ دنیا میں ہر جگہ عدل اور انصاف کا دور دورہ ہو گیا۔ اخوت اور مساوات قائم ہو گئی۔ اور ظلمت، جبر و استبداد کی تاریکی اور سرمایہ داری کی لعنت دنیا سے مٹ گئی اور اسی طرح اسلام کی نوری فضا میں دنیا نے اطمینان اور تسکین کا سانس لیا۔

ہمارے اس زمانے کے لیڈروں میں جب تک مذہبی اور روحانی سپرٹ پیدا نہ ہو گی، ان کی نیت نیک اور دل صاف نہ ہوں گے وہ قوم کو دینی اور دنیوی نجات کا راستہ دکھانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے آج کل کے لیڈروں کو اللہ تعالیٰ اور دارِ آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اسی دنیا کے لیے کرتے ہیں۔ وہ گویا ایک قسم کے تاجر ہیں۔ وہ اگر کبھی مصلحتِ وقت کی خاطر قوم کے لیے کوئی تھوڑی سی وقتی جانی یا مالی قربانی پیش بھی کرتے ہیں تو اس کے عوض تمام قوم سے بہ ہیئت مجموعی وسیع پیمانے پر دائمی عزّ و

جاہ اور دولتِ دنیا کے طالب ہوتے ہیں۔ ملحد اور بے دین لیڈر کسی صورت میں قوم کا حقیقی راہنما اور اصلی نجات دہندہ نہیں بن سکتا اور نہ اس کی نیت صاف ہو سکتی ہے۔ وہ تھوڑے سے شخصی سرمائے کے ذریعے قوم کی ساری پونجی پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو ایک قصاب ہے، جس نے اپنی نیت کی چھری من کے میان میں چھپا رکھی ہے اور گڈریے اور پاسبان کا لباس اوڑھ رکھا ہے۔ قوم کا سچا راہنما اور اصلی نجات دہندہ وہی شخص ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھے۔ جسے یومِ آخرت، حساب کتاب اور سزا و جزا کا صحیح یقین ہو۔ جس کا ہر فعل اور عمل اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ ایسا شخص قوم کا حقیقی خیر اندیش اور سچا بہی خواہ ہوتا ہے۔ وہ لوگوں سے کسی چیز کا طالب نہیں بنتا۔ وہ لوگوں کو اپنے لیے نہیں بلکہ انہیں کے فائدے کے لیے چاہتا ہے۔ اس کا سچا سودا اور لین دین اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ وہ اپنی متاع اپنے خالق کے ہاتھ بیچتا ہے اور بازارِ آخرت میں اس کی قیمت اور معاوضے کا طلب گار ہے۔ نہ مخلوق سے اسے کوئی دنیوی غرض اور نہ نفسانی سروکار ہے۔ دنیا کے تمام ملحد اور بے دین لیڈر چور، اُچکے، ڈاکو اور رہزن ہیں۔ یہ لوگ کبھی دنیا میں امن قائم نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مہذب ڈاکو مذہب اور روحانیت کو الٹا موجب باہمی نزاع و نفاق قرار دے کر دنیا سے اسے مٹانا چاہتے ہیں اور اس کے استیصال اور بیخ کنی کے درپے ہیں۔ یہ نادان الحاد اور دہریت کی رو میں بہے جا رہے ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ اگر مذہب اور روحانیت دنیا سے نکل جائے تو دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔ لیکن یاد رہے کہ اگر مذہب اور روحانیت کا سلیمانؑ دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے نہ رہا تو دہریت کے عفریت سے یہ کبھی امید نہیں ہو سکتی کہ وہ دنیا میں امن قائم کر سکے۔ ہاں دہریت اور بے دینی کے دور سے یہ فائدہ ضرور رہے گا کہ انسانی جبر و استبداد سے آزادی نہ سہی خدا اور رسول سے تو آزادی مل جائے گی۔ ایک قوم کی اصلی ترقی یہ ہے کہ وہ ظاہری و باطنی، صوری و معنوی، دینی و دنیوی، مادی و روحانی اور سیاسی و مذہبی دونوں طریقوں پر ترقی کرنے میں گامزن ہو۔ ورنہ اگر دین اور مذہب کو سیاست کی بھینٹ چڑھا کر بفرضِ محال دنیوی ترقی حاصل بھی کر لی جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک شخص نے سر دے کر ٹوپی حاصل کر لی اور پاؤں کٹوا کر جوتے پائے اور انسان کی چند روزہ غلامی سے نجات پانے کی خاطر نفس اور شیطان کی ابدی غلامی میں گرفتار ہوا۔

## رباعی

گیرم[1] پسرا کہ رستم و سام شدی | یا خسرو نیمروز یا شام شدی
نے زور بہ گوری تواں برد نہ زر | افسوس کہ کیمیائے اوہام شدی

جو شخص اللہ تعالیٰ اور دارِ آخرت کا منکر ہو اور اس کی تمام اغراض دنیا تک محدود ہوں اور مخلوق سے اس کی تمام امیدیں وابستہ ہوں وہ بھلا اس دنیوی رد و بدل اور مادی سودا بازی کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

(اقبالؔ)

جو لوگ دنیا میں حیوانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن کا مشغلہ کھانا پینا اور ٹٹی کرنا ہے۔ دنیا میں آئے اور چند روز حیوانوں کی طرح کھا پی کر چلتے بنے۔ جن کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ o (الاعراف۷: ۱۷۹)۔ ترجمہ: "ان کے دل تو ہیں لیکن ان سے کچھ سمجھتے نہیں، ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بدتر اور گمراہ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور دارِ آخرت سے غافل ہیں۔"

## ابیات

خواجہ رابیں کہ از سحر تا شام[2] | دارد اندیشۂ شراب و طعام

---

[1] اے فرزند! میں نے تسلیم کر لیا کہ تو (بہادری میں) رستم زال اور سام نریمان جیسا ہو گیا۔ تو نیمروز یا شام کے ملک کا تاجدار بن گیا ہے لیکن یاد رکھ کہ قبر میں تیرے ساتھ نہ تیرا زور جا سکے گا نہ زر۔ افسوس صد افسوس کہ تو وساوس واوہام کی کیمیا گری میں مبتلا ہو گیا۔

[2] تو دنیا دار کو دیکھ کہ صبح سے شام تک اسے بس کھانے پینے کا فکر رہتا ہے۔ وہ اپنے پیٹ کو خوشحالی اور فراخیٔ رزق کے باعث کبھی بھرتا ہے کبھی خالی کرتا ہے۔ وہ جنت اور دوزخ دونوں سے فارغ اور بے غم ہے (نہ تو نیک عمل کی طرف میلان ہے اور نہ معصیت سے اجتناب) اس کا ٹھکانہ بیت الخلاء یا باورچی خانہ ہے۔

شکم از خو شدلی و خوشحالی   گاؤ پُر ے کند گہے خالی
فارغ از خُلد و ایمن از دوزخ   جائے او مزبلہ است یا مطبخ

جو کور چشم نفسانی محض گوشت اور ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں اور جو خالی اسی آب و گل یعنی مادی دنیا کو سب کچھ جانتے ہیں، جو باطنی حواس سے محروم اور نورِ ایمان سے خالی ہیں ایسے لوگ اگر اللہ تعالیٰ اور دارِ آخرت کا انکار کریں تو وہ معذور ہیں کیونکہ ان کے قلوب مادے کے غلاف میں مستور ہیں۔ بھلا ایسے لوگ روح اور روحانی دنیا کو کیا جانیں۔ روحانی اور باطنی دنیا میں موجود ہیں لیکن جن کے سر میں نہ باطنی آنکھیں ہوں اور نہ باطنی کان وہ کیا خاک دیکھیں اور سنیں۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے باطنی حواس کھلتے ہیں لیکن نہ وہ اس طرف کبھی آئے اور نہ انہوں نے کوشش کی۔ تو قصور کس کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض اور کنارہ کشی باطنی کورچشمی کا موجب ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴)۔ اور مشاہدہ کے لیے مجاہدہ شرط ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت ۲۹: ۶۹)۔ ترجمہ: ”جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ اور کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستے دکھاتے ہیں۔“ یہ لوگ قلبی امراض میں مبتلا ہوئے لیکن وہ کبھی طبیب القلوب کے پاس علاج کے لیے نہ گئے۔ ان کی آنکھیں آئیں اور اندھے ہو کر رہ گئے لیکن کبھی سلیمانی سُرمے کی تلاش میں نہ نکلے۔ ہم اس جگہ مادی دنیا میں باطنی شخصیتوں اور روحانی جنّوں کے افعال اور آثار بطور مشتے نمونہ از خروارے بیان کرتے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ناظرین اہلِ یقین کو پتہ لگ جائے گا کہ ہماری اس مادی دنیا کے علاوہ ایک باطنی اور روحانی دنیا بھی موجود ہے جس کے آثار گاہے گاہے اس مادی دنیا میں بھی نمودار ہو جایا کرتے ہیں۔ کیونکہ باطنی اور روحانی دنیا اس مادی اور عنصری دنیا کے ساتھ اس طرح متحد اور پیوست ہے جس طرح روح جسدِ عنصری کے ساتھ متصل اور مربوط ہے۔

..............○..............

# مادی دنیا میں باطنی جنّوں کے آثار و افعال

اس مادی دنیا میں انسان پر صرف خواب کے اندر عالمِ غیب اور روحانی دنیا کے وارداتِ غیبی گاہے گاہے واقع ہوتے ہیں۔ اور محض خواب ہی میں ان غیر مرئی اشیا کا ظہور ہونے لگتا ہے اور نیند میں دوسری زندگی کے تاثرات کسی قدر باطنی حواس پر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور عالمِ امر یعنی لطیف دنیا کی اشیاء کو محض خواب کے وقت انسان گاہے گاہے بطور مُشتے نمونہ از خروارے محسوس کر کے اندازہ لگا سکتا ہے کہ ہاں اس مادی دنیا کے علاوہ کوئی اور لطیف دنیا بھی موجود ہے کیونکہ خواب کے وقت انسان کے ظاہری حواس بند ہو جاتے ہیں اور تمام مادی اعضا اپنے کام سے معطل ہو جاتے ہیں۔ گویا انسان پر ایک گونہ بے ہوشی اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ اگر خواب کو موتِ اصغر یعنی چھوٹی موت کہیں تو بجا ہے۔ اس واسطے اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ (مشکوٰۃ) آیا ہے۔ یعنی نیند موت کا بھائی ہے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

اے برادر من ترا از زندگی دا دم نشاں
خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں
(اقبالؒ)

چنانچہ موت بھی ظاہری حواس اور قویٰ اور جسمانی اعضا کے انعطال اور بے کار ہو جانے کا نام ہے اور جو کچھ موت کے بعد واقع ہوگا اس کا نمونہ کسی قدر خواب میں ضرور پیش آ جانا چاہیے۔ موت کے بعد کی کیفیت کے اثرات کچھ نہ کچھ خواب میں پیش آنے بہت ہی قرینِ قیاس ہیں۔ عوام کے لیے عالمِ غیب اور عالمِ امر کی طرف جھانکنے کے لیے یہی خواب کا ایک روزن رکھا گیا ہے اور سچے خوابوں سے ایک سلیم العقل انسان دارِ آخرت کے ثبوت کے لیے بہت اچھے نتیجے نکال سکتا ہے۔ اس واسطے رویائے صادقہ یعنی سچے خوابوں کو نبوت کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ پس خواب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ کہ جب خواب کے وقت انسان پر نفس کی قوتِ متخیلہ غالب ہوتی ہے اور حواسِ ظاہرہ کے مدرکات خزانہ خیال میں مجتمع ہو جاتے ہیں اور ان کا عکس دل کے آئینے پر پڑتا ہے۔ اس

وقت بعینہٖ وہی عادی خیالات اور تصورات خواب میں متشکل ہو کر نظر آتے ہیں۔ یہ اضغاثِ احلام یعنی خیالاتِ پریشان کہلاتے ہیں جن کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ لیکن کبھی نفسِ ناطقہ جب کہ وہ اس عالمِ محسوس سے بسبب انعطال حواسِ خمسہ اور قویٰ ظاہری عالم غیر محسوس یا عالمِ ارواح کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس جوہرِ صافی پر عالمِ غیب کے واقعات اس طرح منعکس ہوتے ہیں جس طرح صاف آئینہ میں محسوسات کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ پھر عالمِ بیداری میں وہ ہو بہو اسی طرح واقع ہوتی ہیں۔ ایسے خوابوں کو اضغاثِ احلام قرار دینا اور پریشان خیالات کہنا پرلے درجے کی حماقت اور سچے واقعات کا انکار ہے۔ ہاں کبھی جب دل کے آئینے کو عالمِ محسوس کے عادی خیالات نے مکدر کیا ہوا ہوتا ہے اور اس پر عالمِ غیب کے واقعات کا عکس کماحقہٗ نہیں پڑ سکتا اس وقت دل پر رویائے صادقہ اور پریشان خیالات کی مٹھ بھیڑ ہو جاتی ہے۔ اس وقت ایک تیسری شکل پیدا ہوتی ہے۔ ایسے خواب کے بعض حصے سچے خواب ہوتے ہیں اور بعض پریشان خیالات۔ سو یہ حالت بھی چنداں قابلِ وقعت نہیں۔ مگر بعض دفعہ انسان خواب کے اندر ایسی باطنی وادی میں چلا جاتا ہے کہ جہاں روزانہ عادی خیالات، نفسانی ارادات اور دنیوی خطرات کا دخل ہی نہیں ہوتا اور انسان خواب میں صبح صادق کی طرح شک اور شبہ کے غبار سے پاک اور صاف مطلع دیکھتا ہے۔ اس وقت دل کے آئینے پر عالمِ ملکوت یعنی عالمِ غیب کے حالات اس طرح منعکس ہوتے ہیں جیسا کہ فلم کے پردے پر متحرک اور متکلم صورتیں بعینہٖ ہو بہو صاف طور پر نمودار ہوتی ہیں۔ اس قسم کے واقعات جب خواب میں انسان دیکھتا ہے تو بیداری میں ہو بہو اسی طرح یا گاہے ہفتہ یا مہینہ یا گاہے سال اور کبھی برسوں کے بعد ضرور رونما ہو جاتے ہیں۔ سو ایسے خواب دل کے سچے حقائق کا نمونہ ہوتے ہیں۔ قولہٗ تعالیٰ: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ٥ (النجم ۵۳: ۱۱) ۔ یعنی دل جو کچھ دیکھتا ہے اس میں کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوتا۔ دنیا میں تقریباً ہر انسان کو کسی نہ کسی سچے خواب کا واقعہ ضرور پیش آیا ہو گا جس سے اس بات کا کافی ثبوت مل سکتا ہے کہ انسان کے اندر ان مادی اعضاء اور ظاہری حواس کے ماسوئی ایک اور چیز بھی مدرک ہے جس کو باطنی شخصیت یا نفس، قلب اور روح کہتے ہیں۔ اور موجودات کا سلسلہ صرف محسوسات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس مادی دنیا کے

علاوہ ایک اور لطیف روحانی دنیا بھی موجود ہے۔ جس کے آثار کبھی کبھی اس مادی دنیا میں اس عنصری جسم پر نمودار ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر انسان نے عمر بھر میں کوئی نہ کوئی سچا خواب دیکھا ہوگا جو ہو بہو جلدی یا بدیر واقع ہوا ہوگا۔ یا اگر کوئی شخص خود نہیں دیکھ سکا تو کسی قریبی خویش یا دوست اور رفیق کے خواب کی صداقت ضرور آزمائی ہوگی کیونکہ اس قسم کے واقعات نہایت معمولی باتیں ہیں۔ چھوٹے بچے، کمزور، ناقص العقل عورتیں، فاسق، فاجر انسان حتیٰ کہ کفار مشرکین اور منافقین تک ہر قسم کے سچے خواب دیکھ سکتے ہیں اور یہ عام روزن ہر خاص و عام کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے ایک واقعہ خواب میں دیکھا گیا ہے اور صبح کو ہو بہو اسی طرح واقع ہو گیا ہے۔ یا کبھی کسی گمشدہ چیز کی بابت خواب میں اطلاع کے مطابق وہ چیز مل گئی یا کبھی کسی مرض کی دوا بتائی گئی ہے اور اس پر عمل کرنے سے صحتِ کلی حاصل ہو گئی ہے۔ یا کبھی کسی موت یا فوت کی خبر سنائی گئی ہے یا کسی اولادِ نرینہ کی پیدائش کی بشارت مل گئی ہے اور اسی طرح ظہور پذیر ہو گیا ہے۔ یا کبھی کسی مقدمے کی فتح یا کسی سفر پر گئے ہوئے خویش یا دوست کی آمد کی خبر مل گئی ہے یا کبھی آئندہ رنج یا خوشی کا واقعہ خواب میں نظر آ گیا۔ یا کوئی اجنبی شخص یا نادیدہ مکان یا نیا شہر خواب کے اندر دیکھا گیا۔ بعد میں بیداری پر ہو بہو ان سب کا وقوع اور ظہور ہو گیا۔ سو یہ امر بدیہی ہے کہ یہ حواسِ ظاہری اور بدنی اِدراکات کا کام تو ہرگز نہیں ہے۔ ملحد مادہ پرست کور چشم اس قسم کے سچے حقائق اور دیگر غیبی ادراکات اور روحانی واردات کی جوان کی مادی عقل کے میزان میں پوری نہ اتر سکیں کوئی نہ کوئی تاویل اور توجیہ کر لیتے ہیں۔ لیکن کچھ عقلِ سلیم اور ذرا باطنی حواس کے مالک اس قسم کے واقعات سے ضرور اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ہماری اس مادی دنیا کے علاوہ ضرور ایک روحانی لطیف دنیا بھی آباد ہے۔ جو گاہ بگاہ باطنی حواس سے معلوم اور محسوس ہوتی رہتی ہے۔ ورنہ نیک لوگ تو ایسے سچے خواب ہر روز دیکھتے ہیں اور انہیں ہمیشہ سچا پاتے ہیں اور کبھی خطا نہیں کرتے۔ بعض زندہ دل لوگ مستقبل کے آئندہ واقعات مراقبے کے اندر، گاہے بیداری میں دیکھا کرتے ہیں۔ انبیا اور اولیا کا تو کہنا ہی کیا ہے ان کا دل تو جامِ جمشید اور آئینۂ سکندری ہوتا ہے جس میں تمام دنیا کے حالات اور واقعات رونما ہوتے ہیں۔ انسانی دل اللہ تعالیٰ کی لوحِ محفوظ کا ایک ماڈل اور نمونہ ہوا کرتا

ہے اور ہر شخص بقدرِ وسعت و استعداد اس میں حال، ماضی اور مستقبل کے حالات اور واقعات کا نظارہ کرسکتا ہے۔ جس طرح انسان کو ظاہری حواس سے متمتع کیا گیا ہے کہ جس وقت چاہے ان سے عالمِ محسوسات کی اشیا معلوم اور محسوس کرسکتا ہے اسی طرح جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے باطنی حواس عطا کردیئے ہیں وہ جس وقت چاہیں ان سے باطنی اور روحانی دنیا کی اشیا اور عالمِ امر کے واقعات اور حالات کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ o (الجمعۃ ۶۲ : ۴) اور جس کے دل کی دوربین کا آئینہ جس قدر وسیع ہے اس میں غیبی حقائق اور روحانی اشیا وسیع پیمانے پر رونما ہوتی ہیں۔ حال ہی میں ماہیت دانوں اور سائنس دانوں نے ایک ایسی بھاری اور وسیع دوربین ایجاد کی ہے جو کیلے فورنیا کی رصدگاہ اور آبزرویٹری میں نصب کی گئی ہے۔ جس سے کروڑہا ایسے سیارے اور ستارے نظر آگئے ہیں جو پہلی دوربینوں سے نظر نہیں آسکتے۔ اور آئندہ اس سے زیادہ بڑی اور وسیع ترین دوربین عالمِ وجود میں آنے والی ہے۔ جب اس مادی وسعتِ نظری پر کسی قسم کا کوئی کنٹرول نہیں ہے اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کسی ولی یا نبی کے دل کی دوربین کو وسعت بخشے اور وہ اس میں تمام جہان کا نظارہ کرے تو اس میں اے حاسدو! تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ج وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (الروم ۳۰ : ۷)۔

آئینۂ سکندر جامِ جم است بنگر
تا بر تو عرضہ دارد احوالِ مُلکِ دارا[1]

(حافظ شیرازی)

ترجمہ: دل آئینۂ سکندر جامِ جمشید کی طرح ہو۔ اس میں دیکھ تاکہ یہ تجھے دارا کے ملک کے حالات بتائے۔

ہاں کُل عالمِ غیب اور عالمِ امر اور عالمِ خلق کو ہر وقت اور ہر آن انفرادی اور مجموعی،

---

[1] شعر کے دوسرے مصرع میں دارا سے دو معنی نکلتے ہیں: ایک وہ جو بیان ہوا، دوم یہ کہ دارا کے معنی مالک کے بھی ہیں۔ لہٰذا اس کا یہ مطلب ہوا کہ دل آئینۂ سکندر اور جامِ جمشید کی طرح ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی کائنات کے تمام حالات دیکھنے پر نظر آسکتے ہیں۔

اجمالی اور تفصیلی اندرونی اور بیرونی طور پر معلوم اور محسوس کرنا اور تمام کائنات اور اس کے ہر ایک ذرّے کا علم ہمیشہ کے واسطے رکھنا اور اس علم میں کسی وقت نقص اور کمی نہ آنا یہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود اور عالم الغیب والشہادۃ کو مسلّم ہے اور اس کی مخصوص اور ممتاز صفت ہے۔ جس میں اور کوئی ذات اس کی شریک اور ہمتا نہیں ہو سکتی۔ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ (الحدید ۵۷ : ۳)۔

| | |
|---|---|
| اول و آخر توئی کیست حدوث وقدم | ظاہر و باطن توئی چیست وجود و عدم |
| اول بے انتقال آخر بے ارتحال | ظاہر بے چند و چوں باطن بے کیف و کم |

تمام کائنات اور اس کا علم بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا علم کسی کو عطا کر دے اور مخلوق کو مخلوق اور حادث کو حادث کا علم بخش دے تو اس واجب الوجود غیر مخلوق ذات کی نامتناہی صفتِ علم میں ایک ذرہ برابر دخل اور شرک لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ہماری تمام کائنات کا ہمہ گیر اور ہمہ دان علم ہر حال میں مخلوق ہے اور اسے خالق غیر مخلوق کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ ذات وراء الوراء اور ثم وراء الوراء مخلوق کے علم اور جہل سے بالاتر ہے۔

| | |
|---|---|
| اولی و ہم در اول آخری | باطنی و ہم درآں دم ظاہری |
| تو محیطی برہمہ اندر صفات | و زہمہ پاکی و مستغنی بذات |

ترجمہ: تو اول بھی ہے اور آخر بھی ہے اور تو باطن بھی ہے اور اسی وقت ظاہر بھی ہے۔ تُو اپنی صفات کے لحاظ سے سب مخلوق پر محیط ہے لیکن اپنی ذات کے لحاظ سے سب سے پاک و مستغنی ہے۔

اے دوست! یقین کر لے کہ انسانِ کامل اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ چشمِ بصارتِ ظاہری اور چشمِ بصیرتِ باطنی سے کائنات کی ظاہری اور غیبی اشیاء کو دیکھ سکتا ہے۔ ہر برتن اور ظرف میں اسی قدر چیز آتی ہے جس قدر اس میں وسعت ہوتی ہے۔ تاہم اگر حاسدین اور بُخلاء برا نہ مانیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب اس خالق ذوالجلال کی بے مثل و بے مثال رویت ولقا اور وصل کو قبل یا بعد از موت شریعت نے (اس خاکی انسان کے لیے) جائز کر دیا ہے تو مخلوق کے مخلوق اور محدود علم میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے کہ وہ اس کے لیے جائز نہ ہو۔

ظہورِ تو بمن است و وجودِ من از تو
فَلَسْتَ تَظْهَرُ لولائی لَمْ اَکُنْ لَوْ لاک

(خواجہ نصیر)

ترجمہ: اے اللہ تیرا ظہور مجھ سے ہے اور میرا وجود تجھ سے ہے۔ پس تو ظاہر نہیں ہوتا جب تک میں نہ ہوں اور میں موجود نہیں ہوتا اگر تُو نہ ہو۔

ہم ایک طویل اور غیر مختتم بحث میں پڑ گئے ہیں۔ ہم پھر اپنے اصلی موضوع کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

غرض خواب کے اندر بعض اشخاص کو بڑے بڑے علوم اور معارف حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ بعض اشخاص کو خواب کے اندر قرآن کی لمبی سورت یاد کرائی گئی اور جب وہ صبح کو اٹھے ہیں تو انہیں وہ سورت ہمیشہ کے لیے یاد رہ گئی۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ بعض سعادت مند اشخاص کو خواب میں سارا قرآن ایک رات کے اندر حفظ کرایا گیا ہے اور جب صبح کو اٹھے ہیں تو ہمیشہ کے لیے قرآن کے حافظ بنے رہے ہیں۔ بعض لوگوں کی نسبت بروایت صحیح سنا گیا ہے کہ رات کو سوتے وقت عجمی تھے اور انہیں خواب کے اندر عربی زبان بولنے کا ملکہ عطا کیا گیا۔ جب وہ صبح کو اٹھے تو فصیح عربی زبان بولنے والے پائے گئے اور ہمیشہ عربی زبان بولتے رہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے: اَمْسَیْتُ عَجَمِیًّا وَ اَصْبَحْتُ عَرَبِیًّا۔ یعنی میں سوتے وقت عربی زبان سے بے بہرہ محض عجمی تھا لیکن صبح کو اٹھا تو عربی بنا ہوا تھا۔ بعض لوگ جاہل سوئے اور عالم ہو کر اٹھے۔ کئی دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کے خواب میں چوٹ لگی ہے اور بیداری میں اس کا اثر اس کے وجود پر نمایاں طور پر پایا گیا۔ چنانچہ ایک شخص کو اس راقم الحروف نے دیکھا کہ رات کو خواب میں کسی نے اس کی ٹانگ پر چوٹ لگائی۔ صبح کو وہ ٹانگ سے لنگڑا ہو گیا۔

راقم الحروف کا اپنا واقعہ ہے کہ جب میری عمر تقریباً ۳۵ سال کی ہو گی اور جب کہ ماہِ رمضان شریف جون جولائی کے گرم مہینوں میں پڑتا تھا میری طبیعت ناساز ہو گئی اور روزہ رکھنے کے لیے پاس کے مغربی پہاڑ کے ایک سرد مقام پر چند احباب کے ہمراہ چلا گیا۔ مگر وہاں بسبب چند وجوہات کے رہنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ مجبوراً رمضان کی پہلی تاریخ سے ایک

دو روز پہلے گھر کو روانہ ہوا۔ ہمارے شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں رات آ پڑی۔ اتفاقاً شام کو رمضان کا چاند نظر آ گیا۔ طبیعت گو نا ساز تھی لیکن صبح روزہ بھی تھا اور پیدل کافی سفر بھی۔ رات کو شش و پنج میں تھا کہ روزے کی نیت کی جائے یا نہ۔ آخر دل مضبوط کر کے روزے کی نیت کر ہی لی اور صبح کو گھر پیدل روانہ ہو گیا۔ راستے میں شدت کی پیاس لگی کہ دل بیٹھا جاتا تھا اور منہ میں لعاب خشک ہو گیا۔ گھر پہنچ کر غسل کیا اور پیاس بجھانے کے بہتیرے بیرونی جتن کیے لیکن کسی طرح پیاس کا غلبہ کم نہ ہوا۔ دوپہر کو چارپائی پر لیٹ کر سونے کی بہتیری کوشش کی لیکن بسبب شدت پیاس نیند نہیں آتی تھی۔ آخر تھوڑی سی آنکھ جو لگی تو کیا دیکھتا ہوں کہ خواب میں بھی اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانی تلاش کر رہا ہوں۔ اتنے میں اسی خواب کے اندر کسی شخص نے شربت کا ایک گلاس پیش کیا جسے میں پی گیا۔ جب آنکھ کھلی تو پیاس کا نام و نشان نہ تھا گویا بیداری میں پی گیا ہوں۔ حتیٰ کہ شام کے وقت بھی پیاس نہیں تھی۔

اس فقیرؒ کے ابتدائی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ جب ابتدائے حال میں اس فقیرؒ نے کالج چھوڑ کر فقر اختیار کیا تو ان دنوں اپنے روحانی مربی حضرت سلطان باہو صاحبؒ کے دربار پر مقیم تھا۔ مجھے رات کو سانپ نے پیر پر کاٹ کھایا۔ سانپ کو تو میرے ساتھ کے ایک درویش نے اسی وقت مار ڈالا۔ اس واقعہ کو سن کر دربار شریف کے چند درویش اظہار ہمدردی کے لیے میرے پاس آئے۔ ان میں بعض مجھ سے سانپ کے زہر چڑھ جانے کی یوں علامات دریافت کرتے رہے کہ آیا تمہارا گلا تو نہیں گھٹتا یا غنودگی تو طاری نہیں ہو رہی وغیرہ وغیرہ۔ اس سے قبل گو میں بالکل مطمئن اور بے فکر تھا لیکن ان کی اس قسم کی باتوں سے مجھے تشویش لاحق ہو گئی۔ اس وقت لیٹے ہوئے میری تھوڑی سی آنکھ لگ گئی تو میں کیا دیکھتا ہوں خواب کے اندر میرے منہ، ناک اور کانوں سے خون جاری ہے اور گھبراہٹ کی وجہ سے میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اتنے میں ایک شخص میری طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ قریب آ کر اس نے مجھے ایک گلاس دوا کا پینے کو دیا۔ اسے پیتے ہی لہو بند ہو گیا اور دل ساکن اور مطمئن ہو گیا۔ میری آنکھ کھلی۔ پاس بیٹھنے والوں کو کہا کہ آپ چلے جائیں مجھے خیریت ہے۔ چنانچہ بالکل خیریت اور عافیت سے رات کٹی اور سانپ کے زہر کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ واقعہ دربار شریف

کے درویشوں کو ابھی تک یاد ہوگا۔

اسی طرح اس فقیرؔ کا ایک اور واقعہ ہے کہ اک دفعہ میں بیمار ہوگیا اور میرے کان سے سفید بدبودار پیپ بہنے لگی۔ جب میرے کان کا سوراخ اس پیپ سے بھر جاتا تھا تو میں اپنی انگلی سے اسے نکال لیتا تھا۔ چنانچہ چند روز یہ معاملہ رہا۔ اس کے بعد شاید اس پیپ کے بہنے کی وجہ سے یا میری انگلی کی بار بار رگڑ سے کان کے اندر سوراخ کے قریب ایک چھوٹی رسولی سی بن گئی۔ کان سے پیپ بہنی تو بند ہوگئی مگر اس پھوڑے کی یہ حالت ہوگئی کہ ایک کپی سی بن گئی۔ اس میں ایک باریک سوراخ تھا جب میں اس کو انگلی سے دبا لیتا تھا تو اس کی پیپ نکل جاتی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر اس میں پیپ جمع ہو جایا کرتی تھی۔ میں اسے روزانہ چند بار دبا کر خالی کر لیا کرتا تھا لیکن اس کی پیپ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ اس میں سخت جلن اور درد تھا اور میں اس سے نہایت بے چین اور بے آرام تھا۔ وہ کسی طرح علاج پذیر نہ ہوتا تھا۔ اس کے اندر مرہم وغیرہ نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے میرا بہت برا حال کر دیا تھا۔ رات کو اس کی سوزش سے مجھے نیند نہ آتی تھی۔ چنانچہ میں نے تنگ آ کر باطنی علاج کی طرف رجوع کیا اور ایک روحانی اہلِ قبر سے استعانت طلب کی۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے: اِذَا تَحَیَّرْتُمْ فِی الْاُمُوْرِ فَاسْتَعِیْنُوْا مِنْ اَھْلِ الْقُبُوْرِ۔ یعنی ”جب تم کسی معاملے میں حیران ہو جاؤ تو اہلِ قبور سے استعانت اور امداد طلب کرو۔“ چنانچہ میں رات کو ایک بزرگ کی قبر پر گیا اور اس جگہ دعوتِ قرآن مجید پڑھی۔ دعوت کا علم ایک نہایت نادر الوجود اور عزیز القدر علم ہے۔ جس کا بیان انشاء اللہ اسی کتاب میں آگے کسی موقع پر کیا جاوے گا۔ میں دعوتِ قرآن پڑھ کر سویا۔ خواب میں مَیں نے دیکھا کہ اسی جگہ زمین کے اندر ایک نہایت عالی شان ہسپتال ہے اور اس میں ایک خوبصورت خوش لباس ڈاکٹر کھڑا لوگوں کو دوائیاں دے رہا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اپنا کان دکھا کر عرض کی کہ میرے کان میں یہ پھوڑا ہے۔ اس کا معالجہ فرما دیجیے۔ وہ یہ سن کر آتشی شیشی کی مانند ایک براق سفید لمبی گردن والی شیشی ایک الماری سے نکال لایا اور مجھ سے فرمایا کہ اپنا کان سامنے کرو۔ میں نے کان سامنے کیا۔ آنکھ کے گوشے سے مجھے اپنا کان ایسا نظر آیا گویا اسے آگ لگی ہوئی ہے اور چراغ کی لَو کی طرح ایک سرخ شعلہ اس سے نکل رہا ہے اور میرا کان گویا جل رہا ہے۔ غرض اس روحانی ڈاکٹر

نے اس شیشی سے کچھ سفید عرق میرے کان پر چھڑکنا شروع کیا۔ اس کے کان پر پڑنے سے آگ بجھنے کی چس چس کی سی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ آخر وہ بجھ گئی اور میرا کان برف کی مانند ٹھنڈا ہو گیا اور اسی وقت میں خواب سے جاگ اٹھا۔ آپ یقین جانیں کہ میں نے اسی وقت اپنا کان ٹٹولا تو نہ پھوڑا تھا اور نہ درد بلکہ ڈھونڈنے سے بھی پتہ نہ لگتا تھا کہ پھوڑا کس جگہ تھا۔ یہاں پر اس فقیرؒ نے اپنے چند ایک واقعات بطور مشتے نمونہ از خروارے محض ناظرین کے اطمینانِ قلب، تسکینِ خاطر اور ازدیادِ یقین کے لیے بیان کر دیئے ہیں۔ اللہ شاہدِ حال ہے کہ اس میں خود نمائی اور خود فروشی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ کیوں کہ فقیر اور درویشوں کے لیے یہ بہت معمولی باتیں ہیں۔ اس سے بڑی باتیں چونکہ عوام کی سمجھ سے باہر اور ان کے درجۂ یقین سے بالاتر ہیں اور خوفِ طوالت اور اندیشۂ خودستائی بھی دامن گیر ہے اس لیے ایک دو واقعات پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ روحانی دنیا میں ایسے عجیب واقعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔

من از فریب[1] عمارت گدا شدم ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتاد است

ترجمہ: میں صرف (ظاہری) فریب مکان کے طور پر بھکاری بن گیا ہوں۔ ورنہ دل کے ویرانے میں ہزاروں خزانے پڑے ہیں۔

جو لوگ خواب کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں اور اسے بدہضمی اور محض عادی خیالات کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ نہایت نادان ہیں۔ خواب کی اہمیت اور وقعت سے صرف ایسے مردہ دل نفسانی لوگ بے خبر اور غافل ہیں جن کے دل پتھر کی طرح بے حس اور مردہ ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے عمر بھر کوئی سچا خواب نہیں دیکھا۔ بھلا وہ خواب کی حقیقت کیا جانیں۔ اہلِ سلف علماء عاملین نے اپنے شاگردوں کو خواب میں ایک رات کے اندر بڑے بڑے عجیب و

---

[1] فریب عمارت سے مراد یہ ہے کہ پہلے زمانے میں جب کوئی خزانہ دفن کیا جاتا تھا تو اس پر ایک ویران عمارت بنا دی جاتی تھی تا کہ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہاں خزانہ مدفون ہے اور لوگ یہ سمجھیں کہ یہ تو ایک ویران عمارت ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ بھی ہے کہ میں نے ظاہری صورت اسی لیے بھکاریوں جیسی بنائی ہے تا کہ لوگ میرے باطنی خزانے سے آگاہ نہ ہو سکیں ورنہ دل کے ویرانے میں ہزاروں باطنی خزانے موجود ہیں۔

غریب علوم سکھائے ہیں۔ یہ علوم بلاواسطہ سینہ بسینہ ایک دم میں منتقل کیے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر کسی طور پر سکھائے جاتے تو ان کی تحصیل میں سالہا سال صرف ہوتے۔ اسی طرح اولیاء کاملین نے موت کے بعد قبروں سے اپنے طالبوں اور مریدوں کو ایک ہی نگاہ اور توجہ سے سلوک کی کٹھن منازل اور باطنی مقامات طے کرائے ہیں کہ اگر انہیں بیان کیا جائے تو عقل باور نہیں کرے گی۔ بلکہ فقراء اپنی زندگی میں بعض مصلحتوں کی بنا پر روحانی طاقت کا چنداں مظاہرہ نہیں کرتے لیکن موت کے بعد ان کی روحانی طاقت پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ روحانی اور باطنی دنیا میں آزادانہ طور پر اپنی قوتوں کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔ عوام کالانعام اور اولیاء کرام کے خوابوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نفسانی مردہ دل لوگوں کے خواب بے حقیقت، ہیچ، خالی، بے مغز، ناکارہ اور فضول ہوتے ہیں لیکن خدا کے خاص بندوں کے خواب ٹھوس حقیقت کے حامل، بہت بھاری، وزنی، سنگین، نور باطن سے منور اور ہر دو خالق اور مخلوق کے آگے مقبول اور معقول ہوتے ہیں۔ اس میں شیطانی شرارت کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور نہ اس میں نفسانی خطرات کا دخل ہوتا ہے۔ کامل مرد کا خواب تو ایسے ٹھوس حقائق کا انبار ہوتا ہے کہ جس کے مقابلے میں نفسانی مردہ دل لوگوں کی ساری عمر بے معنی اور بیہودہ بیداریاں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ اس لیے خاصانِ حق کے خوابوں کو اپنے اوپر ہرگز قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

چراغ مردہ کجا زندہ آفتاب کجا
ببیں تفاوتِ راہ از کجا ست تا بکجا

(حافظؔ)

حضرت پیر سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرّہ العزیز اپنے آغاز وعظ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مجھے خواب میں ایک دفعہ اپنے جدِّ اعظم یعنی حضرت نبی اکرم ﷺ ملے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”بیٹا! وعظ کیا کر۔“ میں نے عرض کی ”حضور! میں ایک عجمی شخص ہوں۔ عراق عرب کے فصحاء اور بلغاء کے سامنے کیوں کر زبان کھولوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا ”منہ کھول۔“ منہ کھولا تو آپ ﷺ نے سات دفعہ میرے منہ میں پھونک مار کر دم کر دیا۔ اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ملے۔ آپ کرم نے بھی یہی فرمایا کہ ”بیٹا! وعظ کیوں

نہیں کرتا؟'' میں نے وہی عرض کی۔ تو آپؒ نے بھی منہ کھولنے کا حکم دے کر اس میں چھ مرتبہ پھونک دیا۔ اس پر میں نے عرض کی کہ ''جناب کرم حضرت رسالت مآب صلعم نے تو سات مرتبہ دم کیا تھا۔ آپؒ نے چھ مرتبہ پر کیوں اکتفا فرمایا۔'' تو آپؒ نے فرمایا کہ ''حضور ﷺ کے پاسِ ادب کی خاطر ایک عدد گھٹا دیا۔'' حضرت محبوبِ سبحانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میرے قلزمِ قلب میں توحید اور معرفت کے بے پناہ طوفان اٹھنے لگے اور طبیعت کی روانی گویا ایک اُمڈا ہوا دریا تھا جو حقائق اور معارف کے موتی ساحلِ زبان پر لا کر حاضرین پر نثار کرتی تھی۔ آپؒ کا وعظ فتوحاتِ ربانی و الہاماتِ یزدانی کا ایک بحرِ بے کراں یا نور کا بادل ہوا کرتا تھا جس وقت یہ خدائی بحر جوش میں اور ربانی ابر خروش میں آتا تھا تو سامعین کی جن میں اطرافِ عرب و عجم کے بڑے علما و فضلا شامل ہوتے تھے اور جن کی تعداد تقریباً ستر ہزار تک پہنچ جایا کرتی تھی، عجیب حالت ہو جایا کرتی تھی۔ بعض پر وجد کی حالت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ بعض مضطرب اور بے اختیار ہو کر چیخیں مارنے اور کپڑے پھاڑنے لگ جایا کرتے تھے۔ بعض بالکل بے خود اور بے ہوش ہو جاتے تھے۔ بعض عاشقانِ لا اُبالی تجلیاتِ انوارِ ذات ذوالجلال کی تاب نہ لا کر قومِ موسیٰ کی طرح جاں بحق ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپؒ کے صاحبزادے شیخ ابو عبداللہ کی روایت ہے کہ آپؒ کی مجلسِ وعظ میں دو چار آدمی ضرور مر جایا کرتے تھے۔ بعض صاحب استعداد سامعین پر جب آپؒ کی برقِ توجہ کی تجلی پڑتی تو مجلس میں سے آسمان کی طرف پرواز کر جاتے۔ بعض کے سینے معارف و اسرار سے کھل جاتے۔ عین کرسی وعظ پر آپؒ کے وجودِ باجود سے بے شمار کشف و کرامات بے اختیار صادر ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تمام سامعین کے قلوب آپؒ کی انگلیوں میں ہیں اور ان میں جس طرح چاہیں تصرف کر رہے ہیں۔ کبھی ان کے خواطر پر آگاہی پا کر ان سے خطاب فرماتے۔ بعض کو خلعتِ ولایت پہناتے۔ غرض آپؒ کا وعظ ظاہری اور باطنی جود اور کرم کا ایک بحرِ ناپیدا کنار تھا۔ جس سے ہر شخص حسب وسعتِ ظرف بھرپور اور سرشار ہو کر جاتا تھا۔ ہزار ہا کافر یہود و نصاریٰ اور مجوس آپؒ کی مجلسِ وعظ میں مشرف با اسلام ہو جایا کرتے اور بے شمار فاسق و فاجر، چور، ڈاکو تائب ہو کر اہلِ رشد و ہدایت بن جاتے۔ آپؒ کے وعظ میں جن، ملائکہ، ارواحِ رجال الغیب بلکہ انبیا اور مرسلین کی ارواح تک حاضر ہوتے اور کئی دفعہ

حضرت رسالت مآب ﷺ بہ نفسِ نفیس تشریف لائے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپؒ اثنائے وعظ میں کرسیٔ وعظ سے اتر آئے اور ہاتھ باندھ کر دیر تک سر جھکائے رہے اور آپؒ کے ہمراہ بہت سے صاحبِ حال اہلِ کمال فقراء اسی ہیئت میں کھڑے رہے۔ وعظ کے خاتمہ پر آپؒ سے عرض کی گئی کہ جناب! آج کیا بات تھی؟ تو آپؒ نے فرمایا کہ حضور انور ہمارے جدِ اکبر حضرت سرورِ عالم ﷺ مجلسِ وعظ میں تشریف لائے تھے۔ فرمایا: ''بیٹا! تیرا وعظ سننے آیا ہوں۔'' میں نے کرسیٔ وعظ سے اتر کر عرض کی: ''حضور ﷺ! غلام کی کیا مجال ہے کہ آں ذات مجمع جملہ کمالات کے سامنے لب کشائی کروں۔'' چنانچہ حضور ﷺ واپس تشریف لے گئے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی جن، کوئی فرشتہ، کوئی ولی اور کوئی نبی نہیں ہے جو میری مجلسِ وعظ میں نہ آیا ہو۔ زندہ ظاہری جثوں سے اور روحانی باطنی جثوں سے میرے وعظ میں حاضر ہوئے ہیں۔ گاہے گاہے آپؒ کے وعظ میں خضر علیہ السلام تشریف لاتے تو آپؒ ان سے یوں تخاطب فرماتے: یَا اِسْرَائِیْلِیُّ قِفْ اِسْمَعْ کَلَامَ مُحَمَّدِیِّ صلعم۔ یعنی ''اے اسرائیلی پیغمبر ٹھہر محمدی ﷺ کا کلام سن۔'' المختصر آپؒ کا وعظ کیا تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشموں کا ایک غیر مختتم اور لازوال سلسلہ تھا جو آپؒ کے وجودِ مسعود سے ظہور پذیر ہوتا تھا۔

اس موقع پر یہ فقیرؒ اپنا ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ اثنائے سلوک میں مجھے چند روز علمِ جفر سیکھنے کا خیال پیدا ہوگیا۔ ان دنوں میں اپنے روحانی مربی حضرت سلطان العارفین حضرت سلطان باہو صاحبؒ کے مزارِ پر انوار پر مقیم تھا۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرتؒ کی خانقاہِ مقدس پر لمبی شیروانی پہنے ہندوستانی وضع کے ایک لمبے قد والے بزرگ تشریف لائے ہیں اور لوگ ان کی طرف انگلیوں سے اشارہ کرتے ہیں کہ یہ شخص آج دنیا میں سب سے بڑے جفار یعنی علمِ جفر کے ماہر ہیں۔ چنانچہ وہ بزرگ میرے پاس آئے۔ جب میں ان کو سلام کر کے ملا تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کا ارادہ علمِ جفر سیکھنے کا ہے؟ میں نے کہا: ''بے شک میرا خیال تو ہے کہ میں علم جفر سیکھ جاؤں۔'' اس بزرگ نے کہا کہ ''آؤ تا کہ میں سارا علم جفر آپ کو سکھا دوں۔'' چنانچہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر حضرت سلطان العارفینؒ کے مزار اور مسجد کے سامنے بڑے چبوترے پر لے گیا۔ جہاں

ایک بڑی الماری کھڑی تھی۔ وہاں اس بزرگ نے جب الماری کا دروازہ کھولا تو اس میں ایک بڑی لوح یعنی ایک عجیب وغریب منقش تختہ نمودار ہوا جس میں رنگ برنگ کے جلی قلم سے خوشخط ابجد کے حروف مرقوم تھے اور نیز اس میں اپنے اپنے مناسب موقعوں پر بارہ ۱۲ بروج اور سات ستاروں کے نام لکھے ہوئے تھے اور ان کے اوپر مدہم یا ستار کی طرح آر پار تاریں لگی ہوئی تھیں۔ غرض قدرت کا ایک نہایت خوشنما نقشہ تھا جو اس الماری میں جگمگا رہا تھا۔ اس بزرگ کے ہاتھ میں ایک پوائنٹر یعنی لکڑی تھی جس سے انہوں نے اس تختے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "یہ وہ لوحِ قدرت ہے جس میں تمام علمِ جفر مندرج ہے۔ اب دیکھو میں تمہیں اس سے ایک عمل کر کے دکھادوں۔ بعدہٗ تجھے یہ سارا علم سکھادوں گا۔" اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک آٹھ دس سال کا لڑکا سامنے کھڑا تھا۔ انہوں نے فرمایا: "دیکھو علم جفر کے ذریعے یہ لڑکا میں گم کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہاتھ کی لکڑی اس لوح کے تار پر جہاں عطارد کا لفظ (مجھے یاد ہے) مرقوم تھا، دے ماری جس سے ایک عجیب آواز نکلی اور میں نے دیکھا کہ وہ لڑکا غائب ہوگیا۔ تب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے کہ "آؤ میں آپ کو سارا علمِ جفر القا کردوں۔" چنانچہ وہ مجھے چبوترے کی مشرق کی طرف جہاں اب تالاب بنا ہوا ہے، لے گئے۔ اس وقت انہوں نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرا ہاتھ اپنی داڑھی پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور مجھے توجہ دینے لگے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضرت سلطان العارفینؒ اپنے مزارِ مقدس سے گھوڑے پر سوار نورانی چہرے اور لال داڑھی کے ساتھ نمودار ہوئے۔ حضورؒ نے مجھے اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے بلایا! ایسا معلوم ہوا کہ میں پرندے کی طرح اڑ کر حضورؒ کے پاس چلا گیا۔ آں حضرتؒ نے گھوڑے سے اتر کر اس عاجز کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ "بیٹا! علم جفر حساب کتاب اور بکھیڑوں کا کام ہے۔ آتا کہ میں تمہیں ایک جامع اور بہترین علم سکھادوں۔" میں نے عرض کی کہ "کمال ذرہ نوازی ہوگی۔" اس وقت حضورؒ نے فرمایا کہ "دیکھ وہ لڑکا جو علمِ جفر کے ذریعے گم اور غائب ہوگیا میں ایک نظر سے پیدا کرتا ہوں۔" اس وقت میں نے آں حضرتؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف نگاہ کی تو آپؒ کی آنکھوں کے اوپر یعنی دونوں ابرو کے برابر حرف کٓ اور حرف نٓ نوری آفتابی رنگ سے مرقوم دو ستاروں کی طرح چمک دمک دکھا رہے تھے۔ جس وقت آں حضرتؒ ۔ نے

اس زمین کی طرف جہاں وہ لڑکا غائب ہوا تھا، نگاہ ڈالی تو آپؒ کی آنکھوں سے ایک شعلہ نکلا اور اس زمین پر نوری حروف سے مرقوم لفظ کُــن نظر آیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ اس زمین میں حرکت آ گئی اور اس پر سے پے در پے پردے اٹھ رہے ہیں اور ایک دم وہ لڑکا نمودار ہوگیا۔ آں حضرتؒ نے فرمایا کہ ''کیا یہ علمِ جفر سے بہتر نہیں ہے؟'' میں نے عرض کی کہ ''جناب یہ تو اعلیٰ ترین علم ہے۔'' اس کے بعد حضورؒ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے۔ ''آ میں تمہیں یہ علم بھی عطا کردوں۔'' چنانچہ حضورؒ اس عاجز کا ہاتھ پکڑ کر خانقاہ کے اندر لے گئے۔ اس وقت میں بے ہوش ہوگیا۔ بعدہٗ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اس حجرے کے اندر لیٹا ہوا پایا جہاں میں سویا پڑا تھا۔ اس وقت مجھے اپنا چہرہ نظر آیا اور مجھے اپنی آنکھوں کے اوپر اور ابرو کے برابر بعینہٖ آں حضرت قدس سرہٗ کی طرح حرف کؔ اور حرف نؔ نوری آفتابی رنگ سے مرقوم نظر آئے۔ اس وقت مجھے اپنے چند ضروری اور مشکل کام یاد آ گئے۔ چنانچہ میں جس کام کی طرف خیال کرتا تھا اس کام کے ہونے والے محل اور مقام پر لفظ کُــن مرقوم نظر آتا تھا اور وہ کام اللہ تعالیٰ کے فضل اور اپنے مربی کی نظرِ عنایت سے حل ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ اور بعدہٗ وہ سب کام اپنے اپنے وقت پر نہایت آسانی سے باحسن وجوہ سرانجام پائے۔

اے[1] لقائے تو جوابِ ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(رومیؒ)

اللہ تعالیٰ کا ہزار بار شکر ہے اور اپنے فیاض اور جواد اور ماں باپ سے زیادہ مہربان مربی کے بے شمار احسانات ہیں، جن کی ادائیگی شکر و امتنان سے زبان قاصر ہے۔

گر[2] برتنِ من زباں شود ہر موئے
یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد

(خاقانیؒ)

---

[1] اے پیر روشن ضمیر! تیری زیارت ہر سوال کا جواب ہے۔ کہے سنے بغیر تیری برکت سے مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔
[2] اگر میرے جسم کا رواں رواں زبان بن جائے تو تیرے ہزاروں شکروں میں سے (جو مجھ پر واجب ہیں) ایک کا حق بھی ادا نہیں کر سکتا۔

ایک اور واقعہ سن لیجیے کہ ایک دفعہ خواب میں راقم الحروف نے دیکھا کہ ایک بڑی مٹی کی مسجد ہے۔ جس میں حضرت سرورِ کائنات ﷺ امامت فرمارہے ہیں اور یہ عاجز مع چند انبیا واصحابِ کبار حضور ﷺ کے پیچھے مقتدی بن کر نماز ادا کررہے ہیں اور اس نماز میں ایسی لذت آرہی ہے کہ ہم وجد اور سرور سے درخت کی ٹہنیوں کی طرح کھڑے جھوم رہے ہیں۔ جب آں حضرت ﷺ نماز پڑھ چکے تو آپ ﷺ نے ہماری آج کل کی رسم کے خلاف دائیں اور بائیں پھر کر نہیں بلکہ اسی طرح بدستور قبلہ کی طرف رخ کیے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جب آں حضرت ﷺ دعا سے فارغ ہوئے تو راقم الحروف نے اٹھ کر عرض کی کہ حضور ﷺ اس جماعت میں چند انبیا اور اصحابِ کبار موجود ہیں۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس عاجز کے لیے دعا فرماویں کہ تمام انبیا کی زیارت اور ملاقات کا شرف اس عاجز کو نصیب ہوجائے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے دوبارہ اپنے دستِ مبارک کھڑے کیے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مسجد کے باہر والے چبوترے پر قبلہ رخ کھڑا ہوں اور دائیں طرف سے تمام انبیا ایک قطار بن کر میری طرف آرہے ہیں اور اس ناچیز سے مصافحہ کرکے گذر رہے ہیں۔ چنانچہ ہر نبی کو آں حضرت ﷺ کے طفیل قدرت کی الگ الگ شان اور آن، اپنی اپنی صفت کے علیحدہ رنگ ڈھنگ اور حسنِ اعمال و افعال کی جدا جدا چال اور حال میں دیکھا۔

ترا نوالہ[1] دمادم زخوانِ یُطْعِمُنِیْ ترا پیالہ مدام از شرابِ یَسْقِیْنِیْ

مرا تو قبلۂ دینی ازاں سبب گفتم برد ماں کہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِیْ

(عبدالقادر بیدل)

خواب کے علاوہ قلبی اثرات اور دل کی آگاہی کے اور بھی راستے اور طریقے ہیں جن سے انسان کبھی کبھی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ انسان کے وجود میں دل کے اندر ایک لطیف روزن ہے جس سے انسان کبھی کبھی عالمِ غیب اور عالمِ امر کے لطیف جہان کی طرف جھانک سکتا ہے۔ جو ظاہری حواس سے معلوم اور محسوس نہیں ہوتا۔ اس قسم کے قلبی واردات اور باطنی

---

[1] تجھے ہر وقت خوانِ ایزدی سے رزق مل رہا ہے اور تو چشمۂ وحدت سے ہمیشہ سیراب ہورہا ہے۔ تو میرے لیے دینی قبلہ گاہ ہے۔ اسی لیے میں نے لوگوں سے یہ کہہ دیا ہے کہ میرے لیے میرا دین اور تمہارے لیے تمہارا دین۔

اورا کات انسان کو زندگی میں گاہے گاہے پیش آجایا کرتے ہیں لیکن بسبب کثرت مادی مشاغل معلوم نہیں کرتا۔ چنانچہ بعض دفعہ انسان اپنے اندر ایک بے وجہ گھبراہٹ یا بلا سبب رنج یا اداسی محسوس کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز بعد کوئی ہولناک اور رنجیدہ واقعہ پیش آجاتا ہے۔ واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے جس قدر دل کی گھبراہٹ زیادہ سخت یا دیرپا ہوتی ہے اسی قدر پیش آنے والا واقعہ صعب، سخت اور طویل ہوتا ہے اور گاہے اس کے برعکس دل میں بے وجہ خوشی اور خرمی پیدا ہوتی ہے اور چند روز کے بعد کوئی خوشگوار اور فرحت بخش واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔ جس قدر کسی کے باطنی حواس تیز اور قوی ہوتے ہیں اسی قدر انسان کو ان باتوں کا احساس جلدی، صاف اور واضح تر ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو ان باتوں کا احساس دل میں نہیں ہوتا تو ان کے ظاہری جسم پر آنے والے واقعات کا یوں اثر ہوتا ہے کہ بعض دفعہ انسان کی بائیں یا دائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ بعض دفعہ جسم کا کائی حصہ پھڑکنے لگتا ہے۔ گاہے ہاتھوں سے چیزیں گرتی ہیں۔ کبھی کسی چیز سے ٹکریں لگتی ہیں اور کسی وقت بے وجہ غصہ آتا ہے اور گاہے نیند نہیں آتی۔ گاہے گھر کے بچے بے وجہ سوتے میں اٹھ اٹھ کر چلاتے ہیں اور گاہے گھر کے کتے بے وجہ بھونکتے ہیں اور عجیب آوازیں نکالتے ہیں۔ غرض اس قسم کی باتیں بھی گاہے آئندہ برے اور رنجیدہ واقعات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ گاہے گھر یا مکان میں کوئی خوشی آنے والی ہوتی ہے تو اس گھر یا مکان کا منظر اور سماں پہلے کی نسبت بہت خوب صورت بن جاتا ہے اور در و دیوار سے ایک باطنی لطف اور جمال ٹپکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ مکان خوشی سے اِترا رہا ہے اور رقص کر رہا ہے۔ لیکن یہ چیز بہت باریک بین آنکھ محسوس کرتی ہے اور گاہے اس کے برعکس جس گھر میں کوئی صعب اور سخت واقعہ رونما ہونے والا ہوتا ہے تو اس گھر کا منظر پہلے کی نسبت بگڑا ہوا اور ویران سا معلوم ہوتا ہے۔ در و دیوار سے مایوسی اور اداسی ٹپکتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شہر یا ملک پر کوئی عالمگیر آفت یا مصیبت آنے والی ہوتی ہے تو سارے شہر اور ملک کی یہی حالت ایک خاص وقت کے لیے ہو جاتی ہے اور اگر کسی شخص کو کوئی خوشی یا رنج کا واقعہ پیش آنے والا ہوتا ہے تو باطن میں آدمی اس واقعہ کا عکس اس کے چہرے اور جسم پر اس طرح معلوم اور محسوس کرتا ہے جس طرح پردۂ فلم پر کسی واقعہ کو دکھایا جاتا ہے۔ لیکن عوام اس کا چہرہ اترا ہوا، پھیکا اور بے رونق معلوم کر سکتے ہیں۔

جب کوئی نیا مکان تعمیر ہوتا ہے یا کوئی قبر تیار ہوتی ہے تو اس میں بھی آئندہ خوشی یا رنج کے آنے والے واقعات کے آثار معلوم ہوتے ہیں یا کوئی شادی رچنے والی ہوتی ہے یا کسی معاملے کی رسم یا تقریب منائی جاتی ہے یا کسی بادشاہ کی تاجپوشی ہوتی ہے تو ان میں بھی سعادت اور نحوست کے آثار نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی کام میں مصروف اور منہمک ہوتا ہے یا کسی غیر فکر اور خیال میں مگن ہوتا ہے کہ اچانک وہم معترضہ کے طور پر اس کے دل میں اپنے دوست آشنا یا کسی رشتہ دار کا خیال بے واسطہ گذر جاتا ہے اور یہ خیال اگلے سلسلۂ خیال کو بیچ میں سے توڑ کر آتا ہے۔ بعدۂ وہی دوست آشنا یا رشتہ دار کہیں سے آنکلتا ہے یا اس کا کوئی خط یا پیغام آ جاتا ہے۔ اگر کسی کے حواسِ باطنی ذرا زیادہ تیز اور قوی ہوتے ہیں تو اس کی یادداشت کے ساتھ ایک باطنی آواز بھی سنائی دیتی ہے کہ فلاں شخص آ رہا ہے یا بلا رہا ہے اور کبھی اس کی شکل بھی سامنے دکھائی دیتی ہے اور گاہے ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص انسان کو کوئی بات کہنے والا ہوتا ہے اور ابھی تک وہ بات کہنے نہیں پاتا کہ سننے والا اگر باطنی طور پر قدرے حساس ہوتا ہے تو اس کے دل کی بات کا عکس اپنے دل میں معلوم کر لیتا ہے کہ یہ شخص مجھے فلاں بات کہنے والا ہے۔ انگریزی میں اس علم کو ٹیلی پیتھی (TELEPATHY) کہتے ہیں۔ یورپین اقوام میں بھی اس علم کا مطالعہ شروع ہے۔ گو ابھی تک انہیں اس علم میں چنداں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور نہ وہ خیالات کو صحیح طور پر معلوم کر سکتے ہیں لیکن جس طرح ریڈیو کے ذریعے ہزاروں کوس سے گانے بجانے اور تقریریں سننے میں آتی ہیں اور طاقت، آواز اور روشنی وغیرہ بذریعہ بجلی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے اسی طرح دل کی باتیں اور خیالات بھی حساس اور زندہ دل والوں کو معلوم اور محسوس ہو جاتے ہیں۔ اب ایک شخص نے ایک قسم کا آلہ حال ہی میں ایجاد کیا ہے، جس میں خیالات کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی جو شخص اسے دل پر لگاتا ہے تو مختلف قسم کی لکیریں اس میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس بات کے تجربے کیے جا رہے ہیں۔ سینکڑوں کوس کی دوری پر مختلف مقامات پر وقتِ مقررہ پر چند آدمیوں نے خیالات کی لہروں کو پیدا کیا اور ہر ایک نے دوسری جگہ سے آئی ہوئی لہروں کو حوالۂ تحریر کیا تو ہم جنس خیالات کی لہریں ہم جنس شکل اور نوعیت کی معلوم ہوئیں۔ جنہوں نے ایسے تجربات کیے وہ

ابھی تک خیالات کی صحیح طور پر ترجمانی کرنے اور ان کو ٹھیک طور پر حیطۂ تحریر میں لانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ لیکن انہوں نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ خیالات کی لہریں سینکڑوں ہزاروں میلوں کی دوری پر بجنسہٖ پہنچ جاتی ہیں۔ غرض دل کو دل کی طرف راستہ ہے اور زندہ دل روشن ضمیر لوگوں کے لیے کشف القلوب یعنی خیالات پر آگاہی حاصل کرنا بہت ہی معمولی بات ہے۔ ان کا دل بھی ٹیلی پیتھی کا ایسا زبردست آلہ ہوتا ہے کہ تمام لوگوں کے دل کے خیالات اس میں صاف طور پر معلوم اور محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی زبان پر قدرت کی مہر لگی ہوئی ہوتی ہے اور اپنے آپ کو چھپائے رہتے ہیں۔ خود فروش یا ریاکار دکاندار بننا ہرگز قبول نہیں کرتے۔ عارف سالک کے لیے یہ بات بہت آسان ہے کہ کوئی شخص دور سے اسے یاد کر رہا ہو اور اس وقت وہ اس کے دل کے خیالات گھر بیٹھے معلوم اور محسوس کر لے۔ لیکن یہ بات ذرا مشکل ہے اور بہت کامل عارف کا کام ہے کہ وہ جس شخص کے دل کی طرف جس وقت بھی خواہ کتنی دوری سے متوجہ ہو اس کے دل کے خیالات معلوم کر لے۔ اس سے تعجب ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ علم ہے اور دل کی یہ لہریں ہوا کے ذریعے پہنچتی ہیں۔ اس لیے تو جب بھائی پیراہنِ یوسفؑ لے کر مصر سے کنعان کی طرف روانہ ہوا تو یعقوبؑ نے وقوفِ قلبی سے اس بات کو معلوم کر کے فرمایا کہ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف ۱۲ : ۹۴)۔ کہ مجھے تو یوسفؑ کی بو آ رہی ہے اگر تم میرا مذاق نہ اڑاؤ۔

اور گاہے ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو ایک خاص شخص بے وجہ برا معلوم ہوتا ہے۔ جس سے کبھی اسے کسی قسم کا نقصان بھی نہیں پہنچا ہوتا اور نہ اس کا وہ برا معلوم ہونا اس کی بری شکل و شباہت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ محض بے وجہ اور بے واسطہ اس کے دل کو برا معلوم ہوتا ہے۔ تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس شخص سے کبھی کسی وقت اسے ضرور کوئی گزند یا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اور گاہے اس کے برعکس اگر کوئی شخص بے وجہ اچھا معلوم ہوتا ہو تو اس سے اس کو ضرور جلد یا بدیر کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور یہ سلسلہ کبھی اولاد تک جا پہنچتا ہے یعنی اگر باپ برا معلوم ہوتا ہے تو اگر اسے خود کوئی برائی نہیں پہنچتی اس کی اولاد سے دیکھنے والے کو یا اس کی اولاد کو برائی پہنچتی ہے اور اس کے برعکس اسی طرح نیکی اور بھلائی کو قیاس کر لینا چاہیے۔

دِل را بدل رہیست دریں گنبد سپہر
از کینہ کینہ خیزد و خیزد ز مہر مہر
(فردوسیؔ)

ترجمہ: اس آسمانی گنبد یعنی دنیا میں ایک دل کو دوسرے دل سے راستہ ہے۔ کینہ کینے سے اٹھتا ہے اور دوستی دوستی سے۔ دل کو دل سے عداوت اور دوستی کی بو آتی ہے۔

جس طرح مادی آئینے میں اشیا منعکس ہو کر نظر آتی ہیں اسی طرح دل ایک لطیف معنوی آئینہ ہے۔ تمام لطیف معنوی اشیاء جب اس کے سامنے آجاتی ہیں اگر وہ غبار آلودہ نہیں ہے اور دیکھنے والا صاحب بصیرت ہے تو اس میں صاف طور پر نظر آجاتی ہیں۔ انسانی دل اللہ تعالیٰ کی لوحِ محفوظ کا ایک ماڈل اور نمونہ ہے۔ اس لیے روشن ضمیر شخص کو پیش آنے والے واقعات اس میں نظر آجاتے ہیں۔ انسان کا مادی اور عنصری جسم مکان اور زمان کی قید میں ہے اور وقت اور مکان میں ہر طرف سے گھرا ہوا ہے۔ مگر دل ایک لامکانی لطیفہ ہے جو مکان اور زمان کی قید سے بری ہے۔ اس لیے جب دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے زندہ ہو کر تصفیہ پالیتا ہے اس وقت قُرب اور بعدِ زمانی اور مکانی اس کے لیے یکساں ہو جاتے ہیں اور دور اور نزدیک کی چیز اس کے لیے برابر ہو جاتی ہے اور ماضی و مستقبل اس کے لیے حال کا حکم رکھتے ہیں۔ غرض دل کا باطنی لطیفہ مشرق، مغرب، جنوب، شمال اور تحت وفوق ان سب مکانی شش جہات اور ماضی، حال اور مستقبل کے زمانی اوقات سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کا علم بہت وسیع ہو جاتا ہے اور اس کی نظر بہت دور تک پڑتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ۔ یعنی مومن کی فراست سے ہوشیار رہو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ بعض لوگ خواب میں جن، ملائکہ یا اہلِ قبور رُوحانیوں سے ملاقی ہوتے ہیں۔ بعض انبیا و اولیا، غوث، قطب، شہدا، اصحابِ کبار حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں۔ ہر امتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کم از کم ایک دفعہ تمام عمر میں اپنے آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ پرانور سے مشرف ہو۔ بعض خواص ہر سال، بعض ہر ماہ، بعض ہر جمعرات، بعض عارف اکمل ہر رات، بعض جامع نور الھدیٰ، خدا کے منظور اور مقبول فنافی الرسول پاک ہستیاں ہر وقت

اور ہر آن جس وقت چاہیں آں حضرت ﷺ کے حضور میں پہنچ کر آپ ﷺ کے دیدار سے مشرف اور آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں کو موکلات نماز کے لیے جگاتے ہیں۔ بعض کو کسی خطرے یا نقصان کے وقوع سے موکلات بیدار اور خبردار کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی مکان کو آگ لگتی ہے یا کوئی مکان گرنے لگتا ہے یا مکان کو چور نقب لگاتے ہیں یا کوئی دشمن یا جانور درندہ حملہ کرنے والا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مختلف خطرناک واقعات سے بعض لوگوں کو موکلات آواز دے کر یا دل میں وہم ڈال کر آگاہ کرتے ہیں۔ ہر سچے خواب کی ایک علامت یہ ہے کہ اس خواب کا معاملہ اور اس کا اثر دل پر بہت واضح اور دیرپا ہوتا ہے اور عموماً ایسے سچے خوابوں کے دیکھتے ہی آنکھ کھل جاتی ہے اور طبیعت ہلکی پھلکی ہوتی ہے اور وجود میں کسی قسم کی کسالت اور غفلت نہیں ہوا کرتی بلکہ اس کے بعد دیر تک نیند نہیں آتی۔ بعض دفعہ ایک ہی رات میں کئی بار ایک ہی خواب آتا ہے۔ بعض لوگ ساری عمر کوئی خواب نہیں دیکھتے۔ بعض ساری رات خواب دیکھتے ہیں۔ بعض بہت کم مگر سچے خواب دیکھتے ہیں۔ بعض رات کو بہت پریشان اور ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں۔ بعض خواب دیکھتے ہیں لیکن بسبب نسیان انہیں خواب یاد نہیں رہتے۔ گاہے انسان تاریک مکان میں لحاف اوڑھے ہوئے اور آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا ہوتا ہے لیکن جب وہ اس مکان کی طرف خیال کرتا ہے تو اسے مکان کے اندر کی سب چیزیں نظر آتی ہیں۔ گویا کہ مکان روشن ہے۔ بعض کی یہ نظر وسیع ہوتی رہتی ہے اور بہت دور چلی جاتی ہے۔ بعض کو رات کو لیٹے اور لحاف اوڑھے ہوئے آسمان پر چاند اور ستارے وغیرہ نظر آتے ہیں۔ کبھی انسان بہت قلیل عرصہ میں بہت لمبے خواب دیکھتا ہے اور بظاہر گو ایک منٹ نہیں گذرا ہوتا باطن میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت عرصہ گذر گیا ہے اور گاہے اس کے برعکس ظاہر میں ساری رات گذر جاتی ہے لیکن باطن میں اسے ایک پلک مارنے کا وقت معلوم ہوتا ہے۔

اگر کوئی بیمار شخص اپنے آپ کو یا کوئی کسی دوسرے بیمار شخص کو غسل کرتے دیکھے تو یہ صحت کی علامت ہے۔ اگر کوئی شخص بیمار کے گھر میں قصابوں کو چھریاں لیے یا چھریاں تیز کرتے دیکھے تو بیمار جلدی مرنے والا ہوتا ہے اور مکان کا گرنا موت کی علامت ہے۔ لیکن بعض دفعہ

جب کوئی نمازی رات کے وقت نماز عشاء کو ترک کر کے یا تہجد قضا کر کے سو جائے تو ایسی حالت میں اگر مکان گرتا ہوا دیکھے تو اس سے مراد مکانِ نماز کا انہدام ہوتا ہے۔ یا کسی گھر میں سے کسی شخص کو سفر پر جاتا ہوا دیکھا جائے اور منزلِ مقصود معلوم نہ ہو، یا کسی گھر میں شادی رچی ہوئی اور گانا بجانا خواب میں نظر آئے اور دلہن معلوم نہ ہو تو ایسے گھر میں موت واقع ہوتی ہے۔ اور اگر دلہن موجود اور معلوم ہو تو حصولِ دولت کی علامت ہے۔ اگر کسی گھر میں چیل جھپٹ کر یا بلی حملہ کر کے کسی مرغی کے بچے یا چھوٹے پرندے کو خواب میں اٹھا لے تو ایسے گھر میں کوئی چھوٹا بچہ مر جاتا ہے۔ اگر کوئی مقدمہ درپیش ہو اور کمرۂ عدالت میں یا عدالت کی میز پر کسی باجے یا کسی اور طرح گانے کی عمدہ آواز سنائی دے تو یہ علامت فتح اور کامرانی کی ہے۔ خواب میں سانپ یا بچھو وغیرہ موذی جانوروں کا مارنا دشمنی اور عداوت کے مٹنے پر دلالت کرتا ہے اور اس کا بچ نکلنا دشمنی کے قائم رہ جانے کی علامت ہے۔ خواب میں کتے یا درندے کا حملہ کرنا کسی اہلِ دنیا اور سرکاری اہلکار سے نقصان پہنچنے کی علامت ہے۔ خواب میں اگر کوئی مرا ہوا خویش یا آشنا کوئی چیز دے تو فائدہ اور نفع کی علامت ہے۔ اور اگر مردہ خواب میں کوئی چیز مانگے یا لے لے تو بری علامت ہے۔ خواب میں غلہ از قسم گندم، باجرہ، جوار کا گھر میں آنا یا دیکھنا سختی اور مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔ اور گندگی، بھنا ہوا اور پکا ہوا گوشت اور پکی روٹیاں دیکھنا دولت اور نعمت پر دلالت کرتا ہے۔ خواب میں گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور کشتی پر سوار ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچنا یا بلندی اور بلند مکان پر چڑھنا کسی مہم اور کام میں کامیابی اور سرداری اور بلندیٔ مرتبہ کی نشانی ہے۔ خواب میں آندھی، بجلی کی کڑک، بندوق کی آواز خطرے کا اندیشہ ہے اور آسمان ابر آلود، بارانِ رحمت اور بہتا ہوا صاف پانی بہتری کی علامت ہے۔ سبز اور سفید پوشاک خواب میں اچھے ہیں اور زرد، سرخ اور سیاہ لباس برے ہیں۔ زلزلہ سے ملکی انقلاب مراد ہے۔ موٹے اور خوشنما جانور ملک کی آبادی پر دال ہیں اور دبلے لاغر اس کے برعکس۔ خواب میں کسی پرندے کا پکڑنا کامیابی کی علامت ہے۔ یہ چند مذکورہ بالا خواب کی علامتیں اور تعبیریں اس فقیرؒ نے جلدی میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر لکھ دی ہیں۔ شاید اس سے ناظرین کو اپنی زندگی میں کچھ فائدہ حاصل ہو۔ یہ کتاب چونکہ تعبیر نامہ نہیں ہے، اس لیے ان چند تعبیرات پر اکتفا کی

جاتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ موت کے وقت خوف پر رجا کا غالب آنا یعنی اس وقت دل کا مطمئن ہونا ایمان کی علامت ہے۔ جیسا کہ آیا ہے کہ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ لیکن موت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید کا زیادہ ہونا اور دل کا مطمئن ہونا ایمان کی سلامتی کی نشانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن کی روح موت کے وقت آئندہ عالمِ برزخ میں پیش آنے والی خوشی، راحت اور آرام کو معلوم کر لیتی ہے۔ لیکن خدا کے بعض نیک برگزیدہ بندوں کو بہشت کی خوشخبری بھی مل جاتی ہے اور بعض کو بہشت کا مقام بھی نظر آ جاتا ہے۔ قولہ تعالیٰ: تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥ (حٰمٓ السجدة ۴۱ : ۳۰) یعنی ارواح اور ملائکہ انہیں بشارت دیتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کرو اور خوش رہو کہ اب عنقریب تمہیں وہ بہشت ملنے والی ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا تھا۔ اور برخلاف اس کے کافر، مشرک اور منافق کی روح موت کے وقت اپنے آئندہ آنے والے برزخی عذاب کو معلوم کر لیتی ہے۔ اس لیے اس وقت اس کا پریشان اور مضطرب ہونا یقینی ہے۔

خدا کے نیک بندے جب کسی بات یا آئندہ واقعات یا کسی کام کے نیک و بد انجام کو معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے استخارہ کرتے ہیں یعنی کچھ نفل اور کلام پڑھ کر سوتے ہیں تو خواب میں صاف جوابِ باصواب پاتے ہیں یا بعض قرآن یا کسی کتاب سے فال لیتے ہیں اور گاہے گاہے فال بھی صحیح اور موافق ہو جاتے ہیں۔ بعض عارف زندہ دل لوگ بیداری میں اپنے دل کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور طرفۃ العین میں آگاہی پا لیتے ہیں۔

آئینۂ سکندر جامِ جم است بنگر
تا بر تو عرضہ دارد احوالِ ملک دارا

(حافظ شیرازی)

ترجمہ: دل آئینۂ سکندر اور جامِ جمشید کی طرح ہے۔ اس میں دیکھ تاکہ یہ تجھے دارا کے ملک کے حالات بتائے۔

ایسے لوگوں کے حق میں آیا ہے: (حدیث) اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ یعنی جب کوئی کام

شروع کرو تو اس کی صحت اور غلطی کے لیے اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو اور یہ خواص کا کام ہے۔ عوام صرف اس قدر کر سکتے ہیں کہ کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے اگر کسی شخص کو تردد اور پریشانی لاحق ہو کہ آیا یہ کام میرے حق میں مفید ہے یا مضر۔ پہلے تو نفل نوافل پڑھ کر اور اللہ اللہ کر کے دل کو صاف کر لیا جائے۔ اس کے بعد دل کو تمام غیر خیالات سے صاف اور خالی کر کے تصور اسم اللہ ذات یا تصور اسم حضرت سرورِ کائنات صلعم کے ذریعے بارگاہِ الٰہی یا بزمِ نبوی ﷺ کی طرف متوجہ اور ملتجی ہو جائے اور مراقبہ کرے یا سو جائے۔ اگر مراقبہ یا خواب کے اندر کچھ اشارت یا بشارت ہو جائے تو فبہا ورنہ اگر عین مراقبہ سے فراغت یا خواب سے بیدار ہوتے وقت دل کو مطمئن اور اس کی طرف مائل اور راغب پائے تو جانے کہ اس کام کے کرنے میں نفع اور فائدہ ہے اور اگر دل کو پریشان، خائف اور کام سے متنفر پائے تو جانے کہ اس کام میں ضرر اور خطرہ ہے۔ کیونکہ دل خواب اور مراقبے کے ذریعے کام کے ضرر اور نفع کو معلوم اور محسوس کر لیتا ہے۔ ابتداء میں جب طالب مولا کا لطیفۂ دل زندہ ہونے لگتا ہے تو اس کی بعض علامات یہ ہوتی ہیں کہ پہلے اس کو خواب میں بیداری حاصل ہوتی ہے یعنی خواب میں ہوش اور شعور حاصل کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ جو اس وقت میں دیکھ رہا ہوں خواب کی حالت ہے۔ اور اگر یہ حالت زیادہ ترقی پکڑے اور ہر خواب میں اسے ہوش اور شعور حاصل ہو جائے تو اس نے گویا مراقبے کی حالت کو پا لیا ہے اور جب وہ ہوش اور حواس کے ساتھ خواب کی حالت میں اپنے اختیار سے چلا جائے اور پھر اپنے اختیار سے واپس آ سکے تو اس شخص نے مراقبے کو گویا حاصل کر لیا ہے۔

بعض لوگوں کو جب کشف ہونے لگتا ہے تو خواب یا مراقبے کے اندر انہیں اپنے گھر کے آئندہ واقعات نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی طرح ظہور پذیر اور نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح جب اس کی نظر وسیع ہوتی جاتی ہے تو اپنے محلے اور تمام شہر اور ضلع حتیٰ کہ صوبے اور ملک کے مختلف حالات اور واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ گاہے ہفتے، مہینے اور سال حتیٰ کہ بعض کو عمر بھر کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ ایسے مبتدی طالبوں کو چاہیے کہ اس قسم کی غیبی آگاہیوں کو اپنے دل میں مخفی رکھے اور خاص و عام کے سامنے بیان کر کے شہرت کا طالب نہ بنے۔ کیونکہ اس قسم کی خودنمائی اور خودفروشی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حالت

اس سے سلب ہو جاتی ہے اور پھر یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے صاحب کشف اگر اپنے راز کو مخفی رکھیں اور مستقل مزاج رہیں تو بعد میں انہیں اہلِ تکوین متصرفین غوث، قطب، اَوتاد، ابدال اور اَخیار وغیرہ کے زمرے میں شامل کر لیا جاتا ہے اور اسے کشفِ تام اور مکاشفہَ دوام حاصل ہو کر باطن میں صاحبِ منصب اور روحانی ملازم بنالیا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ اُمتِ محمدی ﷺ کے اندر باطنی لوگوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جنہیں اہلِ تکوین متصرفین کہتے ہیں اور انہیں رجال الغیب بھی کہتے ہیں اور یہ گروہ درجہ وار غوث، قطب، اَوتاد، ابدال، نجباء، نقباء اور اخیار پر مشتمل ہوتا ہے۔ غوث یا قطب الاقطاب ان سب کا سردار ہوتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کا باطنی جانشیں یا نائب اور خلیفہ ہوا کرتا ہے۔ غوث ہمیشہ دنیا میں ایک ہوتا ہے۔ وہ خود قطب ارشاد کا کام بھی کرتا ہے اور اس کے نیچے تین قطب کام کرتے ہیں۔ ان کے ماتحت سات اوتاد ہوتے ہیں اور اوتاد کے نیچے چالیس ابدال کام کرتے ہیں۔ ان کے ماتحت نجباء، نقباء اور اخیار ہوا کرتے ہیں۔ یہ کل تین سو ساٹھ اولیاء اللہ کا باطنی محکمہ ہوتا ہے اور دنیا کے چپے چپے پر ان کا تصرف ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ان میں سے ادنےٰ درجے کا تصرف جسے متصرف دہقانی کہتے ہیں بارہ بارہ کوس تک زمین اور اہلِ زمین کا نگران اور پاسبان ہوتا ہے۔ وہ اپنے علاقے میں ایک چڑیا کے انڈے تک کو اپنی نگرانی اور تصرف میں رکھتا ہے۔ اسے اپنے زیرِ تصرف علاقے کے اندر عورتوں کی ہانڈیوں اور آٹے میں ڈالے ہوئے نمک تک کا اندازہ اور حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے زیرِ تصرف علاقے کی تمام چھوٹی موٹی باتوں اور کل ادنیٰ و اعلیٰ واقعات سے اللہ تعالیٰ کے خداداد علم کے ذریعے واقف اور آگاہ ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ٥ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ٥ (الانبیآء ۲۱: ۱۰۵ ۔ ۱۰۶)۔ ترجمہ: ''اور تحقیق ہم نے داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور کے اندر ذکر کی تعریف کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ البتہ میری زمین کے حقیقی وارث میرے نیک اور صالح بندے رہا کریں گے۔ چنانچہ اس امر میں میرے عبادت گذار بندوں کے لیے عام پیغام ہے۔'' یعنی میرے تمام بندوں کے لیے عام پیغام ہے کہ کثرتِ ذکر اور عبادت سے جو لوگ اپنے آپ کو اَلصّٰالِحُوْن یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک

برگزیدہ بندوں میں شامل کر لیتے ہیں وہی اصلی اولی الامر اور وارثین فی الارض بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ آیا ہے: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج (النسآء ۴: ۵۹)۔ یعنی "اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔" ان اولی الامر سے مراد ہرگز یہ دنیا کے ظاہر، کافر، جابر، ملحد اور بے دین حکمران نہیں ہیں جنہوں نے مکر و فریب، ظلم اور تشدد سے اللہ تعالیٰ کی مظلوم اور عاجز خلقت پر ناروا قبضہ اور بے جا تصرف جما لیا ہے۔ جن کی جابر، مستبد حکومت کی مشینری غریبوں اور مسکینوں کو دن رات روندتی اور پیستی رہتی ہے اور بے کس محتاج اور مظلوم رعایا کا خون چوستی ہے۔

دراصل اس ظاہری مادی حکومت کے اوپر عالمِ امر کی ایک لطیف روحانی حکومت قائم ہے اور یہ مادی حکومت اس باطنی حکومت کے لیے بمنزلہ ظل اور سائے کے ہے۔ ظاہری دنیوی حاکموں کی حکومت ظاہری اجسام اور مادی ابدان پر ہے لیکن باطنی اولی الامر روحانیین عالمین کا تصرف باطنی قلوب اور ارواح کے جہان پر ہے۔ ظاہری بدن چونکہ باطنی دل اور روح کی قید اور تصرف میں ہے۔ دل اور روح جو کچھ چاہتے ہیں، جسم اور بدن بے اختیار وہی کام کرتے ہیں۔ جسم دل کے قبضے میں اس طرح ہے جس طرح کاتب کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے کہ جو کچھ کاتب چاہتا ہے وہی قلم سے لکھواتا ہے۔ پس اصل حاکم اولوالامر وہی لوگ ہیں جن کا تصرف عالمِ امر کے لطیف جہان پر ہے اور جو قلوب اور ارواح پر حکومت کر رہے ہیں۔ پس اصل حقیقی حاکم یہی رجال الغیب، اولوالامر، اہلِ تکوین اور متصرفین کا محکمہ ہے اور دراصل انہی کا تصرف دنیا میں جاری اور ساری ہے اور ظاہری حکام اور مادی سلاطین ان کے زیرِ اثر اور زیرِ فرمان اس طرح ہیں جس طرح انسانی جسم دل اور جان کے تصرف اور قید میں ہے۔ ظاہر حاکم جس وقت اپنے قلم سے کسی مقدمے کا فیصلہ لکھ رہا ہوتا ہے تو اس حاکم کا دل اس وقت ان باطنی حاکموں کی انگلیوں میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح حاکم کی انگلیوں میں قلم اور پَر ہوتا ہے۔ پس دراصل فیصلہ لکھنے والے اور حکم کرنے والے یہی لوگ ہوتے ہیں۔ گو ہمیں بظاہر یہی مادی لوگ حکومت کرتے اور چلاتے نظر آتے ہیں۔ گو بظاہر ہمیں نہ ان لوگوں کی شکل نظر آتی ہے اور نہ ان کا فعل اور عمل محسوس ہوتا ہے۔ کیا دنیا میں ہر فعل دل اور روح نہیں کرتے اور دل اور روح کی صورت اور ان کا

فعل اور عمل نظر آتا ہے؟ اندھے مردہ دل خوابیدہ نفسانی لوگوں کو ان روحانی، نورانی لوگوں کا علم اور پتہ نہیں ہے۔ یہ مادی جہان گویا ایک بڑا طویل اور عریض مکان ہے اور جس کا فرش زمین اور چھت آسمان ہے۔ اس وسیع مکان کے مردہ دل نفسانی مکین مادے کا لحاف اوڑھے ہوئے غفلت کی نیند سو رہے ہیں لیکن روحانی زندہ دل لوگ اس مکانِ دنیا کے اندر جاگتے ہوئے بیدار ہیں۔ سو نفسانی سوئے ہوؤں کو نہ اپنا پتہ ہے اور نہ غیر کا لیکن بیدار روحانیوں کو اس مادی مکان کے چپے چپے اور اس کی تمام اشیا اور اس کے جملہ سوئے ہوئے بیدار مکینوں کا ہر طرح علم رہتا ہے۔ وہ اس مادی دنیا میں باطنی سپاہیوں اور چوکیداروں کی طرح چکر لگاتے اور اپنے زیرِ تصرف اور زیرِ نگرانی زمین کی خبر پاتے ہیں اور اس کی ظاہری باطنی حفاظت اور نگرانی کرتے کراتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں باطنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے، بات چیت کرتے، اور اپنے باطنی منصبی کام کرتے رہتے ہیں۔ ظاہری نفسانی لوگ ان کی چال، افعال اور احوال سے بالکل بے خبر ہیں۔ ان رجال الغیب اولوالامر متصرفین لوگوں کی باطن میں اپنی مجلسیں اور کانفرنسیں ہوا کرتی ہیں اور دنیا کے تمام کاروبار پہلے عالمِ امر میں ان کے ہاتھوں طے ہوتے ہیں بعدہٗ مادی دنیا کے عالمِ خلق میں ان کا اجراء اور نفاذ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد ہمیشہ تقریباً تین سو ساٹھ رہتی ہے۔ کبھی کام کی کثرت سے ان کی تعداد بڑھ جاتی ہے لیکن گھٹتی نہیں ہے۔ جب غوث دنیا سے گذر جاتا ہے تو تین اقطاب میں سے ایک اس کی جگہ متعین ہو جاتا ہے۔ اگر قطب دنیا سے رحلت کر جائے تو اس کی جگہ اوتاد میں سے ایک شخص مقرر ہوتا ہے اور اوتاد کی جگہ ابدال وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اس محکمے میں سالک اور مجاذیب ہر قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس میں مجاذیب کی کثرت ہو جاتی ہے تو دنیا میں ابتری اور افراتفری اور فسادات رونما ہو جاتے ہیں اور جب سالکین کی کثرت ہو جاتی ہے تو دنیا میں امن وامان اور ہر طرح سے آرام رہتا ہے۔ اکثر غوث ایک جگہ قیام رکھتا ہے اور باقی متصرفین پھرتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ شاید یہ ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے کہ جن دنوں اس فقیرؔ نے کالج چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی تھی تو ان دنوں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ میرا ارادہ حج کو جانے کا ہو گیا تھا۔ ان دنوں مجھے خواب میں کہا گیا کہ اس زمانے کے غوث آج کل جدہ میں رہتے ہیں اگر تمہیں حج

کے لیے جانے کا اتفاق ہو تو اسے ملتے جائیں۔ لیکن اس سال مجھے حج پر جانے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ اکثر دفعہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی کامل عارف فقیر سفر کا ارادہ کرتا ہے تو جس علاقے میں داخل ہوتا ہے تو اس علاقے کا متصرف اسے باطن میں آملتا ہے اور اپنے علاقے کی کنجیاں اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں معاون اور مددگار اور اس کے ظاہر باطن کا محافظ اور چوکیدار رہتا ہے۔ ان لوگوں میں خاص بات یہ ہے کہ یہ اپنا راز بہت پوشیدہ رکھتے ہیں اور کسی کو اپنا بھید نہیں دیتے۔ اظہار اور شہرت ان کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ اگر ان کی کوئی بات ظاہر اور آؤٹ ہو جائے تو بس اپنے منصب سے سلب ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت گمنامی کی چادر اوڑھے رہتے ہیں۔

ذیل میں چند احادیث جو رجال الغیب کے ثبوت میں وارد ہوئی ہیں بیان کرتے ہیں:۔

ابو نعیمؒ نے ابنِ مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے بعض ایسے خاص خاص مقبول بندے ہوتے ہیں کہ جن کی دعا اور برکت سے اللہ تعالیٰ لوگوں پر رحمت فرماتا ہے۔ آسمان سے بارشیں برساتا ہے اور زمین سے پیداوار اگاتا ہے۔ یہ لوگ دنیا میں باعثِ امن و امان ہیں اور بمنزلہ روحِ رواں ہیں۔ یہ تین سو ساٹھ آدمی ہوتے ہیں۔ ان میں بعض کے قلوب آدم علیہ السلام کے قلب کے مشابہ ہوتے ہیں اور بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے قلوب موسیٰ علیہ السلام کے قلب کی طرح ہوتے ہیں اور بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کے دل ابراہیم علیہ السلام کی مانند ہوتے ہیں اور بعض کے دل ملائکہ مقربین اور دیگر ملائکہ کے مشابہ ہوتے ہیں۔

کتاب کرامات الاولیا میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ روئے زمین کبھی ایسے چالیس آدمیوں سے خالی نہیں رہتی جن کی برکت سے آسمان سے بارشیں ہوتی ہیں اور زمین نباتات اگاتی ہے۔ یہ لوگ میری امت کے ابدال کہلاتے ہیں۔

امام احمدؒ عبادہ ابن صامتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت میں قیامت تک چالیس آدمی ایسے رہیں گے جن کی وجہ سے زمین اور آسمان کا

نظم ونسق قائم رہے گا۔ آنحضرت صلعم سے دریافت کیا گیا کہ ان کی صفت کیا ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی ظلم کرے تو معاف کرتے ہیں اور برائی کے بدلے احسان کرتے ہیں۔

جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ ابدال کی خبر احادیث میں صحیح ہے۔ بلکہ معناً ایسی متواتر ہے کہ ان کا وجود درجۂ یقین تک پہنچا ہے۔

سخاوی نے لکھا ہے کہ سب سے واضح روایت ابدال کی وہ ہے جو امام احمدؒ نے شریح بن عبید سے روایت کی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ اہلِ شام پر لعنت نہ کرو کیوں کہ اس میں چالیس ابدال رہتے ہیں کہ ان کی برکت سے بارشیں ہوتی ہیں اور ان سے دین کو مدد پہنچتی ہے۔ امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ روایت جو امام احمدؒ نے نقل کی ہے اس کی اسناد کے طریقے دس سے زیادہ ہیں۔

خطیب نے تاریخ بغداد کتانی سے نقل کی ہے کہ نقباء سو ہوتے ہیں اور نجباء ستر اور ابدال چالیس اور سات عمود یعنی اوتاد ہوتے ہیں اور قطب زمین میں تین اور ایک قطب الاقطاب یا غوث ہوتا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ بدلاء ملائکہ کی مثل ہوتے ہیں۔ اوتاد انبیاء مرسلین کی مانند ہوتے ہیں۔ نقباء اور نجباء انبیاء بنی اسرائیل کی طرح۔ چار قطب خلفائے راشدین جیسے اور قطب الاقطاب یا غوث حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مثل ہوتا ہے۔ یہ شخص آپ ﷺ کا ظل اور دنیا میں آپ ﷺ کا جانشین اور نائب ہوا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا اسناد سے ثابت ہوتا ہے کہ رجال الغیب کا وجود متواتر صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ یہ متاخرین کی اپنی اختراع نہیں ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بس دنیا میں یہی مذکورہ بالا تین سو ساٹھ اولیاء اللہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ ان کے علاوہ ان سے بڑھ چڑھ کر بھی دنیا میں بہت اولیا ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا طبقہ تو اولیا کا ایک خاص شعبہ ہے جو دنیوی کاروبار کے باطنی نظم ونسق کے لیے قائم ہوتا ہے۔ انہیں طالبوں کے ارشاد اور تلقین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان میں صرف غوث کامل پیر اور صاحب ارشاد ہوتا ہے اور قطب آدھے پیر کا درجہ رکھتا ہے۔ باقی جس قدر بھی اہلِ تکوین متصرفین دنیا میں ہوتے ہیں وہ ملکی معاملات اور دنیوی کاروبار اور نظم ونسق کے کارکن اور چلانے والے ہوتے ہیں۔ ان کی

تائید سے کاروبار میں رونق آ جاتی ہے، مشکلات حل ہو جاتی ہیں، بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں اور مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص ان رجال الغیب کی تائید حاصل کرنا چاہے تو کام شروع کرتے وقت یا سفر یا کسی مہم پر جاتے وقت یا ورد وظیفہ یا دعوت یا کلام شروع کرتے وقت اول آخر درود شریف پڑھ کر ان رجال الغیب پر یوں سلام کہے اور ان سے استمداد حاصل کرے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَارِجَالَ الْغَیْبِ وَیَااَرْوَاحَ الْمُقَدَّسَةِ اَغِیْثُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اُنْظُرُوْنِیْ بِنَظْرَةٍ یَا نُقَبَآءُ یَا نُجَبَآءُ یَا اَبْدَالُ یَااَوْتَادُ یَا اَقْطَابُ وَ یَا غَوْثُ اَغِیْثُوْ بِحُرْمَةِ مُحَمَّدٍصَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَهْلِ بَیْتِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اور اس سے پہلے اگر اول آخر درود اور فاتحہ اور تین بار اخلاص پڑھ کر ان ارواحِ مقدسہ کو بخشے تو اور بہتر ہے۔ بعض لوگوں نے چہل ابدال کی نسبت عجیب وغریب باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ رات کے وقت سر پر سے بہت تیزی کے ساتھ کوئی چیز اڑتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ عوام گمان کرتے ہیں کہ یہ چہل ابدال ہوتے ہیں لیکن یہ بات غلط ہے۔ یہ ایک قسم کا پرندہ ہوتا ہے جو رات کو نکلتا ہے اور بہت تیزی سے پرواز کرتے ہوئے گذر جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے کتابوں میں چہل ابدال کا نقشہ بھی دیا ہے کہ وہ چاند کی خاص تاریخوں میں اپنا مقام بدلتے ہیں اور ہر تاریخ کو ایک خاص طرف ہوا کرتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کی صحت میں شک ہے۔ رجال الغیب جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے غیبی لطیف وجود سے دنیا میں چکر لگاتے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔

عام نفسانی لوگ انہیں آتے جاتے نہیں دیکھ سکتے۔ حج کے موقع پر بیت اللہ شریف میں سب لوگ ایک خاص وقت میں جمع ہوتے ہیں اور لیلۃ القدر کی رات اور لیلۃ الرغائب یا شب برات کی رات اور دیگر مبارک راتوں میں یہ لوگ روحانیوں کے باطنی جلوسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ کامل عارف لوگ دنیوی کاروبار میں صرف ان کی حاضرات کر کے ان سے مدد لیتے ہیں۔ یہ امتِ محمدی میں گویا ایک باطنی پولیس کا محکمہ ہوا کرتا ہے جن کے ذمے ظاہری کاروبار کا نظم ونسق ہوا کرتا ہے۔ ان لوگوں کو کاروبار چلانے کے لیے باطنی موکلات کی تائید اور خدمات حاصل ہوتی ہیں اور یہ لوگ اپنے کاروبار میں ان سے چپڑاسیوں اور

پیادوں کا کام لیتے ہیں۔ رجال الغیب کی نسبت ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

ترجمہ: اس بات میں کچھ فائدہ نہیں کہ راز ظاہر ہو۔ ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی بات ایسی نہیں جو موجود نہ ہو۔

اگر کسی شخص نے تمام عمر کبھی کوئی سچا خواب نہ دیکھا ہو اور نہ ان مذکورہ بالا قلبی واردات میں سے کچھ بھی اسے اپنی ساری زندگی میں محسوس ہوا ہو تو ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اپنے دل کا علاج کریں اور کسی معالجِ قلوب کے پاس جا کر اور اپنے بیضۂ ناسوتی کو ذکر اللہ کی حرارت سے گرم کر کے اسے پھوڑنے کی جدوجہد اور سخت کوشش جاری رکھیں۔ ورنہ شقاوت اور حرمان ان کے گلے کا ہار ہوگی اور کسی کا یہ بیت ان کے حسب حال ہوگا۔

نہ گلم نہ سبزہ زارم، نہ درخت میوہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

○

# رابطۂ شیخ وطالب

مبتدی طالب کو مرشدِ کامل کے بغیر چارہ نہیں ہے جس طرح عورت بچہ جننے میں مرد اور خاوند کی محتاج ہے سو اسی طرح محض مرشد کی صحبت اور توجہ ہی سے طالب کے دل کا معنوی بچہ یعنی لطیفۂ قلب زندہ ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت اور صورت یہ ہوتی ہے کہ مرشدِ کامل طالب کے رحمِ قلب میں اپنے زندہ کامل بالغ دل سے نورِ اسم اللہ ذات کا نوری لطیفہ ڈال دیتا ہے اور وہ نوری لطیفہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے زندہ ہو کر ایک جنین اور معنوی لطیف بچے کی صورت میں بڑھتا رہتا ہے۔ وہ معنوی بچہ مرشد کے بطنِ باطن یعنی قلب کے ساتھ ایک باطنی رشتے کے ذریعے وابستہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مادی بچہ ناف یعنی ناڑ کے رشتے سے ماں کے پیٹ کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور اس ناف کے رشتے سے بچے کو غذا پہنچتی رہتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح طالب کا باطنی، معنوی نوری طفل اپنے مربی کے باطنی بطن کے ساتھ ایک نوری رشتے کے ذریعے بندھا ہوا ہوتا ہے اور اسی باطنی رابطے اور روحانی رشتے سے باطنی غذا پاتا رہتا ہے۔ اس کو اصطلاحِ تصوف میں رابطۂ شیخ کہتے ہیں۔ شیخ مربی کے بغیر لطیفۂ قلب کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔ محض اپنی کوشش اور خالی ورد وظائف سے بے راہبر چلّوں چلّوں سے ہرگز دل کی زندگی حاصل نہیں ہوتی۔ ان سے محض تزکیۂ نفس ہو کر کچھ عارضی صفائی حاصل ہو جاتی ہے اور بعض وقت تھوڑا سا ناسوتی کشف اور رجوعاتِ خلق بھی پیدا ہو جاتا ہے مگر دل کی زندگی کا راستہ ہی اور ہے۔

وظیفوں، ورد چلّوں سے اگر حاصل خدا ہوتا
انگشتوں سے حمل ہوتا تو شوہر کب روا ہوتا

جس طرح ایک روشن چراغ سے دوسرے بے شمار چراغ روشن کیے جاسکتے ہیں اسی طرح مرشدِ کامل اپنے دل کے باطنی چراغ سے ہزاروں لاکھوں طالبوں کے قلبی چراغ روشن کر لیتا ہے لیکن چراغ کے اندر اگرچہ تیل بتی وغیرہ کا تمام سامان موجود ہو، لیکن اسے روشن ہونے کے لیے ایک دوسرے روشن چراغ سے روشنی لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح دل کے باطنی چراغ روشن کرنے کے لیے ایک باطنی روشن چراغ کی سخت ضرورت

ہے اور سوائے اس کے اور دوسرا راستہ ہی نہیں ہے۔

ایک انسانِ کامل کے وجود کی مثال جس میں اسم اللہ کا نوری چراغ روشن ہوتا ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتے ہیں: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ لا يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ○ (النور ۲۴ : ۳۵) ۔ ترجمہ: ''(اسم) اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ گویا ایک دریچہ ہے۔ جس میں چراغ رکھا ہوا ہے اور وہ چراغ ایک شیشے کی چمنی کے اندر ہے جو ایک روشن ستارے کی طرح چمک رہا ہے اور ایک مبارک درخت زیتون سے آویزاں ہے جس کا تیل نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ یعنی اس کی نہ کوئی جہت ہے اور نہ کیف۔ یعنی ایک بے مثل غیر مخلوق نوری جوہر ہے۔ نزدیک ہے کہ اس کا تیل جل اٹھے اور روشن ہو جائے چاہے اسے مادی آگ تک چھوئے بھی نہیں۔ یعنی یہ کوئی مادی چراغ نہیں ہے کہ مادی آگ سے روشن ہو بلکہ یہ تو اس کے ظاہری نور کے اوپر ایک بالا غیر مخلوق نور ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے اپنے نور کی طرف ہدایت فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو مثالیں پیش کر کے سمجھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔'' یہاں پر لفظ اللہ سے مراد ذات اللہ ہرگز نہیں ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو زمین اور آسمان کا نور کہا جائے اور اسے چراغ کی طرح آسمان اور زمین کو روشن کرنے والا سمجھا جائے تو معاذ اللہ اس کی ذات پر سورج کی طرح ظرفیت لازم آتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ زمین اور آسمانوں اور مافیہا اور اس کے ماسوا تمام کائنات کا خالق ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ سو یہاں ایک کامل انسان کے وجود میں اسم اللہ ذات کا چراغ اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل سے بطور ودیعت رکھ دیا ہے۔ اس میں استعداد اور توفیقِ ہدایت اور نوری قابلیت تیل کی مانند ہے اور چراغ کو بادِ مخالف سے محفوظ رکھنے کے لیے انسان کے وجود میں قلب صنوبری چمنی کی طرح لٹک رہا ہے اور چمنی کے رکھنے کے لیے مشکوٰۃ یعنی دریچہ انسانِ کامل کا سینہ ہے اور انسانِ کامل کا عنصری وجود ایک درخت زیتون کی مانند ہے جس سے یہ

نوری چراغ آویزاں ہے جو بمثل شجرِ طور کے قائم ہے۔ سو اسی طرح اس نوری چراغ کے تمام لوازمات انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ازل سے رکھ دیئے ہیں۔ اب اگر ضرورت ہے تو صرف ایک دوسرے روشن چراغ کی ہے۔ جس کی لَو اور روشنی سے اس نے روشنی لے کر روشن ہونا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود اسی آیت کے اگلے حصے میں ارشاد فرماتے ہیں: فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَیُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ (النور ۲۴: ۳۶)۔ ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے امر اور اذن دے دیا ہے کہ اس کے نام کو گھروں کے اندر بلند کیا جائے اور اس کے اسم کا ان میں ذکر کیا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اسم اللہ ذات کو ایک بجلی گھر اور پاور ہاؤس کی طرح وجودِ محمدی ﷺ میں قائم کر دیا ہے جو کہ زمین اور آسمانوں کو اپنے نور سے روشن کیے ہوئے ہے اور اللہ تعالیٰ نے اذن اور امر فرما دیا ہے کہ ایک بجلی اور روشنی کا ایک ایک ستون ہر گھر میں قائم کیا جائے اور ہر شخص اس نور اور بجلی کا تار اپنے دل کے گھر میں لگا لیوے تا کہ ہر دل کا گھر نورِ اسم اللہ ذات سے روشن اور منور ہو اور یوں تمام جہان اسم اللہ ذات کے عالم گیر نور سے جگمگا اٹھے۔

## ابیاتِ مصنفؒ

اے خدا نورِ محمدؐ کو درخشاں کر دے ۔۔۔ نورِ عرفان سے دنیا میں چراغاں کر دے
سینہ سینا ہو ہر اک آنکھ ہو بینا جس سے ۔۔۔ خامہ مثلِ یدِ بیضا مرا تاباں کر دے

غرض طالب یہ باطنی بجلی اپنے مرشد مربی سے بذریعۂ تارِ باطنی یعنی رابطۂ شیخ لیتا ہے اور وہ مرشد اپنے شیخ اور مربی سے، اور اس کا شیخ اپنے شیخ سے سلسلہ وار لیتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ اپنے اصلی ہیڈ کوارٹر اور حقیقی پاور ہاؤس حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات تک منتہی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس باطنی بجلی کے تار ایک دوسرے سے پیوست اور مربوط ہیں اور تمام اہل اللہ باطن میں اسی نوری رشتے سے آپس میں جکڑے ہوئے ہیں اور اسی سلک میں منسلک ہیں اور ان تمام سلاسل و روابط یعنی باطنی برقی تاروں کا ہیڈ کوارٹر، مرکزِ اعلیٰ اور پاور ہاؤس وجودِ مسعود حضرت سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفی ﷺ اور آپ ﷺ کی ذات بابرکات و مجمع جمیع فیوضات ہے۔ وہاں سے تمام سلاسل اور روابط اور سب باطنی برقی تار نکلتے ہیں اور وہاں جا کر ختم ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ سب کے مبدأ و معاد

ہیں اور آپ ﷺ کا وجودِ مبارک ہی باعثِ کون ومکان اور مظہرِ وجود وایجاد ہے۔ باطن میں ان سلاسل و روابط کا ایک نوری جال بچھا ہوا نظر آتا ہے اور تمام باطنی شیرانِ زمان ان سلاسل سے وابستہ ہیں۔

ہمہ شیرانِ جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند
روبہ ازحیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

ترجمہ: دنیا کے تمام شیر یعنی اولیاء اللہ اس سلسلے سے وابستہ ہیں۔ یہ لومڑ مزاج لوگ اس سلسلے کو کب اپنے حیلوں سے توڑ سکتے ہیں۔

## ابیاتِ مصنفؒ

سروریاں چہ عجب برق براقے دارند     کہ بیک طرفہ بمنزل ببرد قافلہ را
خفتہ باناز بایں مرکبِ برقی اے دل     چشم بکشا وبہبیں طے شدہ صد مرحلہ را
واقفِ نکتۂ ایں غیب بہ غیب مکن     راز محرم نہ دہد محرم اہلِ گلہ را

جذبِ حق است کہ از سینۂ پاکاں خیزد
تو کجا دیدۂ ایں جنبش و ایں زلزلہ را

ترجمہ: طالبانِ طریقہ سروری قادری ایسے عجیب برقی براق پر سوار ہوتے ہیں جو آنکھ جھپکنے کے اندر قافلے کو منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔ اے دل! اس برقی سواری پر ناز سے سوجا اور پھر جب آنکھ کھول کر دیکھے گا تو تیرے سینکڑوں منازل طے ہوئے ہوں گے۔ جب تو اس غیب کے نکتے سے واقف نہیں ہے تو اسے عیب کی نظر سے نہ دیکھ۔ محرم لوگ ایسے غیب میں مجرموں کو اپنا محرم راز نہیں بناتے۔ یہ ایک حق کا جذبہ ہے جو پاک لوگوں کے سینے سے نکلتا ہے۔ تو نے اس جنبش اور اس زلزلے کو نہیں دیکھا۔

غرض جب طالب کے اندر یہ نوری بچہ شیخ کی توجہ سے زندہ اور قائم ہو جاتا ہے تو پہلے پہل طالب خواب میں ایک گونہ شعور اور بیداری حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی جس وقت وہ خواب دیکھتا ہے تو ساتھ ہی یہ علم اور شعور بھی رہتا ہے کہ یہ جو میں دیکھ رہا ہوں یہ خواب کی حالت ہے۔ یہ مراقبے کی ابتدائی حالت ہے۔ بعدہٗ وہ ترقی حاصل کر کے اپنے اختیار سے خواب کے باطنی لطیف عالم میں ہوش اور حواس کی حالت میں آتا اور جاتا ہے۔ ابتدا میں

طالب اپنے سینے کے اندر ایک گونہ زندگی کی حرکت، تموج اور ثقالت محسوس کرتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد وہ نوری بچہ اسم اللہ ذات کی حرارت سے بیضۂ ناسوتی کو توڑ کر مرغ لاہوتی کی طرح بحکمِ پروردگار باہر آجاتا ہے۔ یہ قلبی لطیفہ عالمِ امر کا لطیف جثہ رکھتا ہے اور عالمِ روحانی اور عالمِ ملکوت میں پرواز کرتا ہے۔ جب یہ مرغ لاہوتی عنقائے قافِ قدس کی طرح آشیانہ عالمِ شہادت سے فضائے عالمِ غیب کی طرف پرواز کرتا ہے تو اس کا پہلا قدم تمام عالمِ آب وگل یعنی شش جہات سے باہر پڑتا ہے۔ تمام انبیا کے معجزات اور جملہ اولیاء اللہ کے کشف کرامات اور طیر سیر کل سفلی اور علوی مقامات اور اس نوری لطیف وجود کے کرشمے ہوتے ہیں۔ اس نوری وجود پر ہمیشہ ہر وقت نئی وارداتِ غیبی اور فتوحاتِ لاریبی کا نزول ہوتا ہے۔ اس نوری وجود والے سالک کا دل ایسے نئے علوم باطنی وغیبی معانی اور اچھوتے معارف اور اسرار سے گویا لبریز ہو جاتا ہے جو کتابوں میں ہرگز نہیں ملتے نہ حیطۂ تحریر وتقریر میں آسکتے ہیں۔ اس قسم کا نوری وجود خواب، مراقبے اور بیداری میں ہر وقت ذکر فکر، نماز، تلاوت، عبادت اور اطاعت میں مشغول رہتا ہے۔ یہی اس کی قُوت اور قوت ہوتی ہے۔ یہ نوری وجود ہمیشہ مجلسِ انبیا و اولیا اللہ میں حاضر رہتا ہے۔ مگر طالب مبتدی کو گاہے اپنا جثہ معلوم ہوتا ہے اور گاہے اس کے علم سے وہ جثہ معدوم ہوتا ہے۔ اگر طالب کسی گناہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ نوری جثہ مانع ہوتا ہے اور سخت محاسبہ اور ملامت کرتا ہے۔ اور اگر اتفاقاً گناہ سرزد ہو جائے تو باطن میں وہ جثہ اس قدر ندامت، پشیمانی، سوز اور گداز دلاتا ہے کہ طالب توبہ واستغفار اور گریہ، آہ و نالہ سے گناہ کے وجود کو جلا دیتا ہے۔ وہ نوری وجود مقامِ ارشاد میں شیخ کی صورت اور مقامِ طلب میں طالب کی صورت میں نظر آجاتا ہے۔ مگر اس کی اصلی صورت شیخ اور طالب کی صورت سے آمیختہ ایک تیسری صورت ہوتی ہے۔ وہ اصلی صورت میں بہت کم نظر آتا ہے۔ جیسا کہ انسان اپنا چہرہ بہت کم دیکھتا ہے اور دوسروں کی شکل ہمیشہ ہر وقت نظر آتی ہے۔ یہ لطیفہ فنافی الشیخ کہلاتا ہے۔ جس قدر شیخ کامل اور طالب صاحب استعداد ہوتا ہے اتنا ہی طالب کا یہ باطنی نوری وجود قوی، طاقتور، صاحب جمال و صاحب کمال ہوتا ہے۔ غرض جب طالب کا یہ نوری وجود شیخ کی تربیت اور پرورش سے پل کر اور بڑھ کر بالغ ہو جاتا ہے تو اس وقت اسے مرتبۂ ارشاد حاصل ہوتا ہے اور اس میں

دوسرے طالبوں کے قلوب کو زندہ کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔اس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اور رسول اللہ ﷺ کے حضور اور شیخ مربی کی طرف سے باطن میں خلقِ خدا کو تلقین اور ارشاد اور فیض پہنچانے کا اِذن اور امر ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے امر سے لوگوں کے قلوب کو فیضِ باطنی سے مالا مال کرتا ہے۔خواہ لوگ اسے جانیں یا نہ جانیں۔

اکثر خدا کے سچے صادق بندے لوگوں کو فیض پہنچاتے ہیں لیکن اپنے آپ کو درمیان میں نہیں لاتے۔قولہ تعالیٰ: قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (الفرقان ۲۵:۵۷) ۔"کہہ دے اے میرے نبی صلعم کہ میں اس ہدایت کے بدلے جو تمہیں کرتا ہوں تم سے اجرت نہیں مانگتا۔" ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں ہوتی جیسا کہ آج کل کے رسمی دکاندار ناقص نفسانی پیر دامِ تزویر پھیلا کر لوگوں کو دستِ بیعت اور مرید محض اس لیے کرتے ہیں کہ ان سے نذرو نیاز اور روپیہ فراہم کر کے اپنی جائیدادیں بنائیں اور دن رات عیش اڑائیں۔مریدوں کے گھروں میں چراغ جلانے کو تیل نہیں ملتا اور پیر کے گھر میں بجلی کے قمقمے جگمگاتے ہیں، بجلی کے پنکھے چلتے ہیں۔مرید بے چارے پیدل چل کر پیر کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی اس طرح بچا کر پیر کی خدمت میں حاضر کرتے ہیں۔لیکن پیر صاحب عالی شان کاروں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔گھر میں ریڈیو لگے ہوئے ہیں، سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتے ہیں اور وہ عیش وعشرت اور گلچھرے اڑاتے ہیں کہ نوابوں اور رئیسوں کو بھی میسر نہیں۔یہ بہشتی ٹھیکیدار گو اپنے گھروں میں دوزخ کا سامان مہیا کرتے ہیں اور خود دوزخ کا ایندھن بننے والے ہیں لیکن مریدوں کو خالی جھوٹی تسلیاں دے کر قیامت کے دن انہیں بہشت میں داخل کرنے کے پکے ذمہ دار بن جاتے ہیں۔قولہ تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ؕ (التوبۃ ۹:۳۴-۳۵)۔ترجمہ:"اے ایمان والو! بہت سے علماء بے عمل اور جھوٹے مشائخین مکر و فریب سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں (اور انہیں اپنے دامِ تزویر

میں پھنسا کر) خدا کے راستے سے روک دیتے ہیں (یہ رسمی رہنما ہیں) جو سونا چاندی اور نقدی وغیرہ اللہ کے نام پر بطور نذر و نیاز لے کر جمع کرتے ہیں۔ اور انہیں راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے۔ (اے میرے نبی ﷺ) ان لوگوں کو دردناک عذاب کی بشارت دے دے۔ اور وہ یوں ہوگا کہ وہ سونا، چاندی اور نقدی دوزخ کی آگ میں گرم کر کے لال کی جاوے گی اور اس سے ان کے ہر دو پہلو اور سینے اور پشت کو غرض چاروں طرف سے جسموں کو داغا جائے گا اور ساتھ ہی ان سے خطاب کیا جائے گا کہ یہ وہ نقدی ہے، جن کو تم مکر و فریب سے اللہ کے نام پر اپنے نفسوں کے لیے جمع کرتے تھے۔ اب اس نقدی کی لذت چکھو۔"

طالب کو چاہیے کہ پیر اور مرشد کو دنیا کے لین دین میں دیکھے۔ اگر وہ دنیا کے لین دین میں حریص طامع اور دنیا کو فراہم کرنے والا جامع ہے تو اسے فوراً طلاق دے دے۔ دوم دیکھے کہ اگر وہ نفس پرست، عیش و عشرت کرنے والا، خوب موٹا اور فربہ بنا ہوا ہے کہ اس سے اپنے جوڑ نہیں سنبھالے جاتے تو ایسے مرشد سے جدا ہو جائے کیونکہ داناؤں نے کہا ہے کہ "حکیم فربہ باید و پیر لاغر۔" یعنی حکیم موٹا اور تندرست تلاش کرو اور پیر دبلا پتلا۔ حکیم جب خود بیمار اور لاغر ہے تو وہ تیرا کیا علاج کرے گا اور پیر جب خود نفس کا ٹٹو، بیل اور دنبے کی طرح موٹا اور فربہ نفس پرور ہے تجھے خدا کا راستہ کیا دکھائے گا۔ سوم رسمی یا خانہ زاد پیر نہ ہو بلکہ کسی کامل کی خدمت میں ریاضتیں اور مجاہدے کر کے باطنی مقامات طے کیے ہوں اور سلوک کی جملہ منازل اور مراتب سے واقف اور آگاہ ہو۔ دیگر صرف تصوف کی کتابیں پڑھنے یا ظاہری فقہ، منطق معانی کے علوم حاصل کرنے یا بزرگوں کے گھروں میں پیدا ہونے یا رسمی طور پر کسی دکاندار پیر سے خلافت لینے سے ہرگز انسان پیر اور مرشد نہیں بن سکتا اور نہ ایسے رسمی رواجی پیروں سے کبھی ہدایت اور فیض حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ خود خالی اور عاری ہوتے ہیں دوسروں کو کیا خاک دیں گے۔ آج کل دنیا میں ناقص پیروں نے وہ اودھم مچار کھا ہے کہ خدا پناہ دے۔ اللہ تعالیٰ ان پیروں کو ہدایت کرے اور مریدوں کو عقل اور تمیز عطا کرے۔

خدا کے خاص بندے لوگوں کو محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور ان کے فائدے کی خاطر تلقین اور ارشاد کرتے ہیں اور اگر کبھی کچھ لیتے ہیں تو ان کے لیے اللہ کی راہ میں دیتے ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر تھا کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ

وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (التوبہ ۹: ۱۰۳) یعنی ''اے رسول صلعم! ان کے اموال سے صدقہ لے۔ یہ چیز انہیں پاک کرے گی اور ان سے ان کے نفوس کا تزکیہ ہوگا۔'' غرض مُرشدِ کامل طالبوں کا تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تجلیۂ روح اور تخلیۂ سِرّ محض اللہ کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی غرض اور مراد یہ ہوا کرتی ہے کہ کسی طرح طالب اللہ کا بندہ بن جائے اور ہدایت پا کر اللہ تعالیٰ سے واصل ہو جائے۔

یاد رہے کہ ہر چیز بنائے بن جاتی ہے اور سنوارے سنور جاتی ہے مگر انسان کا بناؤ سنگار نہایت مشکل اور دشوار کام ہے۔ لیکن ہزاروں لاکھوں میں سے جب کوئی ایک آدھ طالب اصلی کامل آدم اور باطنی انسان کی صورت میں کسی کامل مشاطہ کے ہاتھ سے دلہن کی طرح بن ٹھن کر سنور جاتا ہے تو اس کے بناؤ اور سنوار پر فرشتے عش عش کرتے ہیں اور اس پر فریفتہ ہوتے ہیں اور اس کی تعظیم وتکریم کرتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ (الحجر ۱۵: ۲۹)

## رباعی

ہر پا کہ بخدمتت رسد سر گردد — مقصودِ دو عالمش میسر گردد
ما جملہ مسیم تو کیمیائی شاہا — ہر مس کہ بہ کیمیا رسد زر گردد

ترجمہ: اے محبوب ہر پاؤں جو تیرے کوچے میں داخل ہوتا ہے، سر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اسے دونوں جہان کے مقصود حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور ہم سب بمنزلہ تانبے کے ہیں۔ جو تانبا کیمیا اکسیر سے ملتا ہے وہ سونا بن جاتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تصوف محض توہمات اور خیالات کا مجموعہ ہے اور اہلِ تصوف کو اپنے خیالات اور توہمات خواب یا مراقبے میں متشکل ہو کر نظر آتے ہیں مگر یاد رہے کہ تصوف کا اصل معاملہ خواب وخیال سے دور، شک وشبہ سے بالکل پاک اور وہم وگمان سے منزہ ہے۔ وہاں صبح کی طرح ایک روشن ٹھوس جہان ہے۔ جہاں تمام وہم وگمان، خطرات و ارادات کی ظلمت کو دور اور کافور کرنے والا حقیقی شمسِ درخشاں ہے۔ جو شخص رِحم کی مانند اس تنگ وتاریک نفسانی ظلماتی مادی جہان میں معنوی طور پر مر جاتا ہے تو اس اصلی روحانی، جاودانی اور نورانی جہان میں بصورتِ طفلِ نورانی پیدا ہو جاتا ہے۔ مدت کے بعد جب اس

کا وہ نوری اور معنوی جثہ بڑھ کر عقلِ کلی سے عاقل ہو جاتا ہے اور مادرِ باطنی سے باطنی زبان سیکھ جاتا ہے تو وہاں کی اشیا کے اسما اور حقائق سے واقف ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ وہاں کے روحانی اور باطنی لوگوں کی باتیں سنتا اور سمجھتا ہے۔ وہاں باطنی مدرسوں اور روحانی کالجوں میں باطنی علوم بے واسطہ سینہ بسینہ اور نظر بہ نظر حاصل کرتا ہے۔ اس وقت اس کا معاملہ شک اور شبہ سے گذر جاتا ہے اور اس کا درجۂ یقین علم الیقین سے گذر کر عین الیقین تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسے سالک کا معاملہ شنید سے دید، دید سے رسید اور رسید سے یافت تک پہنچ جاتا ہے۔ جس کو حق الیقین کہتے ہیں۔

جن لوگوں نے ساری عمر حیوانی زندگی بسر کی ہو اور سوائے کھانے پینے کے اور کوئی شغل اور مقصدِ زندگی نہ رکھا ہو، کوئیں کے اندھے مینڈک کی طرح تمام عمر اس مادی دنیا میں گذاری ہو انہیں لامحدود وسیع روحانی دنیا کا کیا پتہ ہے۔ اے طالب سعادت مند! اگر تجھے ابد الآباد کی زندگی درکار ہے اور تیری قسمت میں اللہ تعالیٰ کی معرفت، قرب، مشاہدہ اور وصال و دیدار ہے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جا اور کسی استادِ کامل سے یہ ضروری اور دقیق علم سیکھ تا کہ تو دنیا میں زندگی کے مقصد کو حاصل کرے اور اپنی اصلی منزل کو پہنچ جائے۔ اس دارِ نعیم میں ابدی حیات پا کر ایسے درجات اور باطنی لذات سے بہرہ ور ہو جائے جو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھی ہیں اور نہ کانوں نے سنی ہیں اور نہ کسی کے دل پر کبھی ان کا خیال اور قیاس گذرا ہے۔ یاد رہے کہ تصورِ اسم اللہ ذات کے بغیر نہ دل زندہ ہوتا ہے اور نہ باطنی راستہ کھلتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کا قرب، مشاہدہ، وصال اور دیدار حاصل ہوتا ہے اگر چہ کوئی شخص تمام عمر سخت مجاہدے اور ریاضتیں کرتا پھرے اور ہمیشہ قائم اللیل اور صائم الدہر رہے۔ کیونکہ ظاہری بدنی اعمال اور طاعت و بندگی سے محض نفس کا تزکیہ تو ہو جاتا ہے مگر دل ویسا تاریک اور مردہ رہتا ہے۔ پس عبد کو معبود تک اور مخلوق کو خالق تک پہنچنے کا واسطہ اور ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت، قرب اور وصال کی کلید محض ذکر ہے اور جملہ اذکار میں سے اسم اللہ ذات کا ذکر جامع ترین اور افضل ترین ذکر ہے اور طریقہ تصورِ ذکر کے تمام طریقوں سے افضل، اعلیٰ، اکمل، سہل اور پر امن طریقہ ہے۔ یعنی اسم اللہ کے نقش کو انگشتِ تفکر سے بذریعۂ خیال و تصور تحریر اور مرقوم کرنا اور ذکر کے مقامات میں سے بہترین مقامِ ذکر آنکھ

ہے جس سے دیدار اور مشاہدے کا راستہ کھلتا ہے اور جملہ عبادات اور اطاعات، ریاضات اور جملہ احکام وارکان، شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت اور تمام سلوک اور تصوف کی غرض وغایت اللہ تعالیٰ کی رویت، لقاء اور دیدار ہے اور کوئی نعمت، درجہ اور مرتبہ دیدار کے مرتبے سے افضل اور اعلیٰ نہیں ہے۔ اس لیے طالب کو چاہیے کہ اسم اللہ ذات کا شغل اختیار کرے اور کسی باطنی استاد اور کامل مرشد سے تصور اسم اللہ ذات کے ذریعے علمِ دیدار پڑھے۔ دین اور دنیا کے تمام مراتب اور دنیا وآخرت کے جملہ ظاہری و باطنی خزانے علم دیدار میں حاصل ہو جاتے ہیں۔ مَنْ لَهُ الْمَوْلٰى فَلَهُ الْكُلُّ ۔ جب طالب تصور اسم اللہ ذات کا شغل شروع کرتا ہے تو شیطان اس کی راہ مارتا ہے اور قسم قسم کے وسوسوں اور خطرات کے ذریعے طالب کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ یہ تصور کا کام بننے والا نہیں ہے اور اسم اللہ ذات دل پر جمنے والا نہیں ہے۔ اس طرح اس شغل میں لگا رہنا تضیع اوقات ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ کچھ ورد وظائف، نفل نوافل اور تلاوت وغیرہ کا شغل اختیار کر لیا جائے کیونکہ اس میں کم از کم ثواب تو ہوگا اور جب طالب ظاہر عمل عبادات و اطاعت میں مشغول ہوتا ہے اور دن رات حجرے میں عبادت، ذکر، تلاوت، نفل نوافل، پاس انفاس اور حبسِ دم میں لگ جاتا ہے تو شیطان اس کے دل کے حجرے پر جو ذکر کا اصلی اور حقیقی محل ہے قبضہ جما لیتا ہے۔ چنانچہ اس کی زبان اور دیگر اعضا وغیرہ تو ذکر اذکار اور عبادات میں لگے رہتے ہیں لیکن دل اپنے نفسانی خیالات، دنیوی خطرات اور شیطانی شہوات میں مارا مارا پھرتا ہے اور اس میں ذکر کا کچھ اثر نہیں ہونے دیتا۔

دِل[1] پریشان و مصلّی در نماز      ایں نمازے کے پزیرد بے نیاز

اور نیز اسے شیطان لوگوں کی نظروں میں مشہور و معروف کر دیتا ہے کہ فلاں شخص بڑا دیندار اور عابد شب زندہ دار ہے اور رجوعاتِ خلق سے فریفتہ کر کے اس کی کمائی کو برباد کرتا ہے اور کبر و انانیت کی چھری سے اسے ذبح اور ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دل میں سمجھتا ہے کہ میں نے اتنی عبادت کر لی ہے اور کولہو کے بیل کی طرح چلتے چلتے خیال کرتا ہے کہ میں نے بہت منزل طے کر لی ہے لیکن جب آنکھیں کھولتا ہے تو وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ جب کوئی شخص

---

[1] نمازی نماز پڑھ رہا ہے اور اس کا دل پریشان ہے۔ وہ بے نیاز ذات اس قسم کی نماز کو کیوں کر قبول فرمائے۔

ظاہری اطاعت، ذکر فکر اور عبادت میں مشغول ہوتا ہے اور خناس اس کے دل کو قابو کر لیتا ہے تو شیطان پاس کھڑا ہنس رہا ہوتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔

## رُباعی

اے فسق و فجور کارِ ہر روزہ ما | وے پر ز شراب کاسئہ و کوزۂ ما
مے خندد روز گارِ مے گرید عمر | بر طاعت و فجر نماز و روزۂ ما

(خیام)

ترجمہ: باوجود یہ کہ نیکو کاروں کی شکل اور صورت اور ظاہری نیک عمل کے خیال فسق اور فجور ہمارا مشغلہ ہے اور ہمارا کاسہ اور کوزۂ دل محبتِ شرابِ دنیا سے پُر ہے۔ سو ہماری اس اطاعت، نماز اور روزے پر زمانہ ہنس رہا ہے اور عمر رو رہی ہے۔

پس طالب کو چاہیے کہ تصورِ اسم اللہ ذات کے شغل کو جاری رکھے۔ خواہ اسم اللہ ذات ابتدا میں دل پر قائم نہ بھی ہو کیونکہ مبتدی طالب کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ تصور اسم اللہ ذات کا مطلب یہ ہے کہ اسم اللہ ذات کا نقش دل پر قائم ہو جائے اور ہمیشہ اس میں اسم اللہ ذات متجلی رہے تا کہ جس وقت دل کی طرف متوجہ اور ملتفت ہو اسم اللہ ذات نقش اور مرقوم نظر آئے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسم اللہ ذات اس کی قید میں آ جائے۔ مگر یہ بڑی بھاری غلطی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر طالب اس مبارک شغل کو ترک کر دیتے ہیں۔

یاد رہے کہ اسم اللہ ذات غیر مخلوق ہے اور انسان اور اس کا خیال اور تصور مخلوق ہے۔ غیر مخلوق چیز مخلوق کی قید میں نہیں آ سکتی بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی طالب کا دل اور دماغ اور حواس اور سب اعضا تصور سے اسم اللہ ذات کی قید میں آ جاتے ہیں۔ انسان جب جسم کو اسم اللہ کے تصور میں غرق کرتا ہے تو جسم اسم کے اندر گم ہو جاتا ہے۔ چونکہ اسم اللہ ذات پاک اور حق ہے اس واسطے صاحب تصور کے جسم کی تمام ناپاکیاں، غِل، غفلت، غلاظتیں اور تمام کدورتیں، ظلمتیں اور بطالتیں اسم اللہ ذات کے نور سے دفع اور دور ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بار بار مشقِ تصور اسم اللہ ذات سے طالب اسم اللہ ذات کے اصلی حقیقی دروازے پر جو آفتاب کی مانند انسان کے وجود میں مخفی اور پنہاں بطور امانت موجود ہے جا پہنچتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے طالب کو اسم اللہ ذات حقیقی کے

بحرِ انوار میں جذب کر لیتا ہے۔ اگر مرشد کامل، رفیق، راہبر ہمراہ شامل ہے تو اس وقت طالب پختہ وجود صاحبِ استعداد کو ایک ہی توجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ واصل کر دیتا ہے۔ یا دائمی حضوری حضرت سرورِ کائنات صلعم میں داخل کر دیتا ہے۔ مگر ابتدا میں طالب اسم اللہ ذات کو اپنی قید میں لانے اور اسے جلدی اپنے صفحۂ دل پر نقش اور مرقوم دیکھنے کی آرزو اور ہوس نہ کرے۔ جب تک اسم اللہ ذات کے تصور سے طالب کا نفس اور نفسانیت فنا نہ ہو اور اس کے اس بیضۂ ناسوتی کے اندر اسم اللہ ذات کی حرارت اور مرشدِ کامل کی توجہ سے لطیفۂ قلب کا غیر مخلوق مرغِ لاہوتی سر نہ نکالے اسم اللہ ذات دل پر نقش اور قائم و متجلی دیکھنے کے خیال اور ہوس کو ہرگز دل میں نہ لائے اور اپنا کام دن رات خوب زور شور سے جاری رکھے اور نیز مراقبے، مکاشفے، طیر سیر علوی، کشف کرامات یا دیگر روحانی نظارے اور باطنی تماشوں اور کرشموں کے خیال میں بچوں کی طرح نہ پڑا رہے۔ بلکہ ہمت اور استقلال سے ہر وقت اسم اللہ ذات کے نقش کو دل اور دماغ میں اس طرح جمائے کہ آفتاب اسم اللہ ذات کی حرارت اور نور سے طالب کے وجود سے غفلتِ نفسانی، ظلمتِ شیطانی اور کدورتِ خیالاتِ دنیا پریشانی ہٹ کر دور اور کافور ہو جائے۔

جس وقت تصور اسم اللہ ذات صاحبِ تصور کے وجود میں اثر کرنے لگتا ہے تو اول اول طالب کے اندر ایک قسم کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے جس سے طالب کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تپ لازمی کی حرارت اور تپش جسم میں پیدا ہو گئی ہے۔ رات کو اسے نیند نہیں آتی۔ خصوصاً بائیں پہلو پر لیٹنے سے اسے درد محسوس ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں طالب کو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ یہ ابدی سرمدی صحتِ کلی کے آثار ہیں۔ ایسے وقت میں طالب کے دل میں ترک توکل کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ لوگوں سے وحشت پیدا ہوتی ہے۔ یہ خیال آتا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر بیوی کو طلاق دیکر جنگل کو نکل جائے اور گودڑی پہن کر فقیر بن جائے۔ لیکن خبردار زنہار ایسا کام نہ کرے جب تک اسے باطن میں صحیح طور پر یا اسے مرشدِ کامل کی طرف سے ایسی باتوں کا اذن اور امر نہ ہو۔ بلکہ فقراءِ محمدی ﷺ کا طریقہ اور طرز یہ ہے کہ لوگوں میں ملا جلا رہے اور اپنے راز کو پوشیدہ رکھے اور گمنامی کو اپنا شیوہ بنائے رکھے۔ ہرگز ننگا اور انگشت نما اپنے آپ کو نہ ہونے دے۔ کیونکہ بعض وقت طالب کے دل میں محض عارضی اور تقلیدی

طور پر کچھ تھوڑے عرصے کے لیے ترک توکل اور گھر بار چھوڑنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جب بیوی کو طلاق دے کر اور بال بچے اور گھر بار چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل جاتا ہے اور گودڑی پہن کر فقیر تارک الدنیا ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس قسم کے خام خیال جلد باز، تقلیدی، رسمی، مبتدی طالب کو باطنی راستہ بھی نہیں کھلتا بلکہ ابتدا میں بطور آزمائش سخت ٹھوکریں کھاتا ہے اور جب اسے بھوک پیاس اور راہ میں طرح طرح کی تکالیف پیش آتی ہیں تو اس کے عارضی تقلیدی ترک توکل کا نشہ تھوڑے عرصے میں ہرن ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے نفس کو پشیمانی لاحق ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ لوگوں میں فقیر تاریک الدنیا مشہور ہو جاتا ہے اس لیے واپس اسے لوگوں میں شامل ہونے اور دنیوی کام کرنے سے شرم آتی ہے۔ لہٰذا وہ ایک سخت کشمکش اور تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کا رہتا ہے اور نہ گھاٹ کا۔ ایسے رنج اور رجعت کی حالت سے اللہ تعالیٰ امان دیوے۔ اس لیے مبتدی طالب کو اپنے خیالِ خام سے بیوی بال بچوں کو چھوڑ کر جنگل کی طرف ہرگز نہیں نکلنا چاہیے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے:

## ابیات

اک شخص چلا گھر سے نکل کر سوئے صحرا
مولا کی طلب میں زن و فرزند کو چھوڑا

سمجھا زن و فرزند ہی ہیں مانعِ دیدار
ہے منزلِ مقصود میں حائل یہی دیوار

صحرا میں سمندر میں اسے ڈھونڈ رہا تھا
ہر بحر میں ہر بر میں اسے ڈھونڈ رہا تھا

کھویا گیا خود آپ مگر اس کو نہ پایا
سب کھو کے بھی بیچارے کو کچھ ہاتھ نہ آیا

مایوسی سے دل ٹوٹ گیا پاؤں کی مانند
ڈھلتی رہی عمر اس کی یونہی چھاؤں کی مانند

بیچارے پہ جس وقت گھٹا موت کی چھائی
اس وقت کسی کی یہ صدا کانوں میں آئی

اے طالبِ حق! حق تو ترے گھر میں مکیں تھا
جس جا سے تو نکلا تھا ارے میں تو وہیں تھا

(میر حسنؔ)

لہٰذا طالب کو اپنی حالت ہرگز اپنے وہم و خیال سے نہیں بدلنی چاہیے۔ بلکہ اسے انتظار کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود اس کے لیے حالات مساعد اور واقعات سازگار

کر کے بدل ڈالے۔

پس طالب کو چاہیے کہ اسم اللہ ذات کی حرارت سے جب ایسی حالت پیدا ہو جائے اور وحشت ترک و توکل کے خیالات رونما ہو جائیں تو اسم **مُحَمَّد** ﷺ کے تصور یا درود شریف کی کثرت سے اس جلالیت اور حرارت کو ٹھنڈا اور فرو کرے کیونکہ اسمِ **مُحَمَّد** ﷺ اسم جمالی ہے۔ اس کی ٹھنڈک اور جمالیت سے طالب کے وجود میں صبر، تحمل اور حوصلۂ وسیع پیدا ہو جاتا ہے اور اسم اللہ ذات کے جلالی بارِ گراں کو ہر طرح برداشت کر لیتا ہے اور بے حوصلہ، بے صبر اور بے قرار نہیں ہوتا۔

بعض وقت تصور اسم اللہ ذات کے غلبۂ حرارت سے ظاہری عبادت میں کوتاہی پیدا ہو جاتی ہے اور ظاہری نوافل اور زبانی ذکر اور بدنی اشغال میں سستی واقع ہو جاتی ہے اور ان کی اہمیت اور وقعت طالب کی نظر میں اس قدر گر جاتی ہے کہ وہ فرض نماز کو بھی ترک کر دیتا ہے۔ سو طالب کو چاہیے کہ ایسی حالت سے بچارہے اور ہرگز فرض نماز اور شریعتِ ظاہری کی پابندی سے باہر نہ نکلے۔ یہ بھی شیطان کا ایک بڑا داؤ اور دھوکا ہے۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں کو ابتدائے تصور میں خواب اور مراقبے کے اندر شیطان بڑے عمدہ تماشے اور باطنی نظارے دکھایا کرتا ہے اور جب وہ ظاہری عبادت اور فرض نماز کی طرف رجوع کرتا ہے تو ان باطنی شیطانی تماشوں میں کمی اور کوتاہی نظر آنے لگتی ہے۔ لہٰذا طالب خام خیال شیطان کے دام میں پھنس کر فرض نماز اور شریعت کی پابندی چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح وہ ہمیشہ کے لیے طریقے کا مردود اور مرتد ہو جاتا ہے۔ ہزاروں طالبوں کو اس قسم کی گمراہیوں اور رجعتوں میں دیکھا گیا ہے۔ جو ایک دفعہ ان طریقت کے گردابوں میں غرق ہو جاتا ہے پھر ساری عمر ساحلِ نجات کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار[1]

(سعدیؒ)

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ طالب جب تصور اسم اللہ ذات کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے

---

[1] اس بھنور میں بہت سی کشتیاں ڈوب گئیں جن کا ایک تختہ بھی کنارے تک نہ لگا۔

کہ گویا کسی شکنجے میں سب اعضا کسے جا رہے ہیں یا کولھو میں بھینچا جا رہا ہے اور شغل کے بعد وجود کو سخت کوفت اور ماندگی معلوم ہوتی ہے۔ بدن گھائل اور مضمحل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسی حالت پیش آئے تو طالب کو ظاہری عبادت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اسی طرح ظاہر باطن دونوں طرح طالب کسی طرح نفس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے فارغ نہ رکھے۔ کیونکہ نفس کی مخالفت ذکر اللہ ہے۔

گاہے مبتدی طالبوں کو اس قسم کے خیالات و واہمات ترک توکل اور فقیری کی طرف لے آتے ہیں کہ جب میں فقر میں قدم رکھوں گا تو مجھے دولتِ دنیا ظاہری کی پرواہ نہ رہے گی کیونکہ میں اس طرف قدم رکھتے ہی خدا کا مقرب اور ولی بن جاؤں گا۔ مجھے غیب سے روزی ملے گی۔ جن اور فرشتے میرے تابع فرمان ہو جائیں گے اور جو کچھ ان سے مانگوں گا مجھے لا کر دے جائیں گے۔ میرا روزینہ مقرر ہو جائے گا یا میرا دستِ غیب جاری ہو جائے گا یا مجھے زمین کے نیچے خزانے اور دفینے نظر آنے لگ جائیں گے یا کیمیا اکسیر کے نسخے حاصل ہو جائیں گے یا سنگِ پارس مل جائے گا۔ غرض اس قسم کے ہزاروں فضول واہمات اور خیالات طالب کے دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ شیطان اس قسم کے خیالی سبز باغ دکھا دکھا کر طالب کو ظاہری کسب کمائی اور روزگار چھڑا کر فقیر بنا دیتا ہے۔ بعض خام خیال طالب نوکریوں سے استعفے دے دیتے ہیں۔ بعض اپنی جائدادیں فروخت کر کے لٹوا دیتے ہیں۔ ایسے طالبوں کی نیت چونکہ خالص نہیں ہوتی اس لیے جب کچھ مدت پھر ان چیزوں میں سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا تو پھر پھرا کر اپنا سا منہ لے کر واپس آتے ہیں اور تمام عمر افسوس اور ندامت کی وجہ سے دستِ حسرت ملتے رہتے ہیں۔ ایسے خام خیال طالب جب ناقص دکان دار جھوٹے پیروں کے ہاتھ چڑھتے ہیں تو وہ اس قسم کے اور سبز باغ دکھا کر اور جھوٹے وعدے دلا کر انہیں لوٹتے رہتے ہیں اور اپنی خدمت میں لگائے رکھتے ہیں۔ اور امروز و فردا کے جھوٹے وعدوں میں ان کی عمر گراں مایہ ضائع اور برباد کر دیتے ہیں۔ بعض طالب جب ان دکاندار مکار پیروں کو وعدہ ایفائی کے لیے بار بار تنگ کرتے ہیں تو جھوٹے پیر ایسے طالبوں کو چلوں، خلوتوں اور مجاہدوں میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ اکثر طالب تو ان چلوں میں پاگل ہو جاتے ہیں، بعض بیمار ہو جاتے ہیں اور بعض بے فائدہ ٹکریں مار مار کر کسی طرف

منہ کر جاتے ہیں اور یوں پیر صاحب ان سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ سو طالب کو ان خام خیالیوں اور بے ہودہ مالیخولیا سے بچنا چاہیے۔

مشقِ تصورِ اسم اللہ ذات ذکر کے تمام طریقوں سے بہتر، افضل، آسان اور پر امن طریقہ ہے۔ موت کے وقت انسان کی زبان خشک ہو جاتی ہے اور باقی تمام اعضا اور حواس کام سے رہ جاتے ہیں۔ اس وقت ذکر کے لیے انسان کے پاس صرف تصور اور تفکر کا آلہ باقی رہ جاتا ہے۔ اگر زندگی میں طالب نے تصور اور تفکر سے اسم اللہ ذات کی مشق کی ہے اور اسم اللہ ذات کو اپنے اندر قائم کیا ہے اور اپنے وجود کو اسم اللہ ذات میں طے اور دل کو اسم اللہ ذات سے زندہ کیا ہے تو موت کے آخری نازک وقت میں اسے اپنے اس مبارک شغل کی قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی۔ جب کہ تصور اسم اللہ ذات کی باطنی برق سے اس کے تمام باطنی لطائف اور گوشت پوست، تمام اعضاء اور جسم کے تمام بال ذکر سے گویا ہو جائیں گے اور جوش و خروش میں آکر اللہ اللہ پکارنے لگ جائیں گے۔ اور تمام جسم باجے کی طرح ذکر اللہ سے بجنے لگ جائے گا اور جسم کے ہر رگ و ریشے سے باجوں کی تاروں کی طرح ذکر اللہ کے باطنی نغمے سنائی دیں گے۔ ایسے آدمی کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا ہے کیونکہ موت کے وقت شیطان ایسے آدمی کے نزدیک نہیں پھٹک سکتا۔ صاحب تصور اسم اللہ ذات کو جس وقت منکر نکیر قبر میں سوال و جواب کے لیے جگا کر اٹھاتے ہیں۔ جس وقت صاحب تصور قبر میں اٹھتا ہے تو اس کے ماتھے، اس کے سینے اور اس کی دونوں ہتھیلیوں پر اسم اللہ ذات نوری حروف سے مرقوم سورج کی طرح شعلے اور تجلے مارتا ہے اور کراماً کاتبین یہ دیکھ کر حیرت میں آجاتے ہیں اور ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یَاعَبْدَاللّٰہِ نَمْ کَنَوْمَۃِ الْعَرُوْسِ جَزَاکَ اللّٰہُ فِی الدَّارَیْنِ خَیْرًا (مشکوٰۃ)۔ یعنی اے بندۂ خدا تو سو جا جس طرح دلہن سوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے تجھے سوال اور جواب کی حاجت نہیں رہی۔ تیرا وجودِ مسعود خود گواہی دے رہا ہے۔ آفرین تیری ہمت پر اور شاباش تیری کمائی پر تیرے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا صبغۃ اللہ یعنی اسم اللہ ذات کے رنگ سے رنگین ہیں۔ ہمیں تجھ سے سوال کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ اب تو اپنے خاوند اللہ تعالیٰ کے دیدار اور وصل کے انتظار میں دلہن کی سی نیند سو جا۔

بیٹھ جاؤں میں انہیں چھاپ کے یوں حشر کے دن
لوگ دیکھیں تو کہیں وعدہ وفا ہوتا ہے

انسان کا عنصری جثہ غار کی طرح ہے اور نفس و شیطان یعنی سانپ کی طرح اس میں گھسے ہوئے ہیں۔ ظاہری بدن اور جسمانی اعضا و جوارح سے عبادت، ذکر فکر کرنا گویا سانپ کے غار پر ڈنڈے اور لاٹھیاں چلاتا ہے جس سے غار کے اندر نفس اور شیطان کو کوئی ایذا نہیں پہنچتی بلکہ اسے آگاہی تک بھی نہیں ہوتی۔ مگر تصور اسم اللہ ذات گویا غار کے اندر کھولتا ہوا پانی یا ابلتے ہوئے تیل کی دھار اور رَو داخل کرنا ہے جس سے نفس اور شیطان جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔ اگر جان و مال خرچ کرنے اور سالہا سال محنت اور مشقت کے بعد بھی یہ دولت ہاتھ لگ جائے تو اسے نہایت سستا اور ارزاں سودا خیال کرنا چاہیے۔

پس از سی[۳] سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملکِ سلیمانی

(خاقانی)

ترجمہ: خاقانی کو تیس سال کے بعد اس حقیقت کا علم ہوا کہ ایک دم با خدا رہنا سلیمانؑ کے ملک سے بھی بہتر ہے۔

اس مبارک اور عزیز شغل سے روکنے اور باز رکھنے کے لیے شیطان ہزاروں لاکھوں بکھیڑے اور طرح طرح کے مکر اور حیلے پیش کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ مرشد کامل کی توجہ کے بغیر اسم اللہ ذات قائم نہیں ہونے کا۔ اس لیے کوئی ظاہری بدنی عبادت کرنی چاہیے۔ لیکن یاد رہے کہ مرشد کامل اس طالب کو توجہ کرتا ہے جس کے وجود کا ظرف پختہ، ہمت قوی اور استعداد وسیع ہو۔ سو یہ باتیں سوائے تصور اسم اللہ ذات کے حاصل نہیں ہوتیں۔ تصور اسم اللہ ذات طالب کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور مرشد کے فیض کے قابل بنا دیتا ہے اور تصور اسم اللہ ذات کے ذریعے طالب مرشد کے باطنی دروازے پر پہنچ جاتا ہے اور مرشد کو اس پر مہربان کر دیتا ہے۔ لیکن نفس اور شیطان ہر حیلے سے طالب کو اس مبارک شغل سے باز رکھتے ہیں۔ کیونکہ نفس کے لیے تصور اسم اللہ ذات سمِ قاتل کی طرح ہے۔ اس سے جلدی نفس نامراد مر جاتا ہے۔ جس وقت صاحب تصور اسم اللہ ذات شغلِ تصور اختیار کرتا ہے تو شیطان کے گھر

۱۔ مرشد کی توجہ کے قابل بننے اور استعداد کے حصول کیلئے تصور اسم اللہ

کو گویا آگ لگ جاتی ہے اور شیطان الانس والجن میں ایک کہرام مچ جاتا ہے اور جنودِ ابلیس فوج در فوج مقابلے کے لیے بھیجے جاتے ہیں جو اسے کسی طرح اس شغل سے باز رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب صاحب تصور پے بہ پے مقامات طے کرتا ہوا اللہ تعالیٰ کے قرب میں داخل ہونے کو ہوتا ہے تو خود بہ نفسِ خبیث مقابلے کے لیے آموجود ہوتا ہے۔ سوائے طالب سعادت مند! حوصلہ وسیع اور ہمت بلند رکھ۔ اپنی تمام عمر اس مبارک شغل میں وقف کر دے۔ کسی طرح اس پاک شغل کو ایک لمحہ کے لیے بھی ترک نہ کر۔ انشاء اللہ بہت جلد تو یہ کلیدِ خزائنِ دارین اور مفتاحِ کنزِ کونین حاصل کرے گا۔

مبتدی صاحب تصور چونکہ مشق وجود یہ کے وقت نہایت شش و پنج میں ہوتا ہے کہ تصورِ اسم اللہ دل اور دماغ اور وجود کے دیگر اعضا پر کیوں کر کیا جائے اور کس طرح اور کیوں کر اسم اللہ ذات کے نقش کو اپنے اندر مرقوم کرے۔ آیا اپنے آپ کو علیحدہ انسان کی شکل میں اپنے سامنے لا کر کھڑا کیا جاوے اور خیال اور فکر سے اس کے دل اور دماغ اور سینے اور دیگر اعضا پر اسم اللہ ذات کے نقش کو مرقوم کرے۔ یا دوسرے شخص کو اپنے اعضا پر لکھنے والا خیال کرے یا خود اپنے وجود پر کیوں کر اور کس طرف سے اسم اللہ تحریر اور نقش کرے۔ یہ باتیں چونکہ نہایت ضروری ہیں اور کتابوں میں نہیں ملتیں اس لیے ہم اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر چند اہم اور آسان طریقے بیان کرتے ہیں۔ اگر صاحب مشق اور صاحب تصور نے ان پر عمل کیا تو انہیں اسم اللہ ذات کے نقش اور مرقوم کرنے میں بہت مدد ملے گی اور بہت جلدی اس مبارک شغل میں کامیاب ہو جائے گا۔ تصور اسم اللہ ذات کے متعلق یہ نہایت سچی، مفید اور قیمتی معلومات ہیں۔ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہ مدت مدید اور سالہا سال کی جانفشانی اور جانکاہی کے بعد حاصل کیے گئے ہیں۔

صاحب تصور اسم اللہ ذات کو چاہیے کہ وضو کر کے اور پاک کپڑے پہن کر کسی پاک جگہ میں مربع ہو کر بیٹھے اور دل کو تمام غیر خیالات یعنی دنیوی تفکرات اور نفسانی واہمات سے خالی اور فارغ کر لیوے اور ظاہری وساوسِ شیطانی اور خطراتِ نفسانی کا راستہ بند کرنے کے لیے اپنے اوپر ذیل کا حصار کرے۔ یعنی مفصلہ ذیل کلاموں کو پڑھ کر اپنے اوپر دم کرے۔

الحمد شریف، آیت الکرسی، چہار قل قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ٥، قُلْ ھُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ٥،

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ٥ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ٥۔ ہر ایک سورت کو تین تین دفعہ پڑھے اس کے بعد درود شریف، استغفار، آیت سلام " قَوْلاً مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِيْمِ ۔ آیت وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۔ کلمۂ تمجید یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۔ کلمہ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِىْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ " اور کلمۂ طیب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ ہر ایک تین بار پڑھ کر سینے پر دم کرے اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر دم کر کے تمام بدن پر ہاتھ پھیرے۔ اس کے بعد آنکھیں بند کر کے اللہ تعالیٰ کے مشاہدے اور مجلس حضرت سرورِ کائنات ﷺ و مجلسِ انبیا، اولیا اور یادِ موت اور یادِ آخرت و قبر حشر نشر وغیرہ تفکرات کو دل میں جاگزیں کرے۔ اور اسم اللہ ذات کو ماتھے پر اور دل پر۔ اسم **محمد** ﷺ کو تفکر کی انگشتِ شہادت سے خیال کے ذریعے اپنے سینے پر بار بار لکھنے کی کوشش کرے اور اگر کسی کا نفس سرکش ہو اور معصیت سے باز نہ آئے تو اسم اللہ ذات کو تصور سے مقامِ ناف پر مرقوم اور تحریر کرے۔ صاحب تصور اپنی انگشت شہادت کو قلم خیال کرے اور اپنے سامنے آفتاب کو بمنزلہ دوات کے خیال کرے اور اپنی انگلی کو آفتاب کی دوات میں ڈال کر اپنے ماتھے پر اسم اللہ ذات اسطرح لکھے کہ سر کو ایک بڑی قندیل اور لالٹین خیال کرے اور اس کے اندر بیٹھ کر اپنے سامنے والے شیشے کے رخ پر اسم اللہ ذات تحریر کرے۔ اس سے جذب جلالی پیدا ہوگا۔ اور اسم **محمد** ﷺ کو لمبا کر کے سینے پر لکھے اس طرح کہ اسم **محمد** ﷺ کے دونوں میم پستانوں پر آجائیں اور حرف دال دل پر آجائے۔ اس سے جذبِ جمالی حاصل ہوگا اور اسم **محمد** ﷺ کو سفید ماہتابی رنگ سے لکھے یا ان دونوں مذکورہ بالا مقامات یعنی ماتھے اور سینے پر اگر اسم اللہ ذات اور اسمِ محمد سرورِ کائنات ﷺ از سرِ نو لکھنے میں دشواری محسوس ہو تو اسم اللہ ذات انگشتِ شہادت کی طرح موٹے اور خوشخط سُرخ آفتابی رنگ کے حروف میں مرقوم اپنے ماتھے یا دل پر لکھا ہوا خیال کرے اور خود اسے اپنی شہادت کی انگلی سے ٹریس کرتا جائے۔ یعنی انگلی اس پر قلم کی طرح اپنے خیال اور تصور میں پھیرتا جاوے اور اسی طرح سے اسمِ **محمد** ﷺ کو اپنے سینے پر ماہتابی سفید رنگ سے مرقوم خیال کرے اور اس کے

اوپر انگشت شہادت پھیرنے کی کوشش کرے۔ بعض کو اس دوسری صورت میں آسانی ہوتی ہے اور ساتھ ہی دل سے پاس انفاس جاری رکھے۔ یعنی جب سانس اندر کو جائے تو ساتھ دل میں لفظ اللہ کہے اور جب سانس باہر کو نکلے تو دل میں خیال سے لفظ ھُوْ کہے۔ اور جب اسم **محمد** ﷺ کی مشق کرے تو سانس اندر جاتے وقت مُحَمَّد" رَسُوْلُ اللّٰه کہے اور سانس باہر آتے وقت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ خیال سے دل میں کہے۔ اس طرح بار بار مشق کرنے سے اسم اللہ ذات اور اسمِ محمد سرورِ کائنات صلعم طالب کے اندر متجلی ہو جائے گا اور اگر طالب شیخ کامل رکھتا ہے تو یوں خیال کرے کہ میرے سر اور سینے اور دل کے اندر شیخ بیٹھا ہوا اسم اللہ ذات اور اسمِ حضرت سرورِ کائنات صلعم لکھ رہا ہے۔ اس سے اور بھی زیادہ آسانی ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ پاسِ انفاس بھی جاری رکھے۔ اس طرح طالب بہت جلدی کامیاب ہو جاتا ہے۔ جس وقت طالب کے تصور اور تفکر اور مرشد کامل کی توجہ اور تصرف اور طالب کی کوشش اور مرشد کی کشش اسم اللہ ذات اور اسم حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر مرکوز اور متحد ہو جاتی ہیں تو اس سے یا تو نور اور برقِ جلال پیدا ہو کر طالب کو باطن میں غرق اور بے خود کر دیتی ہے۔ اس وقت باطنی واردات یاد نہیں رہتیں۔ اور اگر اسے جذبِ جمالی کی بجلی نے کھینچ لیا ہے تو اس کو باطنی واردات خواب یا مراقبے میں یاد رہتی ہیں۔ اس وقت مجلسِ انبیا و اولیا اور ذکر اذکار کھل جاتے ہیں اور طالب مجلسِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں یا مجلسِ انبیا و اولیا میں حاضر ہو جاتا ہے۔ یا ذکرِ نفسی، قلبی، روحی، سری وغیرہ جاری ہو جاتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ ذاتی، صفاتی یا افعالی صاحبِ تصور پر وارد ہو جاتی ہیں۔ یا طالب کو طیر سیر مقاماتِ علوی یا سفلی حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر نقش اسم اللہ ذات اور اسم حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بسبب کثرتِ ہجوم وساوسِ شیطانی و ظلماتِ نفسانی دل پر قائم نہ ہوں، تو طالب کو چاہیے کہ مشقِ وجودیہ شروع کرے۔ تاکہ تمام وجود اسم اللہ ذات سے منقش ہو کر پاک اور مزکی ہو جائے اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور مشاہدۂ حق ذات کے قابل ہو جائے۔ اِسْمُ اللّٰهِ شَیْءٌ "طَاهِرٌ" لَا يَسْتَقِرُّ اِلَّا بِمَكَانٍ طَاهِرٍ ط اسم اللہ پاک چیز ہے۔ وہ پاک جگہ میں قیام اور استقرار پکڑتا ہے۔ شغلِ تصور اسم اللہ ذات کے لیے وقت کا تعین نہیں ہے۔ جس وقت چاہو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سب سے بہتر وقت صبح صادق

سے لیکر طلوع آفتاب یا چاشت تک کا ہے۔

(نقش اسم اللہ ذات اور اسم حضرت سرورِ کائنات صلعم اگلے صفحہ پر مرقوم ہے)

صاحب تصور کو چاہیے کہ دماغ میں نقش اسم اللہ ذات تصور اور تفکر سے مرقوم کرتے وقت دماغ کو ایک مربع قندیل یا لال ٹین کی طرح خیال کرے کہ گویا اس کے چاروں طرف اور اوپر کے شیشے ظلمت کے سیاہ دھوئیں سے آلودہ ہیں۔ اور صاحب تصور اندر بیٹھ کر سامنے والے شیشے پر شہادت کی انگلی سے نقش اسم اللہ ذات یوں بنا رہا ہے کہ اس کی انگلی کی تحریر سے سیاہی دور ہوتی جارہی ہے اور اسم اللہ ذات کی تحریر سے بیرونی روشنی کے لیے راستہ اور روزن بنتا جارہا ہے۔ اور اسم اللہ ذات تاباں اور نمایاں ہو رہا ہے۔ اسی طرح یہی تحریر دائیں، بائیں، پیچھے اور اوپر والے شیشے پر کرے۔ اسی طرح دماغ نور اسم اللہ ذات سے منور ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ مبتدی کو آنکھوں میں تصور اسم اللہ ذات مشق کرتے وقت حیرانی ہوتی ہے۔ کہ آنکھوں میں اسم اللہ کیونکر مرقوم ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی آنکھوں کو عینک کے دو گول شیشوں کی طرح خیال کر کے اندر کی طرف سے ان پر اسم اللہ ذات نقش اور مرقوم کرے۔ اور علیٰ ہٰذ القیاس بدن کے ہر عضو اور خانے پر اندر کی طرف سے اسم اللہ ذات فکر اور خیال کے قلم سے تحریر کرے۔ نیز یاد رہے کہ دماغ میں اسم اللہ ذات مرقوم کرنے کے پانچ مقام ہیں۔ اور ماتھے پر اور ہر دو آنکھوں پر اور دونوں کانوں پر اور ایک ناک پر اور ایک زبان پر اسم اللہ ذات تصور سے مرقوم کرے۔ اور دل پر اسم اللہ ذات تحریر کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ دل کو لیمپ کی چمنی کی طرح اپنے بائیں پہلو پر لٹکا ہوا خیال کرے اور اس کی سطح پر اسم اللہ ذات اور اسم حضرت سرورِ کائنات صلعم خیال اور فکر سے تحریر کرے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا نقشے میں مرقوم ہے۔ اور بعض اس طرح دل پر تصور اسم اللہ ذات مرقوم اور تحریر کرتے ہیں کہ دل کے موٹے سرے پر چمنی کی طرح گول سوراخ کو گول دائرہ خیال کر کے اس میں اسمِ اللہ مرقوم کرتے ہیں۔ یعنی دل صنوبری کو ایک گلاب کے نیم شگفتہ پھول کی طرح تصور کر کے اس کے گول کشادہ منہ کے دائرے میں اسم اللہ ذات مرقوم کرتے ہیں۔ جب اسم اللہ ذات دل پر مرقوم ہو جاتا ہے تو دل کا لطیفہ گلِ گلاب کی طرح کھل جاتا ہے جس سے

سات نوری لطیفے سات نوری پتیوں کی طرح سرخ رنگ معطر و معنبر دل کے اردگرد نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور ہر لطیفۂ نور اسم اللہ ذات کی سات ذاتی صفات کے انوار سے جگمگا اٹھتا ہے۔ دل کے دائرے پر اسم مرقوم اور مثلِ گلِ گلاب شگفتہ مع اردگرد سات لطائف مرقوم باسم اللہ کا نقشہ مندرجہ ذیل ہے:
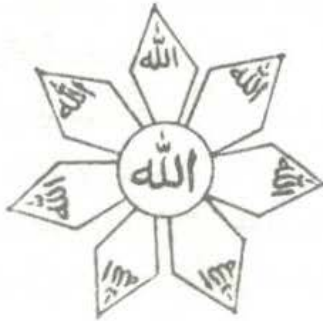
اسم اللہ ذات جب کسی عضو پر مرقوم ہو جاتا ہے تو اُس سے نور کی تجلی نمودار ہو جاتی ہے اور وہ مقام جس کا وہ لطیفہ ہے ذکر اللہ یا کلمۂ طیب سے گویا ہو جاتا ہے اور وہ عضو نورِ اسم اللہ ذات میں ملے اور اس کے اندر لطیفۂ ذکر اللہ سے حی اور زندہ ہو جاتا ہے۔

نیز طالب ہاتھ کی دو ہتھیلیوں پر اور ہر دو پہلوؤں پر اسم اللہ مرقوم کرے اور مقامِ ناف پر اسم اللہ مرقوم کرے۔ طالب کو چاہیے کہ اپنے عنصری جسم کو لباس خیال کرے جسے روح اور جان سر سے لے کر قدم تک اوڑھے ہوئے ہے اور اندر سے اُس لباس کے مقاماتِ تصور پر گویا اِسم اللہ ذات کی چھینٹ لگی ہوئی ہے اور طالب اس لباس کے اندر اپنے آپ کو گھسا ہوا اور بیٹھا ہوا خیال کرے۔ اور ہر مقامِ تصوّر پر اندر سے اسم اللہ ذات مرقوم پر انگشتِ شہادت پھیرنے کی مشق کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲: ۱۵۲) یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ سو ہم اس آیت کی تشریح اور تفسیر پہلے کافی بیان کر چکے ہیں کہ جب ہم اللہ تعالیٰ کو جس صفت اور جس اندام سے یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُسی اندام اور عضو کے اندر اپنے اسی نام کے نور کی بجلی پہنچاتا ہے اور وہ عضو اور اندام اللہ تعالیٰ کے نور سے زندہ روشن اور منور ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ

یَتَقَرَّبُ الْعَبْدُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَکُوْنَ عَیْنَیْهِ یَنْظُرُبِیْ وَاُذُنَیْهِ یَسْمَعُ بِیْ وَیَدَیْهِ یَبْطِشُ بِیْ وَرِجْلَیْهِ یَمْشِیْ بِیْ الخ یعنی "بندہ میری طرف کثرتِ ذکر اور نوافل سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں اس کے کان ہو جاتا ہوں وہ مجھ سے سنتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ ہو جاتا ہوں وہ مجھ سے پکڑتا اور چلتا ہے۔" غرض اللہ تعالیٰ کا اپنے ذاکر اور عابد بندے کے اعضا اور اندام ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ عارف سالک کے تمام اندام پر اللہ تعالیٰ کے اسما نوری حروف سے مرقوم ہو جاتے ہیں اور اس کے تمام اعضا اور دماغ نور اسم اللہ ذات سے زندہ اور منور ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ذیل کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے۔ (نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

نقش اسم اللہ ذات اگر جسم کے ہر اندام پر مرقوم کرنے میں دقت ہو تو جس مقام پر آسانی سے مرقوم ہو اور جو اسم کامیابی کے ساتھ اور سہل طریقے سے لکھا جا سکے پہلے اسی کی مشق کی جائے اور آنکھیں بند کر کے جس جگہ ہو سکے صرف اسم اللہ ذات کی تحریر اور اس کے نقش پر اپنی توجہ اور فکر مبذول رکھے۔ اسم اللہ ذات جس وقت صاحب تصور کے اندر نوری حروف سے مرقوم ہو جاتا ہے تو وہ خود بخود اپنے مخصوص مقامِ جسم کو پکڑ لیتا ہے۔ نیز یاد رہے کہ اگر کسی طالب کی طبیعت کند اور غبی ہو اور اسم اللہ ذات کا تصور اس سے نہ بن سکے تو مقابلہ کے لیے ایک اسم اللہ ذات خوشخط تاباں شیشے یا کاغذ پر لکھا ہوا سامنے رکھے اور تصور کرتے وقت اُسے اپنے اندر قائم کرے اور دوسرے وقتوں میں اِسی اسم اللہ ذات کا خیال اور تصور کیا کرے۔ اِسی طرح بار بار کرنے سے نقش اسم اللہ قائم ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے زیادہ آسانی مطلوب ہو تو سلیٹ پر موٹی پنسل یا چاک کے ذریعے رات کو یا دن کو فرصت کے وقت بار بار اسم اللہ لکھے۔ کم از کم روزانہ ۶۶ دفعہ لکھے۔ اس طرح بھی تصور اسم اللہ ذات جلدی آ جاتا ہے۔ رات کو یا دن کو سونے سے پہلے ضرور تصور اسم اللہ ذات کی مشق کرے یا نقش اسم اللہ ذات کاغذ یا شیشے پر خوشخط لکھا ہوا اپنے سامنے رکھ کر سوتے وقت اُس کی طرف دیکھے اور بار بار اسے اندر جمانے کی کوشش کرے اور اس حالت میں سو جائے۔ ایسا کرنے سے خواب میں بھی اسم اللہ متجلی اور مرقوم ہوتا ہے۔

الحمد للہ کہ ادا دا الفقیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اللہ
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
اللہ
مرقوم
توجہ
تفکر
اللہ
تصور
عین بین
مرقوم
توجہ
تفکر
اللہ
تصور
عین بین
عَالِمُ الْغَیْبِ
وَالشَّہَادَۃِ
ہُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْم
اللہ اللہ
لہ ہو الحق
یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ
محمد
یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ
فقر
للہ
لہ
اللہ
اللہ
اللہ
اللہ
اللہ
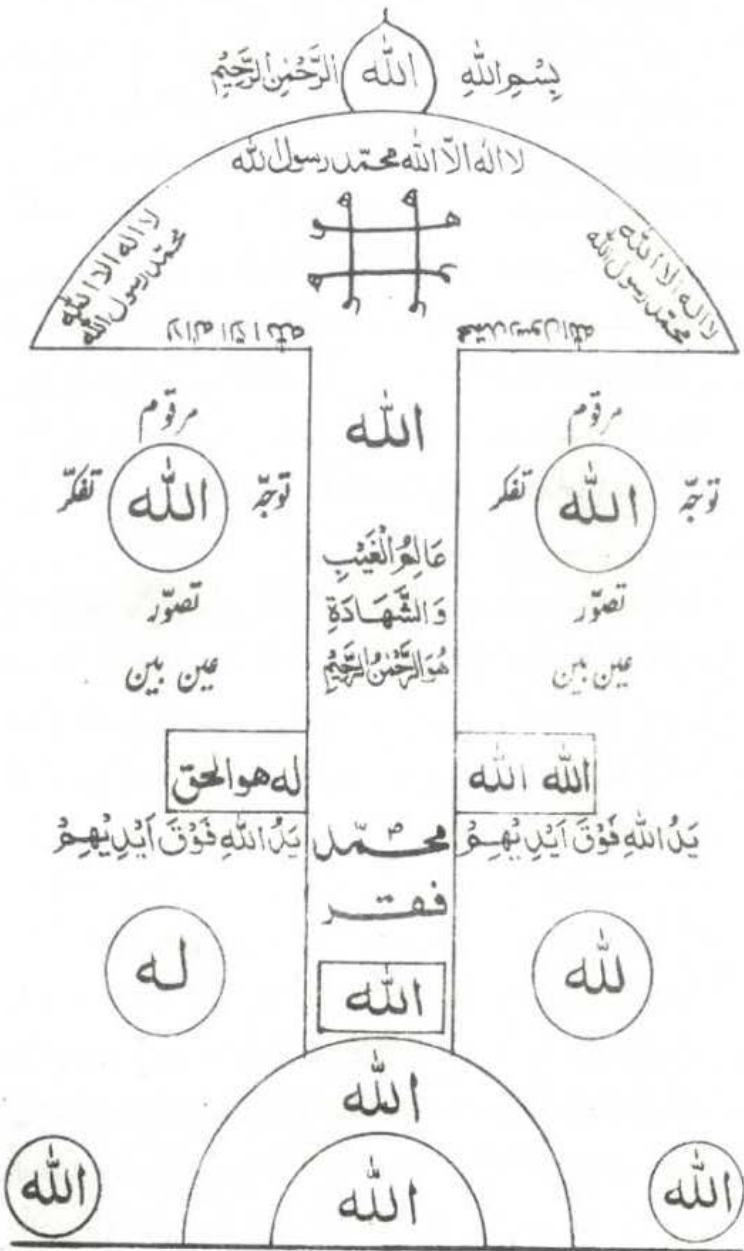
تصور کے لیے سات اسما ہیں کہ جو ہفت گنج باطنی کے لیے بمنزلہ کلید اور کنجیوں کے ہیں اور سات لطیفوں کے لیے ہر اسم علیحدہ علیحدہ ہے۔ وہ اسما ذیل ہیں:

اللّٰہ (۱)، لِلّٰہ (۲)، لَہٗ (۳)، ھُوْ (۴)، مُحَمَّد ﷺ (۵)، فقر (۶)، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صلعم، اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) اسماء اور حروفِ تہجی کے تیس حرفوں کا بھی تصور کیا جاتا ہے اور ان کے علاوہ مختلف نقشِ وجودیہ مرقوم ہیں۔ جن کا تحریر کرنا موجبِ طوالت ہے۔ ان کے تصور سے بھی بڑے بھاری باطنی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر طالب کو ان باطنی خزائن کی تفصیل درکار ہو تو کتاب ''نور الہدیٰ'' یا ''عقلِ بیدار'' شریف اُردو مصنفہ حضرت سلطان العارفین حضرت سلطان باھو قدس سرہ منگوا کر مطالعہ کرے۔

(اِسم اللہ ذات کے صحیح طور پر تصور کے ذریعے نقش اور مرقوم ہونے کی علامت یہ ہے کہ اسم اللہ ذات مرقوم ہو کر آفتاب کی طرح تجلی مارتا ہے اور صاحبِ تصور کو فوراً استغراق اور محویت حاصل ہو جاتی ہے) اور دل، روح یا سر کا لطیفہ ذکر اللہ یا ذکر کلمۂ طیب سے گویا ہو جاتا ہے اور طالب کو اس استغراق کے اندر کوئی نہ کوئی مشاہدہ اور مکاشفہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اے طالبِ سعادتمند! ہم نے تصور اسم اللہ ذات کے یہ مذکورہ بالا چند نہایت مفید آسان پُر امن، صحیح اور سچے طریقے اور راستے بیان کر دیئے ہیں جو مدت مدید کے خونِ جگر پینے کے بعد حاصل اور معلوم کیے گئے ہیں۔ اگر تُو نے ان کی قدر جانی اور ان پر عمل کیا تو یقیناً بہت جلدی سلوکِ باطنی اور روحانیت کے فلک الافلاک پر پہنچ کر اپنے محبوبِ حقیقی سے واصل ہو جائے گا اور بزم انبیا و اولیا میں داخل ہو کر وہاں ایسی باطنی لذتوں اور روحانی مسرتوں سے لطف اندوز ہو گا جو کبھی نہ آنکھوں نے دیکھی ہیں اور نہ کانوں نے سُنی ہیں اور نہ کسی کے دل پر ان کا خیال گذرا ہے۔

تصور کے فوائد یہ ہیں کہ یہ ایک نہایت پوشیدہ، بے ریا، بے رجعت اور زود اثر طریقۂ ذکر ہے۔ اِس میں نہ کسی وقت یا جائے معین کی ضرورت ہے نہ اس میں وضو یا پاک کپڑوں یا پاک جگہ وغیرہ کی پابندی ہے اور نہ اس میں ذکر کی خاص گنتی اور شمار وغیرہ کی حاجت ہے اور اس کے بغیر باطنی لطائف کا کھلنا محال اور ناممکن ہے اور مقام اور روحانی منزل طالب بغیر تصور کے ہرگز طے نہیں کر سکتا۔ اسلام، ایمان، ایقان، عرفان، قرب، مشاہدہ، وصل، فنا اور

بقا کی جو باطنی منازل اور مدارج ہیں ان سب کے اصول پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غرض و غایت انسان کی توجہ، تصور، تفکر، اور تصرف کو ایک مرکز اور ایک نقطے پر لانا ہے جسے انگریزی زبان میں CONCENTRATION کہتے ہیں۔ مثلاً دیکھو اسلام میں توحید اصل کار ہے اور اسی توحید پر تمام اسلامی افعال اور اعمال کا دار و مدار ہے۔ یعنی متفرق اور مختلف معبودوں کی عبادت سے توجہ ہٹا کر ایک ہی واحد معبود کی طرف انسان مائل اور ملتفت ہو جاتا ہے۔ قولہٗ تعالیٰ: اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (یوسف ۱۲: ۳۹)۔ یعنی "آیا متفرق اور مختلف رب اور معبود بہتر ہیں یا ایک اللہ کی واحد ذات قہار۔" سو انسانی توجہ کو ایک ہی معبودِ برحق کی طرف مبذول کرنے کے لیے اسلام نے ذکر کو ہر فعل اور ہر عمل میں لازمی اور ضروری ٹھہرایا ہے۔ جیسا کہ ہم کتاب کے اگلے حصوں میں بیان کر آئے ہیں اور تمام اذکار کو ایک ہی ذکر اسم اللہ ذات میں جمع کر دیا ہے اور ذکر اسم اللہ ذات کے تمام طریقوں میں سے تصور کا طریقہ انسان کی توجہ کو ایک مرکز پر لانے کے لیے بہترین طریقہ ہے۔ اسی لیے اِس کو اختیار کیا گیا ہے۔ الغرض اگر غور سے دیکھا جائے تو تصور اسم اللہ ذات کا طریقہ اسلام، ایمان، عرفان، ایقان، قرب، مشاہدہ، وصل، فنا اور بقا کے مدارج اور منازل کے حصول کے لیے اصلی، آخری اور جامع کلید ہے یعنی ایک مقصد تو تصور اسم اللہ ذات کا سالک کو عالمِ کثرت سے صرف جملہ وحدت کی طرف لانا ہے۔ دوم مقصد صاحبِ تصور کا علمِ دعوت کے ذریعے طالب کو ظلمتِ کثرت سے نورِ لطافت کی طرف لے جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ (البقرۃ ۲: ۲۵۷)۔ یعنی "اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لے آئے ہیں۔ انہیں عالمِ ظلمت سے نکال کر عالمِ نور کی طرف لے جاتا ہے۔" سو وحدتِ حضور اور لطافتِ نور کے دو اعلیٰ مقامات پر پرواز کرنے کے لیے سالک کے لیے دو لازمی پر و بال ہونے چاہئیں: ایک تصور اسم اللہ ذات دوم دعوات۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد ۹۰: ۹۔ ۱۰)۔ ترجمہ: "آیا نہیں بنائی ہم نے انسان کے لیے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ اور دکھا دیئے ہم نے اُس کو دو راستے۔" سو آنکھوں کا راستہ تو تصور اسم اللہ

ذات کا راستہ ہے۔ اور زبان اور دو لبوں یا ہونٹوں کا راستہ ورد وظائف یعنی دعوات کا راستہ ہے۔ جس سے سالک عالمِ کثیف کی ظلمت سے نکل کر عالمِ لطیف کی نورانی دنیا میں داخل ہوتا ہے اور عالمِ غیب کی نورانی لطیف مخلوق سے مل کر ان سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔ سو نور اور آنکھیں جس طرح لازم اور ملزوم ہیں یعنی اگر نور اور روشنی موجود نہ ہو تو آنکھوں کے سامنے دنیا تاریک ہے۔ سو اِسی طرح تصورِ اسم اللہ ذات اور دعوات کے دونوں راستے اور طریقے لازم اور ملزوم ہیں اور عارف سالک کے لیے بمنزلہ پر و بال کے ہیں۔ تصورِ اسم اللہ ذات کا طریقہ تو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اب ناظرین اور سالکین کے لیے دوسرا اہم راستہ دعوات کا بیان کرنے والے ہیں۔

..........................O..........................

# علمِ دعوات

دُعا اور دعوت کے معنی ہیں دعا کرنے یا کسی کو بلانے کے۔ دعا یا کلام کے ذریعے جب غیب کی باطنی لطیف نوری مخلوق کو بلایا جائے اور اُسے اپنے پاس حاضر کر کے اس سے استمداد اور اعانت حاصل کی جائے اور ان کے ذریعے دینی اور دنیوی امور، مشکلات اور مہمات حل کیے جائیں اس کو دعوت کہتے ہیں۔ تمام دعوتوں اور دعاؤں کا اصل مرجع اور معاد اللہ تعالیٰ مجیب الدعوات کا اعلیٰ دربار اور عالی سرکار ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط (المؤمن ۴۰: ۶۰)۔ یعنی تم مجھ سے دعا مانگو۔ میں اُسے قبول کروں گا۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ط اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ○ (البقرۃ ۲: ۱۸۶) ۔ ترجمہ: ''یعنی اے میرے رسول ﷺ! جب میرے بندے تجھ سے میری بابت سوال کریں تو انہیں کہہ دو کہ میں اُن کے قریب ہوں اور میں دعا کرنے والے کی دعا کا جواب دیتا ہوں اور اُسے قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگتے ہیں۔ پس چاہیے کہ مجھ سے دعا طلب کریں اور میری قبولیتِ دعا پر ایمان لائیں اور یقین رکھیں۔ شاید وہ ہدایت پالیویں۔'' تیسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۲: ۱۵۲)۔ یعنی ''تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔'' اس میں بھی ایک قسم کی قبولیتِ دعا کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اگر دعا کی جائے تو وہ دُعا کو سنتا ہے اور قبول فرماتا ہے لیکن دُعا کے لیے شرائط اور لوازمات ہیں جس طرح نماز کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ ضروری شرائط اور لوازمات مقرر کیے ہیں مثلاً پاک کپڑے، جائے پاک، تعینِ وقت اور وجودِ پاک اور خاص ترتیب کے ساتھ ہاتھ، منہ، پاؤں وغیرہ کو وضو کر کے دھونا اور پھر نماز کے ہر رکن یعنی قیام، رکوع، قعود اور سجود وغیرہ کو ایک خاص ترتیب سے ادا کرنا اور ان میں مخصوص تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر اور قرأتِ قرآن وغیرہ حسب تعداد پڑھنا یہ سب لوازمات اور شرائط ہیں کہ جب یہ سب شرائط پوری ہوں تو تب نماز مکمل اور قبولیت کے قابل ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ اِسی طرح دعاؤں، کلاموں اور ورد وظائف کے لیے شرائط

اور لوازمات ہیں کہ جب وہ پورے طور پر ادا کیے جا چکتے ہیں تو وہ درجۂ اجابت اور قبولیت کو پہنچ جاتے ہیں ورنہ نہیں۔ دیگر اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے کی دعا یا کوئی عمل یا عبادت قبول فرماتے ہیں تو اُس دعا اور درخواست کی تعمیل اور تکمیل اللہ تعالیٰ خود اپنے ہاتھ سے نہیں فرماتے اور نہ خود دنیا میں اُس بندے کے پاس آکر وہ کام کرتے ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی غیر مخلوق عظیم الشان اور عظیم المرتبت مقدس ذات سے بعید ہے۔ بلکہ اُس کی تعمیل یا عمل درآمد اور داد و دہش یا انعام کا کام اپنی بارگاہ کے باطنی کارکنوں اور ملازموں یعنی ملائکہ اور روحانیوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت مریم علیہ السلام کے حق میں فرماتے ہیں:

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝

(المریم ۱۹: ۱۷-۱۹)۔ "پس ہم نے بی بی مریم علیہ السلام کی طرف اپنی ایک روح بھیجی جو ایک صحیح سالم انسان کی شکل میں اُس کے آگے متمثل ہوئی۔ سو ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر آپ نے ڈر کر فرمایا کہ میں تجھ سے اللہ کے ساتھ پناہ مانگتی ہوں۔ اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے۔ اس پر اس روح نے جواب دیا کہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا قاصد ہوں اور میں اے مریم تجھے بیٹا دینے آیا ہوں۔" اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس چار فرشتے انسانوں کی شکل میں لوط علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کرنے کے لیے آئے تھے اور ساتھ ہی انہیں آخری عمر میں اور یاس کی حالت میں فرزند اسحاقؑ کی بشارت بھی دے دی۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے علمِ لدنی سیکھنے کی آرزو کی تو انہیں اپنے ایک بندے خضر علیہ السلام سے ملایا جن سے اُنہوں نے علم لدنی کے بعض سبق سیکھے۔ كَمَا قَالَ عَزَّهٗ ذِكْرُهٗ: فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝

(الکہف ۱۸: ۶۵)۔ ترجمہ: پس موسیٰ علیہ السلام ہمارے ایک بندے سے ملے جنہیں ہم نے اپنی طرف سے خاص رحمت سے نوازا تھا اور جنہیں اپنی طرف سے غیبی علم عطا کیا تھا۔ غرض باطن میں عارف سالک لوگ اللہ تعالیٰ کے اسما کلاموں اور ورد وظیفوں کے ذریعے جن، ملائکہ اور ارواح کی حاضرات کر کے مختلف کاموں میں مدد لیتے ہیں۔ جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کو جب ملکۂ سبا کے تخت لانے کی ضرورت پڑی تو آپ نے موکلات کے باطنی

لشکر کو خطاب کر کے فرمایا قَالَ یٰٓاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ۝ قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ ۚ وَ اِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (النمل ۲۷: ۳۸ - ۴۰)۔ ترجمہ: ''حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اے میرے لشکریو! تم میں کون ایسا ہے جو ملکۂ سبا کے تخت کو لا کر حاضر کر دے پیشتر اس کے کہ وہ تابع ہو کر میرے پاس آئے۔ اُس وقت عفریت نامی ایک جن نے کہا کہ حضور میں اسے آپ کے اپنی جگہ سے اٹھ جانے سے پہلے لا کر پیش کر دوں گا۔ اور مجھے اس بات کی طاقت حاصل ہے اور میں اس کا ذمہ اٹھاتا ہوں۔ اس پر ایک مصاحب نے جسے علمِ کتاب حاصل تھا کہا کہ میں آپ کے ایک پلک مارنے کے اندر تخت لا دوں گا۔ سو جب سلیمانؑ نے اس وقت تختِ بلقیس کو اپنے پاس موجود دیکھا تو فرمایا یہ سب میرے رب کے فضل کے طفیل ہے۔'' غرض حضرت سلیمان علیہ السلام دنیا میں سید العالمین یعنی عالموں کے سردار ہوئے ہیں اور یہ نعمت خاص اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا اور التجا پر آپ کو مرحمت فرمائی۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ (صٓ ۳۸: ۳۵)۔ ترجمہ: ''سلیمانؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ اے اللہ میرے معاف کر مجھ کو اور مجھے ایسی حکومت اور بادشاہی عنایت فرما جو میرے بعد قیامت تک کسی کو حاصل نہ ہو۔ تو بے شک بڑا وہاب اور بخشش والا ہے۔'' سو اللہ تعالیٰ نے یہ باطنی مملکت انہیں عطا فرمائی کہ جن وانس اور پرندے اُن کے مسخر کر دیئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ۝ (النمل ۲۷: ۱۷)۔ ''اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لیے جن وانس اور پرندوں کے مختلف لشکر مسخر کر دیئے تھے۔ وہ فوج فوج جمع ہو کر اس کے پاس آتے تھے۔'' جن وانس سے باطن میں سیر کرنے والی غیبی مخلوق مراد ہے اور طیر سے باطن میں اڑنے والے مؤکلات مراد ہیں۔ ان سے ہمارے یہ بے زبان حیوان مادی پرندے ہرگز مراد نہیں۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام ان باطنی غیبی لشکروں سے مختلف کام لیتے تھے جس کا ذکر قرآن کریم میں جابجا موجود ہے۔ حضرت سرورِ کائنات صلعم نے ایک

دن اپنے صحابہؓ کو فرمایا کہ رات کو جب میں نماز پڑھ رہا تھا تو میرے پاس ایک جن آیا۔ میں نے چاہا کہ اُسے پکڑ کر ستونِ مسجد سے باندھ لوں تا کہ صبح کو مدینہ کے لڑکے اُس سے کھیلیں۔ لیکن پھر مجھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کا خیال آیا۔ میں نے آپ کی دعا میں مداخلت روا نہ سمجھی۔ آج چونکہ الحاد اور مادیت کا زمانہ ہے اس لیے آج کل کے مادی عقل والوں کے سامنے اس قسم کے باطنی محیر العقول اور خلافِ عادت کارناموں اور روحانی کرشموں کا ذکر اگر کیا جائے تو پہلے وہ اسکا صاف انکار کر دیتے ہیں یا توڑ مروڑ کر انہیں اپنی مادی عقل پر منطبق کرنے کے لیے اس کی سخت ناروا تاویلیں کرتے ہیں۔ اس قسم کے اندھے کورچشم لوگوں کو ہم معذور سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے مادے کے عالمِ اسباب، علت معلول اور شرط و جزا کے بغیر اور کچھ نہیں دیکھا۔ ان کی نظر تمام عمر عالمِ اسباب کی آستین پر پڑتی رہی ہے۔ قدرت کا ہاتھ ان کے مادی حواس سے بالکل اوجھل رہا ہے جسے محسوس اور معلوم کرنا باطنی حواس کا کام ہے نہ کہ ظاہری حواس اور عقل کا۔ عالمِ امر کی غیبی لطیف مخلوق تین قسم کی ہے: ایک جن، دوم ملائکہ یعنی فرشتے، سوم ارواح۔ ان میں سے دو پہلی قسم کی غیبی لطیف مخلوق کا انبیا اور اولیا کے پاس حاضر ہونے کا ثبوت تو ہم نے آیاتِ قرآنی سے دے دیا ہے۔ اب ہم تیسری قسم کی مخلوق یعنی ارواح کے حاضر ہونے کا ثبوت آیاتِ قرآنی سے پیش کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے پہلے پارے اور سورۂ بقر میں موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا ایک قصہ آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کے اندر ایک بڑا آدمی قتل ہو گیا جس کے قاتل کا پتہ نہیں لگتا تھا جس کے سبب قوم میں جھگڑے اور فساد رونما ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اُس وقت لوگوں نے اس معاملے کی تحقیق کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف رجوع کیا کہ آپ اپنی باطنی اور غیبی طاقت سے اصلی قاتل کا پتہ لگا دیویں تا کہ قوم میں جھگڑا اور فساد رونما نہ ہونے پائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کو ایک خاص قسم کی گائے تلاش کرنے کا حکم دیا۔ بہت تلاش اور جستجو کے بعد ویسی گائے مل گئی۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اس گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ ذبح کی گئی تو آپ نے حکم دیا کہ اس کے فلاں عضو کے گوشت کو اس مقتول کے جسم پر مارو۔ جب اس طرح کیا گیا تو مقتول ایک لحظہ کے لیے زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے

قاتل کا نام بتادیا اور اس طرح یہ جھگڑا مٹ گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲: ۷۲۔ ۷۳)۔
ترجمہ: ''اے بنی اسرائیل یاد کرو اس وقت کو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور تم اُس کے قاتل کی نسبت شک میں پڑ گئے تھے تو اللہ تعالیٰ ہی ظاہر کرنے والے ہیں اس معاملے کو جس کو تم نے چھپایا تھا۔ پس ہم نے کہا کہ اس گائے کے بعض حصے کو مقتول کے جسم پر مارو تو وہ جی اُٹھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اس طرح مردہ زندہ کرتے ہیں اور تمہیں اپنی قدرت کے کرشمے دکھاتے ہیں تا کہ تم سمجھ جاؤ۔'' سو اس سے ثابت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے باطنی علم اور روحانی طاقت سے اُس مقتول کی روح کو حاضر کیا اور تمام لوگوں کے سامنے اُس سے ہم کلام ہو کر اُس سے صحیح حالات دریافت کیے۔ ایسی صورت اگر ایک فرد میں صحیح ہو سکتی ہے تو تمام افرادِ انسانی میں بھی صحیح ہونی چاہیے بشرطیکہ کوئی شخص اس غیر معمولی علم کا ماہر ہو اور صحیح طریقے پر روح کی حاضرات کرے تو ضرور روحانی حاضر ہو کر ہم سخن اور ہم کلام ہوتے ہیں اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ یہ تو پیغمبر کا معجزہ تھا کہ وہ مردہ زندہ ہو گیا تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر معجزہ تھا اور حاضراتِ ارواح کا علم نہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام ہاتھ پھیر کر اُسے زندہ کر دیتے۔ ایک خاص قسم کی گائے کو ذبح کرنے اور اُس کے جسم کے خاص حصے کو مقتول کے جسم پر مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ساری ترتیب حاضراتِ ارواح کا طریقہ تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے لیکن اُمتِ مرحومہ کے اندر پیغمبر کی آسمانی کتاب، اس کا علم اور اس کی روحانی طاقت بطور ورثہ موجود ہے اور قیامت تک رہے گی۔ جیسا کہ حضرت سرورِ کائنات صلعم فرما چکے ہیں عُلَمَآءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ کہ میری اُمت کے علما بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح ہوں گے اور ویسی روحانی طاقت رکھیں گے۔ اور یہ بھی آیا ہے کہ اَلْعُلَمَآءُ وَارِثَةُ الْاَنْبِيَآءِ۔ علما انبیا کے وارث ہیں۔ سو یہ وراثت محض مسئلے مسائل اور قیل وقال کی نہیں ہے بلکہ روحانی طاقت اور حال کی بھی ہونی چاہیے۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس زمانہ کے مادہ پرستوں کے دماغ میں یہ بات کیونکر آئے کہ ایسے واقعات صحیح ہیں۔ کیونکہ وہ تو سرے سے

قرآن کے ہی منکر ہیں اور جو برائے نام مانتے ہیں تو ایسی باتوں کی تاویلیں اور توجیہیں نکالنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ آج کل کے مغرب زدہ اور نئی روشنی کے دلدادہ لوگوں کے نزدیک ہر وہ بات جو اہلِ یورپ کے قلم اور زبان سے نکلے وحی آسمانی سے زیادہ وقعت اور صداقت رکھتی ہے۔ اس لیے انہیں روحانی دنیا کی نسبت یقین دلانے اور حاضرات کے باور کرانے کے لیے اگر خود اہلِ یورپ کے مسلمات اور معتقدات پیش کیے جائیں تو انشاء اللہ ان کے لیے زیادہ وقیع اور معتبر ہوگا۔ سو اس جگہ ہم اہلِ یورپ کے آج کل کے روحانی حالات بیان کرتے ہیں۔ ناظرین اس بات سے تعجب تو ضرور کریں گے کہ کُجا مادہ پرست یورپ اور کُجا روحانیت۔ لیکن یہ بات بالکل حقیقت ہے اور اس میں جھوٹ اور مبالغے کا ذرا شمہ تک نہیں کہ اہل یورپ کو روحانی دنیا کا پتہ لگ گیا ہے اور یاجوج ماجوج کی طرح قاف قلب میں سوراخ اور روزن نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اب اس کی تفصیل ذرا غور سے سنیں۔

تقریباً سو سال سے اہلِ یورپ میں حاضراتِ ارواح کا علم جسے انگریزی میں SPIRITUALISM کہتے ہیں شائع اور رائج ہے جس کا وہاں بڑا چرچا ہے۔ اور یہ علم وہاں ایک عالمگیر مذہب کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ امریکہ میں کروڑ ہا آدمی اس نئے مذہب کے معتقد اور پیرو ہیں اور یہ مذہب تمام یورپ میں پھیلا ہوا ہے۔ اور یورپ کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں اس نئے مذہب کی بے شمار روحانی مجلسیں، بڑی بڑی انجمنیں، وسیع پیمانے پر سوسائٹیاں، ہزار ہا لیکچرار اور سینکڑوں عامل یعنی میڈیم موجود نہ ہوں۔ بڑے بڑے ڈاکٹر، کیمسٹس، سائنس دان، فلاسفر اور لارڈ حتیٰ کہ پارلیمنٹ کے ممبر تک اس نئے مذہب کی انجمنوں اور سوسائٹیوں کے خاص ممبر اور جوشیلے کارکن ہیں۔ یورپ میں ایسے روزانہ اخبارات اور ہفتہ وار رسالہ جات بکثرت جاری ہیں جو ان روحانی انجمنوں کے کارنامے شائع کر کے پبلک تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ لنڈن میں ''سائیکک نیوز لنڈن'' ایک بڑا مشہور اخبار ہے جس کی اشاعت بڑی وسیع ہے۔ اور اس قسم کے بے شمار اخبار اس علم کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور وہاں اس علم کے کالج ہیں۔ اس علم کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے اور لنڈن میں برٹش کالج آف سائیکک سائنس لنڈن

(BRITISH COLLEGE OF PSYCHIC SCIENCE LONDON) اس علم کا بہت بڑا کالج ہے۔ ہمارے دین سے برگشتہ مادہ پرست نئے تعلیم یافتہ طبقے کے بے شمار افراد جو دن رات ناولوں کی فرضی عشقیہ کہانیوں کے مطالعہ میں عمرِ گراں مایہ ضائع کر دیتے ہیں اس علم کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے۔ حالانکہ اس علم اور مذہب کی کتابیں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں کی تعداد میں ضرور یورپ کے ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔ جن کا مطالعہ وہ لوگ بڑے شوق سے کرتے ہیں اور اس علم میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی اس علم اور مذہب کی انگریزی کتابیں بہت ہیں لیکن ہمارے نئے روشنی والوں کو ناولوں کے مطالعہ اور سینما کے کھیلوں سے فرصت ہی کہاں ہے کہ وہ علومِ لطیفہ اور فنونِ نفیسہ کے مطالعہ کے لیے وقت نکال سکیں۔ یورپ میں روحوں کو حاضر کرنے کے جو جلسے اور حلقے قائم کیے جاتے ہیں انہیں روحانی جلسے (SPIRITUAL SEANCES) یا روحانی حلقے (SPIRITUAL CIRCLES) یا روحانی نشستیں (SPIRITUAL SITTINGS) کہتے ہیں۔ ان روحانی حلقوں میں ایک عامل یعنی میڈیم (MEDIUM) کا وجود نہایت ضروری ہوتا ہے اور اسی پر سارے حلقے اور جلسے کی کامیابی کا دارو مدار ہوتا ہے۔ میڈیم یا وسیط ایسا شخص ہوا کرتا ہے جس پر فطرتی اور قدرتی طور پر کوئی روح مسلط ہوا کرتی ہے۔ گو آج کل وہاں کالجوں میں اب یہ روحانی قابلیت یعنی میڈیم شپ (MEDIUMSHIP) کسی طور پر بھی حاصل کی جاتی ہے لیکن عموماً میڈیم اور وسیط فطرتی اور پیدائشی ہوا کرتے ہیں۔

ان حلقوں میں تین آدمی میز پر بیٹھتے ہیں جن میں ایک میڈیم ہوتا ہے اور دو اس کے معاون اور مددگار ہوتے ہیں۔ باقی لوگ تماش بین ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ حلقے سینکڑوں تماشائیوں کی موجودگی میں بڑی کامیابی کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان حلقوں میں روحیں آتی جاتی ہیں، بولتی ہیں، شکلیں دکھاتی ہیں، بند مقفل کمروں میں سے بعض چیزیں اٹھا کر باہر لے جاتی ہیں اور بعض بیرونی چیزیں اندر لا کر ڈال دیتی ہیں۔ اندر کا سامان الٹ پلٹ کرتی ہیں۔ ڈھول باجے بجاتی ہیں۔ میڈیم کو بند کمرے سے باہر اٹھا لے جاتی ہیں۔ حاضرین کے جسموں کو چھو کر اپنے حاضر ہونے کا احساس کراتی ہیں۔ دیواروں پر نقوش اور

تحریریں لکھ جاتی ہیں۔ بلکہ آج کل تو یہ علم وہاں اتنی ترقی کر گیا ہے کہ فوٹو گرافی (PHOTOGRAPHY) کے نہایت اعلیٰ سامان اور پلیٹیں پاس رکھ کر روحوں کی فوٹو لی جاتی ہیں۔ ان حلقوں اور جلسوں میں روحیں حاضر ہو کر لیکچر دیتی ہیں ان کی آواز کے ریکارڈ بھرے جاتے ہیں۔ غرض اتنے بے شمار عجیب وغریب کام کیے جاتے ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور مادی عقل اور سائنس ان کی توجیہہ اور تاویل سے عاجز اور قاصر ہے۔

یہاں پر ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہم اس علم کی مختصر ابتدائی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ علم کب، کہاں اور کس طرح شروع ہوا اور یورپ کے الحاد زدہ ملک میں اس کا رواج کیونکر ہو گیا۔ اس علم کا پہلا عجیب وغریب واقعہ امریکہ کے ایک گاؤں ہیڈس فیل میں رونما ہوا جس کی تفصیل یوں ہے کہ اسی گاؤں ہیڈس فیل میں ۱۸۴۶ء کے اندر ایک شخص فیکمان نامی رہتا تھا۔ اس کے گھر میں رات کے وقت لگاتار کھٹ کھٹ کی آوازیں متواتر کئی دن تک سنائی دیتی رہیں۔ اس کے گھر والے ان غیبی اور غیر مرئی آوازوں سے اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ چند ماہ کے بعد انہوں نے اس مکان کو چھوڑ دیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد ایک دوسرا شخص جان فوکس نامی اپنی بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ اس مکان میں مقیم ہوا۔ ان کو بھی اس مکان کے اندر وہی کھٹ کھٹ اور پٹ پٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ انہوں نے جب اس کی اطلاع آس پاس کے لوگوں کو کی تو گاؤں کے لوگ اس خوفناک آواز کی تحقیق کے لیے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ کسی غیبی ہاتھ اور غیر مرئی چیز سے یہ کھٹ کھٹ کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک شخص میڈم فوکس نامی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کام کسی روح کا ہے اور بتایا کہ یہ ایک مسافر مقتول کی روح ہے، جس کا نام شارل ریان تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ چند سال پہلے یہ شخص سفر کرتا اور گھومتا ہوا اس گاؤں میں آ نکلا اور رات کو اس مکان میں ٹھہرا۔ ایک دوسرے شخص نے جو پہلے اس مکان میں ٹھہرا ہوا تھا اس کے مملوکہ مال اور نقدی وغیرہ کی لالچ کے خیال سے اس کو قتل کر دیا۔ جب کھٹ کھٹ کی یہ خبر ہر جگہ مشہور ہو گئی اکثر لوگ اس عجیب واقعہ روحانی کا مذاق اڑانے لگے۔ بعض نے تو کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد جان فوکس بیچارا اپنے بیوی اور بچوں سمیت تنگ آ کر دوسرے شہر رولسٹر نامی میں چلا گیا۔ اس شہر میں بھی یہ خبر پھیلی وہ بے چارہ وہاں کے ملحد اور مادہ پرست

لوگوں کے مذاق کی آماجگاہ بن گیا۔ یورپ کے لوگوں میں ایک ممتاز وصف ہے کہ جب وہ ایک نئی چیز کو دیکھ لیتے ہیں تو اس کی تحقیق و تفتیش میں سب کے سب ہمہ تن محو اور مصروف ہو جاتے ہیں اور اسے معلوم کیے بغیر ہرگز نہیں چھوڑتے۔ جب اس نئے واقعے کی بحث و تمحیص نے رولسٹر میں طول پکڑا تو وہاں کے لوگوں نے واقعہ کی تحقیق کے لیے تین دفعہ علما کی ایک کمیٹی بنا کر بھیجی۔ لیکن کمیٹی کسی صحیح نتیجے پر نہ پہنچی تو لوگوں نے جان فوکس اور کمیٹی ممبروں کو طعن و تشنیع کی آماجگاہ بنا لیا۔ اخبارات کے لیے وہ تمام واقعات سرمایۂ ظرافت بن گئے اور انہوں نے خوب مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ لیکن اس اثنا میں دوسرے مقامات پر اس قسم کے عجیب روحانی واقعات رونما ہونے لگے اور جا بجا تحقیقات شروع ہو گئیں اور جب اس کی صحت ثابت ہو گئی تو صرف چار سال کے اندر اندر یہ مسئلہ تمام ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ پھیل گیا اور ہر جگہ اس کا چرچا ہو گیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس کھٹ کھٹ اور پٹ پٹ سے ٹیلیگراف کا کام لیا اور ہر جگہ روحانی جلسے اور حلقے قائم ہو گئے۔ لوگ میڈیم یعنی وسیط کے ہمراہ ایک بڑی میز کے اردگرد بیٹھ جایا کرتے۔ ایک شخص حروفِ تہجی پڑھتا۔ جب حروفِ مقصود پر پہنچتے اور کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہوتی یا میز کے پائے ہل جاتے تو اس حرف کو لکھ لیتے۔ اس طرح تمام حروف کو ٹیلیگراف کی طرح جس وقت جمع کرتے اور ان کے الفاظ اور فقرے بنا کر دیکھتے تو وہ روح کی ایک معقول بات اور ان کے سوالات کے صحیح جوابات بن جاتے۔ اس طرح ابتدا میں روحوں کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس علم میں مزید ترقی ہو گئی۔ ۱۸۵۴ء ابھی نہیں گذرا تھا کہ ان غیر طبعی حوادث کی تحقیق واشنگٹن کی پارلیمنٹ نے اپنے ذمے لے لی۔ یعنی ابتدائی حادثہ مذکورہ کے آٹھ سال بعد خود واشنگٹن کی مجلسِ اعیان یعنی پارلیمنٹ کے ممبروں نے اس کی تحقیق کی طرف توجہ کی۔ کیونکہ پندرہ ہزار شخصوں کے دستخطوں کے ساتھ ایک طویل درخواست اعیانِ پارلیمنٹ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:-

''ہم ذیل کے دستخط کنندگان ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے باشندے آپ کی معزز مجلس کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ چند حوادث غیر طبعی اور غیر معمولی تھوڑے دنوں سے اس ملک میں اور یورپ کی اکثر اطراف میں ظاہر ہو رہے ہیں جو شمالی غربی اور وسطی امریکہ

میں زیادہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان حوادث کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیزیں ہیں۔ عام پبلک بالکل مضطرب اور حیران و پریشان ہے۔ چونکہ اس درخواست کا اصل مقصد آپ حضرات کو اس طرف متوجہ کرنا ہے اس لیے اس عریضہ میں کچھ حوادث کا بالا جمال تذکرہ عرض کیے دیتے ہیں:

۱۔ ان ہزاروں عقلا نے ایک پوشیدہ قوت کا مشاہدہ کیا ہے جو بڑے بڑے اور بھاری اجسام کو حرکت دے دیتی ہے اور ہر طرح سے اسے الٹ پلٹ دیتی ہے۔ جو بظاہر اصولِ طبعی کے خلاف اور ادراک بشری و طاقت کی حدود سے باہر ہے۔ اب تک کوئی شخص بھی ان حوادث کی صحیح توجیہہ نہیں کر سکا۔

۲۔ تاریک کمرہ میں مختلف شکل اور رنگ کی روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ پہلے سے اس کمرہ میں کوئی اس قسم کا مادہ نہیں ہوتا جو تولیدِ عملِ کیمیاوی یا تنویر فاسفورس یا سیال کہربائی کا باعث ہو۔

۳۔ ان حوادث میں سب سے عجیب بات جس پر توجہ کی زیادہ ضرورت ہے یہ ہے کہ مکان کے اندر مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض وقت کھٹ کھٹ کی ایسی آوازیں آتی ہیں جو کسی نظر نہ آنے والی عاقل ذات پر دلالت کرتی ہیں۔ بعض وقت مشینوں اور کارخانوں کی مانند آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی سخت آندھی کی سرسراہٹ کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ کبھی ایسی آواز سننے میں آتی ہے جیسے ہوا کی وجہ سے کسی دیوار پر موج کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی زور کی کھڑک اور توپ کی سی ایسی آواز نکلتی ہے کہ آس پاس کے تمام مکانات گونج اٹھتے اور لرز جاتے ہیں۔ بعض وقت تو یہ آواز انسانی آواز کے مشابہ ہے۔ کبھی اس مکان سے باجے کی آوازیں نکلتی ہیں حالانکہ اس مکان میں کوئی باجہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گراموفون یا ہارمونیم یا ستار یا سارنگی یا باجے خود بخود مکان کے اندر موجود ہو کر بجنے لگتے ہیں۔ بجانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کبھی باجوں کی موجودگی کے بغیر یہ تمام آوازیں نکلتی رہتی ہیں۔ اور یہ تمام آوازیں قانونِ طبعی کے مطابق نکلتی ہیں جن کا حدوث، تموجاتِ ہوائی سے ہوتا ہے۔ اور باقاعدہ ہمارے ظاہری کانوں تک پہنچتی ہیں۔ محققین نے ان آوازوں کے ظاہر

کرنے والوں کو معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اب تک اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ہم لوگ مناسب سمجھتے ہیں کہ ان دونوں اصولوں کو بھی اس جگہ بیان کردیں جن کو اس مشکل کے حل کرنے کے لیے فرض کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ ان تمام حوادث کی نسبت مردوں کی روح کی طرف کی گئی ہے۔ نیز یہ کہ ارواح کا اثر ان عناصرِ دقیقہ میں ہوتا ہے جو تمام اشکالِ ہیولوی میں جاری اور ساری ہیں۔ اس کی تشریح خود اس کی پوشیدہ قوت نے کی تھی جب کہ اس سے اس سوال کے متعلق سوال کیا گیا۔ دوم ہمارے ملک کی بڑی بڑی ممتاز ہستیاں اس کو تسلیم کرتی ہیں۔ لیکن دوسری ممتاز ہستیاں اس سے انکار کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس کی تحقیق علومِ نظری کی قوت کے ماتحت ہونی چاہیے تاکہ اس سے بالکل حقیقی سبب معلوم ہو سکے جو ان تمام حوادث کے لیے صحیح وجہ ثابت ہو سکے۔ ہم لوگوں کی اس آخری رائے سے موافقت نہیں رکھتے کیوں کہ تحقیق کے بعد ہم لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کوئی ایسی چیز ہے کہ اس علت کی مخالف ہے جس کو ان حوادث کی علت اور سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ آپ معزز حضرات کی مجلس سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ یہ حوادث جو بظاہر ہو رہے ہیں بالکل سچے اور یقینی ہیں۔ نیز ان کی تحقیق و تفتیش جنسِ بشری کی مصلحت کے لیے ادق علمی مبحث کو چاہتی ہیں۔ لہٰذا آپ حضرات کی توجہ کی سخت ضرورت ہے۔ کیا ہر عقلمند یہ نہیں سمجھ سکتا ہے کہ شاید ان حوادث کی تحقیق کوئی ایسا اہم نتیجہ پیدا کرے جو باشندگانِ امریکہ کی ادبی، مادی اور عقلی حالتوں کے لیے بہت زیادہ مفید ہو۔ جو ہمارے اصولِ معیشت کو ہی بدل دے۔ نیز ہمارے ایمان اور ہمارے فلسفہ کی اصلاح کردے۔ نیز نظامِ عالم ہی کی ہیئت کو تبدیل کردے۔

ہم لوگ ایسے مسائل کی تحقیق کے لیے جن سے ہیئتِ اجتماعی کے لیے کوئی اہم نتیجہ پیدا ہو آپ حضرات کی معزز مجلس ہی کی طرف رجوع کرنا اپنے نظامِ اجتماعی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم ابنائے وطن آپ حضرات سے نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کرنے آئے ہیں کہ ان عجیب حوادث کے متعلق ہم لوگوں کی رہنمائی کریں۔ اس طرح ہو کہ اس کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کردی جائے خواہ اس کے لیے کتنا ہی خرچ کیوں نہ ہو۔ ہم لوگوں کا

کامل یقین ہے کہ کمیٹی جو کچھ کرے گی اس کے نتائج ہماری ہیئتِ اجتماعی کو بہترین نفع پہنچے گا۔ ہم لوگوں کو یہ امید ہے کہ آپ کی معزز مجلس ہماری اس عاجزانہ مگر اہم درخواست کو ضرور قبول فرمائے گی۔''

اس کے بعد واشنگٹن کی پارلیمنٹ نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس کی صحت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد یہ علم ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پھیل گیا۔ یہاں تک ۱۸۹۸ء میں امریکہ کے اندر اس مذہب کے تابعین دو کروڑ کی تعداد تک پہنچ چکے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں عام روحانی مجلسیں بیس (۲۰) اور خاص انجمنیں ایک سو پچاس (۱۵۰) اور دو سو سات (۲۰۷) لیکچرار اور عام میڈیم یعنی وسیط بائیس (۲۲) تھے۔ اس کے زبردست اور مشہور عالموں میں ادمون تھے جو پارلیمنٹ میں کئی بار منتخب ہو چکے تھے۔ علامہ رابرٹ ہیر امریکی نے اس کے متعلق ایک کتاب تصنیف کی۔ اسی طرح علامہ رابرٹ ڈال ادین نے بھی ایک کتاب ''حدودِ عالمِ غیب'' کے نام سے امریکہ میں لکھی۔ گذشتہ صدی کے آخر میں تقریباً بائیس (۲۲) ایسے اخبارات تھے جو ان کمیٹیوں اور انجمنوں کے کارنامے شائع کر کے عام پبلک تک پہنچاتے تھے۔

یہ تمام علما اس کی تحقیق اس وجہ سے کرتے تھے کہ لوگوں کو گمراہی سے بچائیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علمِ طبعیات، ریاضیات، سائنس اور فلسفہ وغیرہ سے بہریاب کیا تھا۔ جب اس واقعہ اور اس کے متعلق علمائے امریکہ کی تحقیقات کی خبر انگریزوں کے کانوں تک پہنچی تو انگلستان میں بھی بڑے بڑے علماء اس کی تحقیق و تفتیش میں مصروف ہو گئے۔

چنانچہ لنڈن کی علمی انجمن نے جو ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئی تھی اپنے ایک جلسہ منعقدہ ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء میں یہ تجویز پیش کی کہ اس قسم کے روحانی حوادث کی تحقیق کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو لوگوں کو صحیح حالات سے واقف کرے۔ چنانچہ یہ کمیٹی متواتر اٹھارہ مہینے تک تحقیق و تفتیش میں مصروف رہی۔ جب اس نے اپنی تحقیق کے بعد حادثۂ روحانی کی صحت کا اعلان کر دیا تو انگریز قوم متحیر ہو کر رہ گئی۔ علامہ والاس نے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ''عجائب روحانی'' ہے۔ ان علماء میں سے جو اس علم کے سخت مخالف تھے ڈاکٹر جارج سا کسٹن بھی تھے۔ انہوں نے مخالفت چھوڑ کر پندرہ سال تک اس کا گہرا مطالعہ کیا۔

وہ کہتے ہیں کہ مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد مجھے مذہب روحانی پر کامل یقین ہو گیا اور میں نے اثنائے تحقیقات میں اپنے متوفی عزیزوں، بزرگوں اور دوستوں سے بات چیت کی۔ ڈاکٹر شامیرس، ڈاکٹر ہیگن اور علامہ میرس وغیرہ نے بھی اس کی تحقیق کی۔ لنڈن میں ایک ''انجمن مباحثہ نفسیہ'' قائم کی جس کی طرف سے ایک مجلّہ ''اشیاح الارواح'' کے نام سے بھی شائع ہوا۔ جو اس قسم کے غیر طبعی حوادث و واقعات سے متعلق تحقیقات لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

امریکہ اور انگلینڈ کی طرح فرانس کے اربابِ علم و فن کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسی طرح یہ علمِ روحانیت جرمنی، روس، اٹلی، بلجیم، اسپین، پرتگال، ہالینڈ، سویڈن وغیرہ میں پھیل گیا اور تمام یورپ میں اس علم کی بے شمار سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم ہیں اور بے شمار کتابیں اس علم پر لکھی جا چکی ہیں اور اخبارات اور رسالے اس علم کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ غرض یہ علم یورپ میں ہر جگہ رائج ہے اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اگر ہم یورپ کے اس جدید علمِ روحانیت کے مفصل طور طریقے، اس کی حقیقت اور اس کے مفصل حالات بیان کریں تو ایک علیحدہ ضخیم کتاب بن جاتی ہے۔ تاہم اس کے اہم اور ضروری حالات ناظرین کی دلچسپی کے لیے مختصر طور پر بیان کیے دیتے ہیں۔ گو اس فقیر کو اس قسم کے روحانی حلقوں میں بیٹھنے کا بظاہر کبھی اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہمارے ملک پاکستان میں اس روحانی علم کی کوئی انجمن یا سوسائٹی موجود ہے۔ لیکن میں نے اس روحانی مذہب اور روحانی علم یعنی سپر چولزم (SPRITUALISIM) کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی پور تحقیق کی ہے کہ یہ کس قسم کی ارواح ہیں جنہیں یہ لوگ حاضر کرتے ہیں اور اس علم کا کافی لٹریچر اور بہت کتابیں میری نظر سے گذری ہیں۔ یہاں پر اس علم کا ذکر کر دینا اس لیے ضروری سمجھا کہ ہماری نئی روشنی کے دلدادہ نوجوان اہلِ یورپ کی تقلید کے اس قدر مفتون اور مجنون ہیں کہ اہلِ یورپ کے ہر قول و فعل اور ان کے ہر عقیدے اور نظریے کو وحی آسمانی سے بڑھ کر اور برتر سمجھتے ہیں۔ یہ ذہن نشین کر لیں کہ موت کے بعد زندگی اور روح کا وجود اور اسے سزا اور جزا وغیرہ کا مسئلہ آپ کے مادی پیشوایانِ یورپ اور دانایانِ فرنگ کا تو اب ایک مسلمہ عقیدہ اور یقینی نظریہ بن چکا ہے۔ لیکن آپ ہیں کہ ابھی تک الحاد اور دہریت کے دجالی گدھے پر سوار نظر آتے

ہیں اور اسے جہنم کی طرف سرپٹ دوڑائے جا رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو ہمارے علمِ حاضراتِ ارواح پر اگر کوئی شک اور شبہ ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ آپ آخر اپنے مادی پیشواؤں کے عقیدوں اور نظریوں کو تو ضرور مانیں گے۔ جن میں آپ کے بڑے بڑے فلاسفر، ڈاکٹر، سائنس دان اور دانا و مدبر سیاست دان بھی شامل ہیں۔ اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہ ہو تو آپ خود ان کی تصنیفات کا مطالعہ کریں۔ اور اگر اس پر بھی تسلی نہ ہو تو آپ کو اکثر ڈاکٹری، بیرسٹری، سائنس، فزکس، انجینئرنگ وغیرہ علمی شعبوں میں بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے ولایت جانے کا بھی اکثر اتفاق ہوتا ہے۔ آپ وہاں جا کر ان روحانی حلقوں اور مجالس میں ذرا شریک ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ کس قدر صحیح ہے۔ لیکن آپ لوگوں کا وہاں بھی یہی حال ہے کہ اگر آپ کا علمی مشاغل اور فنی مصروفتوں سے کچھ وقت نکلتا ہے تو اسے ناولوں کے مطالعے، تھیٹروں کے نظاروں اور ناچ گھروں کے تماشے کی نذر کر دیتے ہیں اور جب اپنے وطن واپس لوٹتے ہیں تو بس اپنے پاپی پیٹ اور شریر شرمگاہ کو بھرنے اور خالی کرنے کا ایک کاغذی پرمٹ ہاتھ میں لیے ہوئے اسی دہریت اور الحاد کے گدھے پر سوار ہو کر آ دھمکتے ہیں اور اگر بھولے سے کبھی آپ سے کوئی شخص خدا اور رسول اور مذہب کی بات کر بیٹھے تو بس آپ نتھنے پھلا کر بڑبڑا اٹھتے ہیں کہ اس علم اور روشنی کے زمانے میں ہمارے سامنے یہ دقیانوسی باتیں نہ کرو۔ افسوس کس بے دردی سے آپ عقل اور دانش کا خون کرتے ہیں اور اس پر بھی آپ دانا اور روشن خیال کہلاتے ہیں۔ اب ہم اس روحانی علم کے کچھ طور طریقے، اس کی حقیقت اور اس کے کچھ مختصر حالات بیان کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی کوئی شہر ایسا نہیں جس میں اس قسم کے غیبی اور غیر مرئی آوازیں پیدا نہ ہوتی ہوں اور اس قسم کے غیر معمولی واقعات اور حادثات رونما نہ ہوتے ہوں۔ ہم لوگ اس قسم کے مکانوں کو جن بھوت کا مسکن کہہ کر خوف کے مارے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا کرتے ہیں اور اس میں کوئی شخص رہنے کی جرأت نہیں کرتا اور نیز ہمارے ملک میں وسیط یعنی میڈیم بھی بے شمار ہیں جن پر فطری اور پیدائشی طور پر کوئی روح مسلط ہوتی ہے۔ جنہیں ہم جن بھوت کا آسیب یا کوئی مرض خیال کر کے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اہلِ یورپ جو بلا کے پرکالے ہیں ان لوگوں نے اس

چیز کی تحقیق اور تفتیش کر کے اور اس سے سلسلۂ خبر رسانی قائم کر کے اس سے مفید نتیجے نکال لیے ہیں اور اس کو ترقی دے کر اسے ایک باقاعدہ علم اور فن کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن ہم لوگ ہیں کہ امریکہ کے ہیڈس فیل گاؤں والوں کی طرح ابھی تک ان چیزوں سے بھاگتے پھرتے ہیں اور ہنوز ہم اس کی ابتدائی منزل سے ایک قدم آگے نہیں بڑھے۔ ہمارے اہلِ سلف بزرگانِ دین نے اپنے زمانے میں اس روحانی علم اور باطنی طاقت کے وہ حیرت انگیز اور محیر العقول خوارق عادات دکھائے ہیں کہ آج کے یورپ کے روحانی عامل سپر چولسٹس (SPIRITUALISTS) ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے اور یہ لوگ ان کے مقابلے میں طفلِ ابجد خوان سے بھی کم درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ "پدرم سلطان بود" کے خالی گھمنڈ پر اتراتے پھرتے ہیں اور ان گذرے ہوئے عزیز القدر بزرگوں کے نام کو بھی اپنے ناپاک اور غلیظ پندار سے سخت بٹے اور غلط دھبے لگا رہے ہیں۔ معصیت اور نافرمانی میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں اور پھر بھی خدا کے پیارے اور محبوب ہونے کا گھمنڈ ہے۔ دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں لیکن جنت کے ٹھیکیدار ہونے کا دعویٰ دامن گیر ہے۔ چیتھڑے اور جوئیں تو سنبھال نہیں سکتے لیکن خَیۡرَ اُمَّۃٍ کہلانے کا بھوت سر پر سوار ہے۔ ذلت اور مسکنت کا پیکر بنے بیٹھے ہیں لیکن تقدس اور پاکبازی کا نشہ سر میں ایسا سمایا ہے کہ کبھی اترتا نہیں۔ غرض ہماری ناخلف امت ایک ایسے لاعلاج عصبی مرض میں مبتلا ہے کہ جس سے جانبر ہونا محال نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس امتِ مرحومہ کے حال پر رحم فرماوے۔ اہلِ یورپ کے نزدیک اس علم کے حصول کے تین بڑے اصول ہیں: اول غور اور فکر جسے میڈیٹیشن (MEDITATION) کہتے ہیں، دوم تصور اور تفکر یعنی خیال کو ایک مرکز پر جمانے کی مشق کرنا۔ جسے کنسنٹریشن (CONCENTRATION) کہتے ہیں، سوم اپنے حواس سے بات چیت کرنے اور خبر رسانی کے بہت طریقے ہیں۔ لیکن خاص بڑے طریقے حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ اول اس غرض کے لیے ایک بڑی میز بنائی جاتی ہے جس کے نیچے پہیے لگے ہوتے ہیں جو روح کی تھوڑی سی طاقت سے پھرنے اور ہلنے لگ جاتی ہے یا اس میں کھچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے گرد ایک میڈیم یعنی ایک عامل اور اس کے آس پاس دو معاون و

مددگار اور باقی تماشائی بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ ہر حلقے اور میٹنگ میں میڈیم اور عامل کا وجود ضروری ہوتا ہے اور روح اس میڈیم پر فطرتی طور پر مسلط ہوتی ہے۔ اول اسے حلقے کے اندر دعوت دی جاتی ہے۔ اسے رہنما روح یا گائیڈ سپرٹ کہتے ہیں اور اس کے ذریعے دوسری مطلوبہ روحوں کی حاضرات کی جاتی ہے۔ روح کو حاضری کرنے کے لیے میڈیم یا عامل کو استغراق یا بیہوشی میں جانا پڑتا ہے جسے انگریزی میں (TRANCE) بولتے ہیں۔ میڈیم گاہے تو خود توجہی سے اپنے اوپر استغراق یا بے ہوشی طاری کر لیتا ہے یا اسے معاون اور مددگار ہپناٹزم کی مقناطیسی نیند سلا کر بے ہوش اور بے خود بنا دیتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی مسلط روح یا بھوت اس کے سر پر آ کر سوار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس سے سلسلۂ کلام اور بات چیت شروع کی جاتی ہے۔ کلام اور بات چیت ابتدائی حالات میں ٹیلی گراف کی طرح کھٹ کھٹ اور پٹ پٹ کے اشاروں سے کی جاتی ہے۔ یعنی بعض وقت ایک بار کی کھٹ کھٹ سے بات کا اثبات اور دو دفعہ کی کھٹ کھٹ سے سوال کی نفی مراد لی جاتی ہے۔ ایک شخص میز پر مطلوبہ سوال کرتا ہے اور اس کی نفی یا اثبات کو روح کی ایک دفعہ یا دو دفعہ کی کھٹ کھٹ سے معلوم کیا جاتا ہے۔

۲۔ دوم اس سے زیادہ ترقی یافتہ صورت یہ ہوتی ہے کہ جس وقت میڈیم پر روح مسلط ہو جاتی ہے اور میز پھرنے اور ہلنے لگ جاتی ہے اور کھٹ کھٹ کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں تو ایک شخص میز پر حروف تہجی پڑھتا جاتا ہے اور جس حرف پر کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے اس حرف کو ایک شخص لکھ لیتا ہے اور اس طرح جو حروف جمع ہو جاتے ہیں ان کے الفاظ اور فقرے جوڑ کر اپنے سوال کا جواب اور روح کی بات معلوم کی جاتی ہے۔ یہ اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ مسلط روح تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔

۳۔ سوم میز کے اوپر ایک دل کی شکل کی گاؤدم لکڑی بنائی جاتی ہے جس کا سرا لمبا ایک پوائنٹر کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے نیچے تین پھرنے والے پہیے لگے ہوتے ہیں تاکہ روح کی تھوڑی سی طاقت سے ادھر ادھر ہلنے لگیں۔ میڈیم اپنے دونوں ہاتھ اس دل کی شکل کی گاؤدم لکڑی پر رکھ دیتا ہے اور وہ معاون اور مددگار بھی گاہے اپنے ہاتھ کی

انگلیاں میڈیم کے ہاتھوں پر رکھ دیتے ہیں تا کہ روح کے ساتھ رابطہ قائم کیا جائے۔ میز کے سامنے حروف تہجی لکھے ہوتے ہیں اور روح میڈیم کے جسم میں حلول کر کے باری باری سے حروف تہجی کے تمیں ۳۰ حروف میں سے ایک ایک کی طرف اس گاؤدم لکڑی کے سرے سے اشارہ کرتی جاتی ہے اور میز پر ایک آدمی ان حروف کو نقل کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح جو حروف جمع ہو جاتے ہیں ان سے ٹیلی گرام کی طرح الفاظ اور فقرے جوڑ کر روح کی مطلوبہ بات بنالی جاتی ہے۔

۴۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ میڈیم یعنی عامل اپنے ہاتھ میں پنسل رکھتا ہے اور روح اس پر مسلط ہو کر اس کے ہاتھ کو غیر ارادی حرکت دے کر نیچے کاغذ یا تختی پر اپنا مطلب لکھتی جاتی ہے۔ یہ زیادہ ترقی یافتہ میڈیم اور پڑھی لکھی روح کا کام ہوتا ہے۔

۵۔ پانچواں طریقہ یہ ہے کہ ایک ڈبیا کے اندر پنسل اور خالی کاغذ رکھ دیے جاتے ہیں اور میڈیم اس ڈبیا یا چھوٹی صندوق پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے تو وہ اوراق خود بخود روح کی اپنی تحریر سے مرقوم ہو جاتے ہیں۔

۶۔ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ روح میڈیم کی زبان سے بولتی ہے اور سوالوں کے جواب دیتی ہے۔ حاضرین سے خطاب کرتی ہے اور لیکچر دیتی ہے۔ بعض دفعہ روح مجسم اور مرئی شکل اختیار کر کے حاضر ہوتی ہے۔ حاضرین کو چھوتی ہے، چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیتی ہے، گھنٹیوں، باجوں اور ڈھولوں کو بجاتی ہے۔ گاہے میڈیم کو بھی اٹھا کر لے جاتی ہے۔ مقفل کمروں کے اندر سے چیزیں اٹھا کر باہر لے جاتی ہے اور باہر کی چیزیں اندر لا کر ڈال دیتی ہے۔ غرض عجیب وغریب مادی عقل اور ادراک سے بعید حرکتیں اور کام کرتی ہے جس کی توجیہہ سے سائنس اور فلسفہ آج تک عاجز ہے اور انسانی عقل اس کے ادراک اور فہم سے قاصر ہے۔

ذیل میں ان روحانی عالموں کے چند نادر اور عجیب وغریب واقعات جو ان سے روحوں کے ذریعے ظاہر اور رونما ہوئے ہیں، درج کرتے ہیں:

۱۔ اول واقعہ: ایک جرم میڈیم مسمی ڈاکٹر سر پاکس اپنی کیفیت یوں بیان کرتا ہے کہ میں نے روح کے ذریعے کاغذ پر لکھنے کی انیس دفعہ کوشش کی اور میری سب نشستیں بے نتیجہ

ثابت ہوئیں لیکن بیسویں مرتبہ جب میں حاضرات کے لیے بیٹھا تو میں نے ایک غیر مالوف برودت اور ساتھ ہی ایک غیر ارادی حرکت اپنے ہاتھ میں محسوس کی۔ بعدۂ ایک سرد ترتیج اور ہوا میرے چہرے اور ہاتھ پر چلی۔ اس کے بعد میرا ہاتھ غیبی تحریر پر چل پڑا اور میں غیر ارادی طور پر عالمِ ارواح کی خبریں لکھنے لگ گیا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میں روحانی باتیں لکھتے وقت اپنے پاس بیٹھے ہوئے احباب سے باتیں بھی کیا کرتا اور میرا ہاتھ غیبی روحانی معقول باتیں لکھتا جاتا۔

۲۔ واقعہ دوم: ولیم کروکس لکھتے ہیں کہ ہم نے ایک عامل آنس فوکس کو دیکھا کہ وہ ایک جگہ پر مقالۂ روحانی بھی لکھتے اور اسی وقت کوئی دوسرا موضوع میز کی طرقات کے ذریعے کسی میڈیم کو لکھواتے اور ساتھ ہی کسی تیسرے آدمی کے ساتھ کسی مخالف موضوع پر بہت آسانی کے ساتھ کلام بھی کرتے۔

۳۔ ایک عامل کا بیان ہے کہ ایک لڑکے کو ہم نے دیکھا جو کہ میڈیم شپ کیا کرتا تھا۔ وہ علم اور تہذیب سے بالکل عاری تھا۔ ہم نے روح کے استیلا کے وقت اس سے علمِ فلسفہ، علمِ منطق اور علمِ معرفت کے مسائل مثلاً عالمِ غیب و ارادہ اور قدرت کے مسائل دیافت کیے تو اس نے ان سب کے مفصل جوابات نہایت بلیغ اور فصیح عبارات میں ادا کیے۔ حالانکہ اسے ان علوم کی ذرا بھی واقفیت نہ تھی۔

۴۔ واقعہ چہارم: ایک لڑکی کی نسبت تحقیق کی گئی کہ وہ روح کے مسلط ہونے کے وقت آٹھ مختلف زبانوں مثلاً فرنچ، ہسپانوی، یونانی، اطالوی، پرتگالی، لاطینی، ہندی اور انگریزی میں کلام کرتی تھی۔ حالانکہ وہ صرف انگیزی جانتی تھی۔

۵۔ پانچوان واقعہ: ولیم کروکس کا بیان ہے کہ ایک روحانی حلقے کے اندر جس میں مسٹر ہوم میڈیم تھے فلورنس کوک کی روح بالکل مرئی اور ظاہری صورت میں ظاہر ہوئی اور میں نے ہاتھ میں ہاتھ ملا کر مکان کے اندر اس کے ساتھ مشائیت کی۔

۶۔ چھٹا واقعہ: بارون گلاسٹو یہ لکھتے ہیں کہ ماہِ آب کی تیرہ ۱۳ تاریخ ۱۸۸۶ء کو میں نے ایک سفید ورق اور پنسل مقفل ڈبیہ میں رکھے اور اس کی کنجی اپنے پاس رکھی تو میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے اس کو کھولا تو لکھا ہوا پایا۔ پھر اسی روز میں نے

اس عمل کو دس دفعہ آزمایا اور ہر دفعہ کامیاب ہوا اور ڈبیا میرے سامنے کھلی پڑی رہتی اور عبارتیں خود بخود میرے سامنے لکھی جاتیں۔ بعدہٗ میں نے سفید کاغذ میز پر بغیر قلم اور پنسل کے رکھا تو وہ بغیر کسی کے ہاتھ لگانے کے لکھے ہوئے اور مرقوم پائے گئے۔

اس فقیر" کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دفعہ یہ فقیر اپنے ایک دوست کے ہاں جو خوشاب میں سکول ماسٹر تھے مقیم تھا۔ اس کے چند احباب میرے پاس ایک بڈھے نیلگر کو لے آئے کہ اسے کسی جن بھوت کا مدت سے آسیب ہے اور اسے تنگ کیا کرتا ہے۔ اس کا کچھ علاج کریں کہ یہ آسیب اس سے دفعہ ہو جائے۔ ہمارے لوگوں کی عادت ہے کہ وہ ان بھوت پریت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض دکاندار عامل انہیں حاضر کر کے آسیب زدہ کو بری طرح مارتے اور ستاتے ہیں۔ خیر وہ نیلگر میرے سامنے بیٹھایا گیا۔ میں نے تھوڑا سا کلام پڑھا تو جن حاضر ہو گیا۔ اس نیل گر کا تمام حلیہ بدل گیا اور اس کا چہرہ سخت ڈراؤنا اور ہیبت ناک صورت اختیار کر گیا۔ حتیٰ کہ اس مجلس کے اندر جس شخص کی طرف دیکھتا وہ تھر تھر کانپنے لگ جاتا۔ آخر وہ نیلگر سنسکرت زبان کے شلوک اور منتر ایسی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ پڑھنے لگا کہ گویا کوئی ودوان اور پنڈت ہے۔ اس نے مجھ سے ہاتھ جوڑ کر کہا: ''مہاراج کرو پا کرو، میں ہندو جوگی ہوں۔ تیرے دو بچوں کی خیر (اس وقت میرے دو لڑکے تھے)۔ میں آپ کی گئو (گائے) ہوں۔ مجھ کچھ نہ کہو۔'' اس نے اس قسم کی بہت سی منت سماجت کی باتیں کیں۔ آخر میں اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے میرے نسبت کچھ پیشن گوئیاں بھی کیں جو بعد میں حرف بحرف صحیح نکلیں۔ بعدہٗ اس نے مجھے کہا کہ مجھے اب جانے دو۔ چنانچہ میں نے اسے کہا کہ جاؤ تب وہ نیلگر ایک لمبی انگڑائی لے کر اپنی اصلی حالت اور ہیئت پر آ گیا۔ جب اس نیلگر سے پوچھا گیا کہ آسیب کے چڑھ جانے اور روح کے مسلط ہو جانے کے بعد تجھے کچھ ہوش رہتا ہے اس نے کہا کہ اس وقت مجھے کچھ ہوش نہیں رہتا اور نہ میرا اختیار اور ارادہ باقی رہتا ہے۔ جو کچھ بولتی اور کام کرتی ہے وہ جن بھوت یا روح کہتی اور کرتی ہے، جو مجھے پر مسلط ہو جایا کرتی ہے۔ بعدہٗ اس نے یہ بھی بتایا کہ مجھ پر اس طرح شدت کے ساتھ یہ روح اس سے پہلے کبھی مسلط نہیں ہوئی جس طرح اب کی دفعہ ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کے تسلط سے میرا جسم اور ہر عضو درد کرتا ہے۔

غرض انسانی جسم ایک ظرف اور برتن کی طرح ہے اور سفلی اور علوی روح اس میں اس طرح حلول کر جاتی ہے۔ جس طرح برتن کے اندر مائع چیز مثلاً پانی، عرق یا روغن وغیرہ ڈالنے سے فوراً برتن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

یورپ میں روحوں کو حاضر کرنے اور دعوت دینے کے لیے بعض امدادی کام کیے جاتے ہیں جو کہ گویا ان کی روحانی غذا اور خوراک کا کام دیتی ہے اور ان کی طرف مائل اور راغب ہو کر روحانی حلقوں میں جلدی اور آسانی سے حاضری ہوتی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک چیز راگ اور گانا بجانا بھی ہے۔ اس سے ایک تو میڈیم (وسیط) کے وجود میں عالمِ ارواح کی طرف تحریک اور ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ دوم ارواح کو راگ اور گانے بجانے سے انس ہے۔ وہ ایسی مجلسوں اور محفلوں کی طرف جہاں راگ اور گانا بجانا ہو رہا ہو جلدی مائل اور راغب ہوتی ہیں۔ سوم خوشبو وغیرہ مثلاً بخور کی دھونی دی جاتی ہے اور پھول رکھے جاتے ہیں۔ ان سے بھی روح کی حاضرات میں مدد ملتی ہے۔ چہارم جن مکانات کے اندر ارواح کی حاضرات کی جاتی ہے وہ تقریباً تاریخ رکھے جاتے ہیں اور روشنی کم کر دی جاتی ہے۔ یا مکان کے اندر سرخ روشنی کی جاتی ہے۔

اب ہم ان غیبی چیزوں کی نسبت اپنی رائے لکھتے ہیں کہ یہ کیا چیزیں ہیں جنہیں یہ لوگ حاضر کرتے ہیں۔ سو یاد رہے کہ غیبی عالموں اور لطیف روحانی جہانوں میں سب سے نیچے اور ادنیٰ عالمِ ناسوت کا اسفل ترین جہان ہے جو تمام سفلی نفوس کا مسکن ہے۔ ان میں جن بھوت، شیاطین اور سفلی ارواح رہتی ہیں۔ انسانی وجود میں لطیفۂ نفس ان سفلی لطیف مخلوق کے ہم جنس اور مشابہ ہے۔ جس انسان کا نفس ان ناسوتی غیبی مخلوق میں سے جس کسی ایک کے مشابہ اور ہم جنس ہوا کرتا ہے تو بعض دفعہ موقع پا کر جن شیاطین اور سفلی ارواح میں سے وہ ہم جنس مخلوق اس میں داخل ہو کر حلول کر جاتی ہے اور اس سے مل جل کر اتحاد پیدا کر لیتی ہے۔ اور انسان کے وجود میں اپنا مسکن اور گھونسلا بنا کر ہمیشہ کے لیے اس میں رہائش اور سکونت اختیار کر لیتی ہے اور جس طرح پرندہ اپنے آشیانے اور گھونسلے میں آ جایا کرتا ہے اسی طرح یہ روح انسانی وجود میں وقتاً فوقتاً آ جایا کرتی ہے۔ اور جب ایک روح اس میں جگہ اور روزن بنا لیتی ہے تو وہ دیگر جن اور شیاطین اور سفلی ارواح کے لیے بھی مسکن اور روزن

بن جاتا ہے اور جب اس قسم کی کوئی روح انسانی وجود میں داخل ہوتی ہے تو اس کے تمام جسم، دل، دماغ اور حواس پر قبضہ جما لیتی ہے اور اصلی ساکنِ مکان کو تقریباً اسی وقت بے دخل اور خارج کر دیتی ہے اور وہی غاصب روح اس میں بولتی چلتی، سوچتی سمجھتی اور کام کاج کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ان سفلی ارواح کے میڈیم اکثر عورتیں ہوا کرتی ہیں اور ہمارے ملک میں بھی عورتیں ہی آسیب زدہ ہوا کرتی ہیں اور مرد بہت کم ہوتے ہیں۔ کیونکہ عورتوں کا دل اور دماغ فطری طور پر کمزور ہوا کرتا ہے اور یہ ناقص العقل اور ناقص الدین ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا جن شیاطین اور سفلی ارواح ان کے وجود پر آسانی سے تصرف اور قبضہ جما لیتی ہیں۔ جن شیاطین اور سفلی ارواح کا یہ ناسوتی عالم باقی لطیف غیبی عوالم کی نسبت ہمیں سب سے زیادہ نزدیک ہے اور اکثر ہمارا نفس خواب کے اندر اسی عالم میں رہتا ہے۔ جن شیاطین اور سفلی ارواح بعض دفعہ بدنی اور عصبی امراض کا موجب بن جایا کرتی جو جس کسی طرح ظاہری دواؤں سے علاج پذیر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں جو میڈیم شپ کا پیشہ کرتے ہیں عموماً ان کی صحت اچھی نہیں رہتی لیکن چونکہ یورپ کے لوگوں نے اس علم تحضیر الارواح کو ایک پیشہ بنا رکھا ہے وہ لوگ اس سے تجارت کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر روحانی حلقے اور جلسے میں شامل ہونے والوں سے فیس لی جاتی ہے اور ٹکٹ کے ذریعے داخل ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے ہر حلقے اور نشست میں میڈیم کے لیے کافی رقم جمع ہو جاتی ہے اور جو عامل و میڈیم زیادہ زبردست اور عجیب و غریب کرشمے دکھانے والے ہوتے ہیں ان کے حلقوں اور جلسوں میں بیٹھنے والوں اور تماشائیوں کا بڑا رش اور انبوہ ہوتا ہے۔ ایسے حلقوں میں سیٹیں اور نشستیں ایک دو ماہ پہلے ہی بک ہو جایا کرتی ہیں اور وہاں ٹکٹ حاصل کرنا بہت مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ سو افسوس ہے کہ ان زر پرست نفسانی لوگوں نے ایسے نفیس اور نادر علم کو بھی ذریعہ معاش بنا رکھا ہے اور بجائے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کے اس سے چند روزہ متاعِ دنیا حاصل کی جاتی ہے۔

ہماری اس کتاب میں اہلِ یورپ کی حاضراتِ ارواح کے واقعات اور حالات بیان کرنے کا مقصد اور غرض یہ ہے کہ قرآن کریم میں پیغمبروں کے جس قدر معجزات اور روحانی کمالات مذکور ہیں ان پر سچے دل سے ایمان لے آئیں مثلاً سلیمانؑ کی روحانی طاقت کے

ذریعے تختِ بلقیس کا حاضر کرنا۔ جب ایک غیبی مخلوق کے لیے ایک بند مقفل کمرے سے ٹھوس وزنی چیزیں اٹھا کر باہر لے جانا اور باہر کی چیزیں اٹھا کر اندر لے آنا صحیح ہوسکتا ہے تو سب سے بڑے عاملوں کے سردار حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے پیغمبر کی روحانی طاقت سے یہ ہرگز بعید نہیں ہے۔ اسی طرح تمام پیغمبروں کے معجزات اور اولیاؤں کی کرامات کو قیاس کر لینا چاہیے کہ وہ لوگ فرشتوں اور اعلیٰ روحوں کی حاضرات کر کے ان سے ایسے حیرت انگیز کام لیا کرتے تھے کہ عقلِ انسانی اس کے فہم وادراک سے عاجز رہ جاتی ہے۔

ع قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

یورپ میں تخفیر الارواح کے حلقوں میں یہ ارواح اکثر میڈیم کے پیٹھ پیچھے اور بائیں جانب نمودار ہوتی ہیں اور یہ بات جن شیاطین اور سفلی ارواح سے مخصوص ہے کہ وہ ہمیشہ عامل کے پیچھے اور بائیں جانب سے آ کر حاضر ہوتی ہیں۔ دیگر ان ارواح کے حاضر ہونے سے پہلے بند کمروں میں سرد ہوا چلتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کمرے کا ٹمپریچر کافی حد تک گر جاتا ہے اور گاہے گاہے کمرے کے پردوں یا کسی اور چیز کو آگ بھی لگ جایا کرتی ہے اور اکثر اوقات جب میڈیم عورت ہوتی ہے تو استیلائے روح کے وقت ننگی ہو جایا کرتی ہے۔ ان سب حرکات اور اس قسم کے دیگر افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کام جن شیاطین اور سفلی ارواح کے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان حلقوں میں گاہے نیک ارواح بھی آ جاتی ہوں۔ موت کے بعد کے جو واقعات اور حالات ان ارواح کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں وہ سب ہمارے اسلامی عقائد اور مسائل سے ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ روحوں نے اپنے ذیل کے حالات اور واقعات بیان کیے ہیں:

۱۔ ارواح اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بجسمہٖ گوشت اور ہڈیوں کے ڈھانچوں میں دیکھتی ہیں اور جب زندہ لوگ کسی مردے کی وفات پر روتے ہیں تو مردوں کو اس سے بڑا دکھ پہنچتا ہے (شارع اسلام نے مردوں پر رونے اور ماتم کرنے سے منع فرمایا ہے)۔

۲۔ زندگی میں اگر کوئی شخص اندھا یا لنگڑا یا جسمانی طور پر ناقص یا معیوب ہوتا ہے تو موت کے بعد عالمِ برزخ میں وہ نقص نیک عمل کی وجہ سے رفع ہو جاتا ہے اور وہ صحیح و

سالم ہوتا ہے۔

۳۔ موت کے بعد ارواح کو عالمِ برزخ میں اپنے بداعمال اور برے کرداروں کے سبب سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔

۴۔ باطن میں عالمِ ارواح کے سات عالم اور جہان ہیں۔ نیک اور پاک ارواح عالمِ بالا کے نہایت اعلیٰ اور عمدہ طبقوں میں رہتی ہیں اور نہایت چین، راحت اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتی ہیں اور ادنیٰ سفلی ارواح نیچے کے سفلی عوالم میں رہتی ہیں اور سزا پاتی ہیں۔

۵۔ وہاں علوی ارواح کے لیے دوسرے جہان میں باغ باغیچے، محلات، مدرسے اور دیگر سامانِ عیش مہیا رہتے ہیں۔

۶۔ مرد اور عورت کی جنسی تمیز وہاں بھی قائم رہتی ہے لیکن عالمِ برزخ میں شادی، نکاح اور تولد وتناسل کا سلسلہ نہیں ہے۔

۷۔ روحوں کا بیان ہے کہ تناسخ اور آواگون کا مسئلہ بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔ اور روح واپس دنیا میں ہرگز جنم نہیں لے سکتی اور ہر روح کے لیے دنیا میں ایک بار آنا ہے اور ایک ہی جسم مخصوص ہے۔

۸۔ موت کا وقت مکرر ہے اور اس سے آگے پیچھے ایک سیکنڈ نہیں ہوسکتا۔

۹۔ روحوں کے لیے دوسری دنیا میں روحانی پیشوا، مربی اور مرشد ہیں جو انہیں روحانی تعلیم وتلقین کرتے ہیں اور الگ الگ باطنی مدرسے اور کالج ہیں اور ان کے خاص قانون اور قواعد ہیں۔

۱۰۔ روحوں کو بعض آئندہ مستقبل کے حالات اور واقعات معلوم ہوجاتے ہیں اور وہ زندہ لوگوں کے پاس آتی جاتی ہیں اور ان سے خواب، مراقبے یا بیداری میں ملاقات بھی کرتی ہیں۔

۱۱۔ روحیں اپنے خویش واقارب اور دوستوں کی حتیٰ الوسع ان کے دنیوی کاروبار اور مہمات میں امداد بھی کرتی ہیں اور ان کی خوشی اور کامیابی سے خوش ہوتی ہیں اور ان کے غم سے اندوہگین ہوتی ہیں۔ سو اس قسم کے دوسرے حالات وواقعات ہیں جو اسلامی اور مذہبی

عقائد سے بالکل ملتے جلتے ہیں۔

یورپ کے سپر چولسٹ یعنی عاملینِ روحانیات جن غیبی لطیف مخلوق کی حاضرات کرتے ہیں وہ عالمِ ناسوت کے جن شیاطین اور سفلی ارواح ہیں۔ جو ان کے پاس آتی ہیں اور ان سے بات چیت کرتی اور طرح طرح کی روحانی کرشمے دکھاتی ہیں۔ یہ غیبی لطیف مخلوق دنیا میں آکر جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان کی ارواح جمادی، نباتی، حیوانی اور روحِ انسانی سے اتحاد پیدا کر کے ان کے اندر حلول کر جاتی ہیں۔ اس غیبی لطیف مخلوق کی دو قسمیں ہیں: ایک نوری اور دوم ناری۔ نوری مخلوق کے اس دنیا میں آنے کی غرض وغایت خلقِ خدا کو فیض اور نفع پہنچانا ہوتا ہے اور ناری مخلوق خلقِ خدا کو دکھ پہنچانے اور انہیں گمراہ کرنے کے لیے اس دنیا میں آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ سفلی ناسوتی ناری مخلوق میں سے ایک قسم شیاطین کی ہے جن کا کام لوگوں کو گمراہ کرنا، انہیں شرک اور کفر میں مبتلا کرنا اور فسق وفجور اور معصیت کی طرف راغب کرنا ہے۔ اس گمراہی کے کام میں ان شیاطین کے ہمراہ برے جن اور بد ارواح بھی امدادی ہو جایا کرتی ہیں۔ چنانچہ پرانے زمانوں میں بتوں کے اندر یہ شیاطین حلول کر کے لوگوں کو شرک، کفر اور بت پرستی میں مبتلا رکھتے۔ بتوں کے اندر سے ان کے سوالوں کے جوابات دیتے۔ پیشین گوئی کرتے اور طرح طرح کے غیبی کرشمے دکھا کر ان لوگوں کو بتوں کی غیبی امداد اور ان کی الوہیت کے قائل اور معتقد بنائے رکھتے۔ چنانچہ اس کی ایک مثال قرآنِ کریم میں سامری کے بچھڑے کی بیان کی گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے قومِ فرعون اور بنی اسرائیل سب بت پرست تھے۔ جب بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ان پر ایمان لے آئے اور فرعون مع لشکر غرق ہو گیا تو موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر سالہا سال تک جنگلوں اور بیابانوں میں پھرتے رہے اور اپنی قوم کو اور دیگر لوگوں کو توحید کی تعلیم دیتے رہے۔ اسی اثناء میں بنی اسرائیل کا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کی پوجا پاٹھ اور ان کے آگے رقص وسرود میں مشغول تھی تو اپنی قدیم رسم کے تقاضے نے ان کے دل میں بھی بت پرستی کا شوق پیدا کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف ۷: ۱۳۸) یعنی "اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا ٹھوس معبود بنا دے جس

طرح ان لوگوں کا معبود ہے۔" تاکہ ہم بھی اس کی عبادت اور پرستش سے اسی طرح حظ اٹھائیں جس طرح یہ لوگ گا بجا کر اٹھا رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ لوگ گمراہ ہیں۔ کیا تم بھی ان کی طرح گمراہ ہونا چاہتے ہو۔ غرض جب موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ اپنی قوم سے تیس دن کا وعدہ کر کے اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے اور اپنی قوم کے لیے نئے احکام لانے کے لیے کوہِ طور پر گئے اور بجائے تیس روز کے آپ کو دس روز اور بھی لگ گئے تو قوم سمجھی کہ موسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں۔ اس وقفہ میں سامری نے جو بڑا ساحر تھا، موقع غنیمت سمجھ کر قوم کے مالِ غنیمت سے سونے چاندی کا ایک بچھڑا تیار کیا اور اس میں اپنے سحر کے ذریعے ایک شیطانی روح کو داخل کیا جو کہ زندہ بچھڑے کی طرح آواز نکالتی تھی۔ ان لوگوں کی سرشت میں پہلے ہی سے بت پرستی کا خمیر موجود تھا۔ سامری نے اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں سے کہا کہ یہی تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے اور اب تمہارے پاس ٹھوس مادی شکل میں نمودار ہو گیا ہے تاکہ تم اس کی پوجا کرو۔ چنانچہ ساری قوم اس کو پوجنے لگ گئی۔ گو ہارون علیہ اسلام نے لوگوں کو بہتیرا سمجھایا اور نصیحت کی کہ اس شرک کے کام سے باز آ جاؤ اور یہ سامری کے سحر کا کرشمہ ہے، یہ معبود نہیں ہو سکتا لیکن بنی اسرائیل کے اکثر لوگ اسے پوجتے رہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے واپس آ کر اپنی قوم کو یوں بت پرستی میں مبتلا پایا تو آپ کو سخت رنج اور افسوس ہوا اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی سخت سست کہا۔ بعدہٗ سامری کو بلا کر اسے کہا کہ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ○ (طٰہٰ ۲۰: ۹۵) یعنی "اے سامری! یہ تو نے کیا کام کیا۔" جس پر سامری نے جواب دیا کہ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ○ (طٰہٰ ۲۰: ۹۶) یعنی "میں نے اپنی روشن ضمیری کے ذریعے ایسی غیبی چیز کو دیکھ لیا ہے جو ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ تب میں نے ایک رسول کے قدم کے نیچے سے مٹی اٹھالی اور بچھڑے کے اندر ڈال دی۔ جو ایک زندہ نفسِ مجسم کی طرح میرے لیے تیار ہو گیا۔" رسول روحانی کے قدم میں یہ تاثیر ہوا کرتی ہے کہ جب وہ اس مادی دنیا میں آ کر کسی جگہ قدم رکھتے ہیں تو ان کے قدم کو جو مٹی چھوتی ہے اس میں برقِ حیات نفوذ اور تاثیر کر جاتی ہے۔ اس مٹی میں کسی روح کے قیام کی طاقت اور قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی اس مٹی

میں قابلیت وسیلہ یعنی میڈیمسٹک پاور (MEDIUMISTIC POWER) آجاتی ہے۔
چنانچہ سامری نے وہ مٹی جب بچھڑے کے بت کے اندر ڈال دی تو اس نے اپنے سحر سے اس کے اندر ایک شیطان کو داخل کر دیا اور وہ اس کے اندر زندہ بچھڑے کی طرح آوازیں نکالنے لگا۔ غرض اس سونے چاندی کے خوبصورت عجیب وغریب بچھڑے کی اس غیر معمولی حرکت اور فعل سے یہ لوگ اس کے فریفتہ ہوکر اسے پوجنے لگ گئے۔ جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو بددعا کی کہ جا تو کوڑھی ہو جائے گا اور جو شخص تجھے چھوئے گا وہ بھی کوڑھی ہوگا۔ اور بچھڑے کے اندر جو شیطان داخل ہوا تھا اسے اپنی روحانی طاقت سے نکال کر جلا دیا اور اس کی راکھ دریا میں ڈال کر اس کی شیطنت کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ یہ سارا واقعہ قرآنِ کریم میں مفصل موجود ہے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے جنہوں نے بچھڑے کو پوجا تھا ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سزا مقرر کی کہ تم آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کو قتل کرو۔ چنانچہ بعض نے تو اپنے اوپر اس سزا کو منظور کر لیا اور آپس میں لڑ کر قتل ہو گئے اور جو زخمی ہو کر یا ویسے بچ رہے ان کی توبہ قبول کر لی گئی اور بعض اس سزا سے ڈر کر بھاگ گئے اور اطراف عالم میں پھیل گئے اور جس جگہ آباد ہوئے وہاں اپنی بت پرستی پر قائم رہے۔
ہندوستان میں جو آریہ قوم کوہِ ہندوکش کے راستہ آ کر آباد ہوئی یہ وہی موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بھگوڑے تھے جنہوں نے یہاں ہندوستان میں وہی گئوسالہ پرستی جاری رکھی جو آج تک گئورکھشا کی صورت میں موجود ہے۔ اور جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے گئوسالہ یعنی بچھڑے کو جلا کر راکھ کر دیا تھا اور اس کی راکھ کو دریا میں بہا دیا تھا یہ لوگ آج تک اپنے اس قدیم باطل معبود کی تقلید میں اپنے مردے جلاتے ہیں اور ان کی راکھ دریا میں بہاتے ہیں۔

سو بتوں کے اندر یہی شیاطین اور ارواحِ خبیثہ داخل ہو کر لوگوں کو گمراہ کرنے کا موجب بن جایا کرتی تھیں۔ یہ غیبی بلائیں اپنے پجاریوں اور پرستاروں کو بھی ستا ستا کر اور اپنا خوف دلا دلا کر اپنی پرستش میں لگایا کرتیں اور کبھی ان بتوں کے اندر سے انہیں اپنے کاروبار میں امداد کی غیبی بشارتیں دیا کرتیں۔ یعنی ان بت پرستوں کا ایمان اور اعتقاد بھی اپنے بتوں پر ان ارواحِ خبیثہ کی وجہ سے خوف اور رجا کے طفیل قائم تھا ورنہ اشرف المخلوقات انسان خواہ وہ

کسی زمانے میں بھی ہو اس قدر احمق اور بیوقوف نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے پتھر کے مجسموں اور مورتیوں کو بے وجہ پوجنے لگ جائے اور اس پر ہزاروں برس تک قائم رہے۔ انسان ایک ایسے مہمل اور بے سود فعل پر مدتوں تک بلا وجہ قائم نہیں رہ سکتا۔ کاٹھ کی ہنڈیا ایک دفعہ چڑھا کرتی ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو جا بجا بے نقاب کیا ہے اور بتوں کے اندر گھسی ہوئی ارواحِ خبیثہ کو کبھی جن اور کبھی شیاطین سے تعبیر کیا ہے قولہ تعالیٰ: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ أَهَٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ○ قَالُوا سُبْحَٰنَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم ۖ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۖ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ ○ (سبا ۳۴: ۴۰: ۴۱)۔ ''اور جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب مشرکین کو جمع کر کے فرشتوں سے خطاب فرمائے گا کہ کیا یہ لوگ دنیا میں تمہاری پرستش کیا کرتے تھے فرشتے عرض کریں گے اے اللہ! تو ہماری شرکت سے پاک ہے اور تو ان کے معاملے میں ہمارے حال کا نگران ہے۔ (بلکہ اصل بات یہ ہے) کہ یہ لوگ جنات کی پرستش کیا کرتے تھے اور اکثر ان پر ایمان لائے ہوئے تھے۔'' اور ایک دوسری جگہ آیا ہے: وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنَٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ سُبْحَٰنَهُ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يَصِفُونَ ○ (الانعام ۶: ۱۰۰)۔ ''اور کافروں نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور بعض نے جہالت سے (بطور دیوتا اور اوتار) انہیں اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور بیٹیاں بنا رکھا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ پاک اور منزہ ہے ان باتوں سے جن سے یہ لوگ اسے منسوب کرتے ہیں۔'' اور نیز ارشاد ربانی ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَٰطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ○ (الانعام ۶: ۱۱۲)۔ اور اسی طرح ہم نے انسان اور جن شیاطین کو ہر پیغمبر کا دشمن اور مخالف بنا دیا تھا۔ اور وہ ایک دوسرے کو دھوکے اور فریب کی باتیں القاء کیا کرتے تھے اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے۔ لیکن اے میرے پیغمبر! تو انہیں چھوڑ دے اور کرنے دے جو وہ افترا کرتے ہیں۔'' کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا امتحان اور حکمت ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہیں ان پر ان شیاطین کی کوئی دسترس اور غلبہ نہ ہوگا۔ جن اور شیاطین لوگوں کو ستا ستا کر اور طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کر کے

اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا کر ان کو اپنی عبادت اور پوجا میں لگاتے رہتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق قرآنِ کریم میں آیا ہے: اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ؀ (ص ۳۸: ۴۱)۔ یعنی (ایوب علیہ السلام نے عرض کی) ''کہ اے اللہ مجھے شیطان نے چھو کر تکلیف اور عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔''

ایک دفعہ میرے پاس ایک اچھا خاصا انگریزی دان اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین آیا۔ اس نے مجھے کہا کہ ''میں ایک سخت مصیبت میں مبتلا ہوں۔ کیا آپ میری کسی طرح مدد کر سکتے ہیں؟'' میں نے کہا کہ وہ کیا مصیبت ہے۔ اس نے کہا ''میری بیوی پر ایک ظالم جن اور موذی خبیث روح مسلط ہے اور وہ وقتاً فوقتاً جب بھی اس کے سر پر آتی ہے تو اسے سخت اذیت اور تکلیف دیتی ہے جس سے اس کی صحت خراب ہو گئی۔ وہ خبیث روح اس کی زبان پر بولتی ہے اور اس کے علاوہ جب بھی ہم اس کے علاج معالجے اور دم تعویذ کے ذریعے اس کے تدارک اور دفعیئے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم سب گھر والوں کو خواب اور بیداری میں ستاتی ہے۔ غرض اس نے سارے کنبے کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس موذی روح نے ہمیں اس کی زبانی بتایا ہے کہ میری فلاں کنوئیں کے کنارے رہائش ہے۔ تم روزانہ شام کو وہاں چراغ جلایا کرو اور میری چوکی بھرا کرو۔ تب میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گی۔ چنانچہ ہم روزانہ وہاں شام کو چراغ جلایا کرتے ہیں اور اس کا سلام اور مجرا کرتے ہیں۔ اگر ایک دن بھی ہم اس کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی کرتے ہیں تو وہ اسی رات میری بیوی کے سر پر آ دھمکتی ہے اور اس رات ہم سب گھر والوں کی شامت آ جاتی ہے۔ غرض اس خبیث روح نے ساری کنبے کو تقریباً اپنا پجاری بنا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ جب بھی وہ جن اس کی بیوی پر مسلط ہو جاتا اور بولنے لگتا تو سب گھر والے اس کے آگے سربسجود ہو جاتے اور اس کے آگے گڑگڑاتے اور اس سے معافیاں مانگتے۔ یہ حال دیکھ کر مجھے اللہ تعالیٰ کا سچا فرمان یاد آ گیا: وَاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْھُمْ رَھَقًا ؀ (الجن ۷۲: ۶)۔ ''اور انسانوں میں سے بہت آدمی ایسے ہیں جو جن لوگوں کی پناہ اور مدد ڈھونڈتے ہیں جس سے ان کی سرکشی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔'' واقعہ مذکورہ بالا جن شیاطین اور ارواحِ خبیثہ کے ذریعے بت پرستی کے رواج پانے کی ایک زندہ مثال ہے۔ پہلے زمانے میں جب کہ دنیا پیغمبروں کے

وجود سے خالی ہو جاتی تو جن شیاطین موقع پا کر لوگوں کو ستا ستا کر اور دکھ پہنچا کر ان سے اپنے مجسمے اور مورتیاں بنوا کر پجواتے اور ان مورتیوں اور مجسموں کے اندر یہ جن شیاطین داخل ہو کر اپنے مجاوروں اور پجاریوں کو دھوکے اور فریب کی باتیں بتا کر انہیں اپنی پرستش اور عبادت میں جکڑے رکھتے اور ان سے سخت ناروا اور ناجائز مشرکانہ افعالِ قبیحہ کا ارتکاب کراتے تھے۔ چنانچہ پرانے زمانے میں تمام دنیا کے اندر ان ارواحِ خبیثہ نے ظلم وستم کا ایک اودھم مچا رکھا تھا اور ہر جگہ اپنے مندر، تیرتھ اور بت خانے قائم کرا رکھے تھے اور ہر جن شیطان اور خبیث روح نے اپنے نام کا الگ مجسمہ اور بت بنوایا تھا۔ بلکہ بعض نے اپنے نام کے علیحدہ کئی کئی بت قائم رکھے تھے۔ ہمارے ہندوستان کے اندر بھی پرانے زمانے میں ان جن اور شیاطین اور ارواحِ خبیثہ کے بے شمار مندر اور تیرتھ تھے اور انہیں بمعنی شیطان انگریزی ڈیولز (DEVILS) کے نام سے پکارتے اور پوجتے تھے۔ ہر سال ان کے بڑے بڑے میلے لگا کرتے اور انہیں خوش کرنے کے لیے ان کی دہلیز اور قربان گاہ پر طرح طرح کے چڑھاوے چڑھائے جاتے۔ حتیٰ کہ بعض سخت قسم کے موذی چڑیل جن اور شیطان کو خوش اور راضی رکھنے کے لیے ہر سال ان کے آگے بے گناہ انسانوں کو ذبح کر ڈالتے۔ چنانچہ کلکتہ کی کالی دیوی کا مندر اس معاملے میں مشہور ہے جس کے گلے میں کسی زمانے میں انسانی سروں کا ہار تھا۔ ہر سال اس کی دہلیز پر انسانوں کو قربان کیا جاتا تھا جس کو بعد میں انگریزوں نے بند کرا دیا تھا۔ آج ان کی بجائے بکرے ذبح کرائے جاتے ہیں۔ ان دیویوں اور دیوتاؤں کی بڑی مہیب اور ڈراؤنی شکلیں ہی صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ یہ جن، شیاطین اور ارواحِ خبیثہ ہیں جنہوں نے جاہل بے دین لوگوں کو ستا ستا کر ان سے اپنی مورتیاں بنوا ڈالیں اور اسی طرح ایک دنیا ان بتوں کی پرستار بن کر شرک میں گرفتار ہو گئی۔

بھارت میں بتِ گنگ وجمن پجتا ہے ۔۔۔ پجتی ہے زمیں چرخِ کہن پجتا ہے
اللہ کی پوجا ہے یہاں جرمِ عظیم ۔۔۔ ان اندھوں کی نگری میں وطن پجتا ہے

(چکبست)

بتوں میں گھس کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے گمراہ کرنے والے جن، شیاطین اور ارواحِ خبیثہ الگ ہیں اور ان کی ایک قسم وہ ہے جو آسمانوں کی طرف چڑھ کر ملائکہ ملاء الاعلیٰ سے

خبریں سن لیا کرتے اور اپنے رفیق کاہنوں اور ساحروں کو وہ خبریں آکر سنا دیا کرتے اور وہ لوگوں کو بعض آئندہ مستقبل کے حالات بتا بتا کر اپنی جیبیں گرم کرتے۔ اسی طرح ان ہر دو قسم کے جنات اور شیاطین نے لوگوں کو دینِ حق اور توحید سے روک رکھا تھا اور انہیں مشرکانہ اور بت پرستانہ قسم کے باطل توہمات اور جھوٹے معتقدات میں گرفتار کر رکھا تھا۔ قرآن کریم میں جن شیاطین کا عالمِ بالا سے غیبی خبریں سن کر لانے کا ذکر متعدد جگہ آیا ہے۔ لیکن پیغمبرِ خدا حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے عالمِ بالا میں فرشتوں کے پہرے لگ گئے اور آسمانی راستوں پر جا بجا ملائکہ متعین کر دیئے گئے تا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی اور رسالت کی سچی ڈاک میں باطل کا کوئی دخل نہ ہو اور خلقِ خدا کو حق صحیح طور پر معلوم ہو اور باطل بالکلیہ معدوم ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (الجن ۷۲: ۸-۹)۔ ”جنات نے کہا ہم نے بے شک اب تو آسمان کو جا بجا طاقتور پہرے داروں اور شہابِ ثاقب سے بھرپور پایا ہے۔ حالانکہ زمانۂ نبوت سے پہلے ہم غیب کی خبریں سننے کے لیے آسمان کی بیٹھکوں میں چھپ کر بیٹھتے تھے۔ لیکن اب جو کوئی غیب کی خبریں سننے کے لیے وہاں جاتا ہے تو تاروں کا انگارہ اس کی تاک میں رہتا ہے اور اسے لگ کر بھگا دیتا ہے۔“

صحیح بخاری میں منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک روز زمانۂ جاہلیت میں ہم اپنے بتوں کے پاس بیٹھے تھے کہ اس وقت ایک شخص گائے کا بچہ ایک بت پر چڑھاوے اور نذرانے کے طور پر لایا اور اس کو ذبح کیا۔ اس وقت اس بت کے اندر سے ایک سخت آواز نکلی جو ہم نے اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ ہر خاص و عام نے اس آواز کو سنا۔ اس آواز سے ڈر کر سب لوگ بھاگ گئے لیکن میں وہاں اس غرض سے کھڑا رہا کہ دیکھوں یہ کیسی آواز ہے اور کس کی ہے۔ پھر دوسری اور تیسری دفعہ اس بت کے اندر سے وہی آواز سنی۔ مجھ کو اس سے سخت حیرانی اور پریشانی ہوئی۔ بعدہٗ اس بت کے اندر سے ایک بولنے والا بولا کہ اے قوت والے ایک ایسا کام ظاہر ہوا ہے جس میں بڑے مطلب کی بات ہے اور ایک شخص پکار کر کہتا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حضرت عمرؓ بڑے فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی بابت لوگوں

سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک پیغمبر ظاہر ہوا جو کہتا ہے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ۔ غرض وہ پہلی سخت چیخ اور پکار اس بت کے اندر کا فر جن کی تھی جس کو ایک مسلمان جن نے مار بھگا دیا تھا۔ اور بعد کی آواز اس فاتح مسلمان جن کی تھی جس نے بت کے اندر سے بت پرستوں کو توحیدؑ اور اسلام کی تلقین کی۔

نقل ہے کہ فتح مکہ کے وقت آنحضرت صلعم نے خالدؓ بن ولید کو تیس (۳۰) سواروں کے ہمراہ نخلہ کی طرف بھیجا تا کہ وہاں جا کر بت خانہ عزیٰ کو توڑ کر برباد کرے۔ حضرت خالدؓ نے وہاں جا کر بت خانے کو گرایا اور برباد کیا اور بتوں کو توڑ ڈالا۔ جب خالدؓ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچے اور بت خانے کو گرانے اور بتوں کو توڑنے کا ذکر کیا تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ اے خالدؓ! وہاں تو نے کچھ دیکھا؟ خالدؓ نے جواب دیا کہ کچھ نہیں۔ تب آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ پھر تو نے عزیٰ کے بت کو توڑا ہی نہیں۔ خالدؓ غصے ہو کر دوبارہ چلے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو تلوار نکالی اور عزیٰ بت کی تفتیش شروع کی۔ آخر اسے پالیا اور جب اسے توڑا تو اس میں سے ایک سیاہ فام، بکھرے بالوں والی، بدشکل ننگی عورت چیختی چلاتی ہوئی نکلی۔ جب واپس آ کر صورتِ واقعہ کو خدمتِ اقدس میں عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ عزیٰ یہی تھی جسے اب تو تباہ کر کے آیا ہے۔ آئندہ اس ملک میں اس کی پرستش کبھی نہ ہوگی۔

..........................

عرفان حصہ اول، ختم شد

۲۰۰۹

عرفان کے دوسرے حصے میں جنات، مؤکلات اور ارواح کی حاضرات کا مفصل بیان اور طریقے درج ہیں اور دعوت کے علم کو تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

## حضرت فقیر نور محمد سروری قادری کلاچوی رحمۃ اللہ علیہ
## کی معرکہ آرا تصانیف

عرفان (حصّہ اوّل)

عرفان (حصّہ دوم)

عرفان (انگلش) (پارٹ ون اینڈ ٹو)

مخزن الاسرار و سلطان الاوراد

حق نمائے (نور الھدیٰ شریف)

انوارِ سلطانی (ابیاتِ باھو) مع شرح

صاحبزادہ فقیر عبدالحمید سروری قادری کی تصانیف

حیاتِ سروری

الھامات

خطباتِ کاملؔ

کلیاتِ کاملؔ

عقلِ بیدار ترجمہ مع شرح (تصنیف لطیف حضرت سلطان باھوؒ)

ملنے کا پتہ:

فقیر عبدالحمید کاملؔ سروری قادری کلاچوی

کلاچی، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان، صوبہ خیبر پختون خواہ

دربارِ فیض، 04۔ ریورویو ہاؤسنگ سوسائٹی، رائے ونڈ روڈ، لاہور

azmatbibitrust@yahoo.com 042-35312256, 0300-4640966